تفسیر الفرقان

مؤلف ڈاکٹر اسلامی محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

جلد اول

سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ آیت ۱ تا ۴۳

تفسیر الفرقان

مؤلف ڈاکٹر اسلامی محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

جلد اول

سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ آیت ۱ تا ۴۳

جملہ حقوق طباعت واشاعت محفوظ ہیں

نام کتاب=========تفسیر الفرقان

نام مصنف=========محمد طاہر بھٹی چک قاسمکا

صفحات ========= ۴۰۴

قیمت ========= 0

موبائل نمبر

03477172726 , 03030144460

ایڈریس

چک قاسمکا تحصیل وضلع بہاولنگر، پنجاب پاکستان

E-mail:Tahirbhatti697@gmail.com

فہرست

عنوانات	نمبر شمار
مقدمہ	15
حضورؐ پر نزولِ وحی کے طریقے	15
تاریخ نزولِ قرآن	18
سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت	20
مکّی اور مدَنی آیات	21
مکہ ومدنی آیتوں کی خصوصیات	22
قرآن کریم کا تدریجی نزول	24
شانِ نزول	26
قرآن کریم کے سات حروف اور قرائتیں	27
سات قراء	32
عہد رسالتؐ میں حفاظت قرآن	34
کتابت وحی	37

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جمع قرآن	38
حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن	43
تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات	49
اخماس اور اعشار	52
رکوع	53
رموز اوقاف	54
قرآن کریم کی طباعت	56
علم تفسیر	57
تفسیر قرآن کے مآخذ	59
۱۔قرآن کریم	59
۲۔حدیث	60
۳۔صحابہؓ کے اقوال	61
۴۔تابعینؒ کے اقوال	61
۵۔ لُغتِ عرب	62

٦۔تدبّر اور استنباط	62
اسرائیلیات کا حکم	63
تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی	64
سورۃ الفاتحہ	75
سورہ فاتحہ کا مقام نزول	75
سورہ فاتحہ کے اسماء	77
سورہ فاتحہ کے فضائل	82
سورہ فاتحہ کے مضامین:	87
تعوذ	91
نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء مالکیہ کا مذہب:	92
نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا مذہب:	92
نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء شافعیہ کا مذہب:	93
نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء احناف کا مذہب:	93
تسمیہ	97

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے فضائل وفوائداور حکمتیں:	98
"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے احکام شرعیہ اور مسائل:	107
"بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے متعلق فقہی مباحث"۔	109
بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے آیت قرآن ہونے کی تحقیق:	109
بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے سورہ فاتحہ کے جز نہ ہونے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ:	111
اوائل سورہ میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے ان سورتوں کے جز نہ ہونے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ:	112
نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق مذاہب اربعہ:	115
نماز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو آہستہ سے پڑھنے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ:	117
الحمد کا لفظی معنی اور تفسیر	119
رب العلمین کا معنی اور تفسیر	127
الرحمٰن الرحیم کا معنی اور تفسیر	129

133	ملک یوم الدین کی تشریح
137	معبود اور مستعان صرف اللہ کی ذات ہے
142	استعانت وتوسل کی تحقیق
150	صراط مستقیم کیا ہے؟
153	انعام یافتہ لوگوں کا راستہ:
155	مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں
158	آمین کہنا
160	نماز میں آمین کہنے کے متعلق مذاہب اربعہ:
161	آمین کہنے کی فضیلت میں احادیث:
162	آمین بالجہر کے متعلق احادیث:
164	آمین بالسر کے متعلق احادیث:
167	فاتحہ خلف الامام میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ:
168	فاتحہ خلف الامام میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ:
171	فاتحہ خلف الامام میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ:

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء احناف کا نظریہ:	172
سورۃ البقرۃ	179
سورہ بقرہ کا شان نزول	180
سورۃ بقرہ کا اجمالی تعارف	181
سورہ بقرہ کی وجہ تسمیہ:	182
سورۃ بقرہ کے فضائل	185
حروف مقطعات علم کی تحقیق	194
شان نزول	199
قرآن میں کچھ شک نہیں	200
متقین کی تعریف	201
غیب پر ایمان سے مراد	206
اقامت الصلوۃ کے معنی	209
تارک نماز کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات	214
تارک نماز کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ	215

تارک نماز کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ	216
تارک نماز کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ	217
تارک نماز کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ	219
خرچ کرنے سے کیا مراد ہے	219
تمام آسمانی کتابوں پر ایمان	221
آخرت پر ایمان	223
ہدایت یافتہ لوگ	224
لوگوں کی تقسیم شریعت کی نظر میں	226
کفر کا لغوی معنی	227
اِنذار کے معنیٰ	227
شان نزول	228
بدقسمت لوگ	230
گناہوں کی دنیوی سزا سلب توفیق	231
شان نزول	235

نفاق کا آغاز	235
منافقین کا اللہ اور رسول کو دھوکہ دینے کی کوشش کرنا	238
شک وشبہ بیماری ہے	241
منافقین کا فساد کو اصلاح قرار دینا	247
خودفریبی کے شکار لوگ	252
صحابہ معیار حق ہیں	253
شان نزول	258
فریب زدہ لوگ	259
اللہ تعالیٰ کے استہزاء کی توجیہ	261
ایمان فروش لوگ	265
شک، کفر اور نفاق کیا ہے	267
شان نزول	275
منافقین کی ایک اور پہچان	275
اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان	281

وجود باری تعالیٰ پر دلائل	291
تصدیق نبوت اعجاز قرآن	296
جہنم کا ایندھن	303
جنت کے معنی	308
جنت کی نعمتیں	308
نیک مومنین کی جزاء	312
شان نزول	318
اللہ جل شانہ کی مثالیں اور دنیا	319
ٹھوس دلائل پر مبنی دعوت	330
عرش پانی پر تھا	333
آسمان وزمین کے درمیان کا فاصلہ	335
خلیفہ کی تعریف اور اس کی اقسام	344
لفظ آدم کے معنی	353
آدم (علیہ السلام) کی وجہ فضیلت	354

مسئلہ شفاعت	354
حضرت آدم (علیہ السلام) کا علم و فضل ظاہر ہونا	358
فرشتوں کا سجدہ تعظیمی	361
حضرت آدم (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کے احسانات	363
تعارف ابلیس	366
سفر ارضی کا آغاز	374
اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معافی نامہ کا متن	376
جنت کے حصول کی شرائط	379
بنو اسرائیل اور اللہ تعالیٰ کے مابین عہد کا بیان:	384
شان نزول:	386
تعلیم قرآن مجید پر اجرت لینے کی تحقیق:	387
بدخو یہودی	393
نماز با جماعت کی فضیلت اور فوائد:۔	395

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَسَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُ [1]

حضورؐ پر نزولِ وحی کے طریقے

وحی ورسالت کا یہ مقدس سلسلہ سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہو گی اور نہ اس کی ضرورت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاریؒ کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے،

۱۔ سنن نسائی باب: (خطبہ جمعہ کی کیفیت کا بیان ١٤٠٥) سنن الدارمی/ النکاح ۲۰ (۲۲۴۸) (صحیح)

اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آ جاتا ہے۔ (۱)

اس حدیث میں آپؐ نے ''وحی'' کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹتی نہیں دوسرے گھنٹی جب مسلسل بجتی ہے تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلام اِلٰہی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سُنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لیے آپؐ نے اسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دے دی ہے۔ (۲)

جب اس طریقے سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہؓ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپؐ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپؐ کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں، کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کا سانس رُکنے لگتا چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپؐ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ (۳)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپؐ جس جانور پر اُس وقت سوار ہوتے

صحیح بخاری ۲/۱

۲۔(فیض الباری،۱/۱۹و۲۰)

۳۔(الاتقان ۱/۴۶)

وہ آپؐ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپؐ نے اپنا سر اقدس حضرت زیدؓ بن ثابت کے زانو پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہوگئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی۔ (۱)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سُنائی دیتی تھی۔ (۲)

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیلؑ مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں، بہرکیف جب حضرت جبرئیلؑ انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزول وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے آسان ہوتی تھی۔ (۳)

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کیے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپؐ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجیاد

۱۔(زادالمعاد ۱/۱۸و۱۹)

۲۔(تبویب مسند احمدؒ کتاب السیرۃ النبویۃ: ۲۰/۲۱۲)

۳۔الاتقان ۱/۴۶

پر، پہلے دو واقعات تو صحیح سَند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔[۱]

چوتھی صورت براہ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہمکلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار، یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپؐ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں۔[۲]

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سامنے آئے بغیر آپؐ کے قلبِ مبارک میں کوئی بات اِلقاء فرمادیتے تھے، اسے اصطلاح میں ''نفث فی الرّوع'' کہتے ہیں۔[۳]

تاریخ نزولِ قرآن

قرآن کریم دراصل کلام الٰہی ہے، اس لیے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے

بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌۙ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظ

(بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں)۔

پھر لوحِ محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمان دنیا کے بیتِ عزّت میں نازل کردیا گیا تھا، بیت عزّت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

۱۔(فتح الباری ۱، /۱۸و۱۹)

۲۔(اتقان،۱/ ۴۶)

۳۔(ایضاً)

تھوڑا تھوڑا کر کے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیئیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزول قرآن کی یہ دوصورتیں خود قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائیؒ بیہقیؒ اور حاکمؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمان دنیا پر ہوا اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ (۱)

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمان دنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابوشامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی فرعتِ شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہل زمین کی ہدایت کے لیے اُتاری جانے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ اُتارنے سے یہ بھی جتانا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوحِ محفوظ میں اور دوسرے بیت عزّت میں۔ (۲) واللہ اعلم۔

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپؐ کی عمر چالیس (۴۰) سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوۂ بدر پیش آیا، لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترھویں، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائسویں شب معلوم ہوتی ہے (۳)

۱۔ (اتقان، ۱/۴۱)

۲۔ (مناہل العرفان، ۱/۳۹)

۳۔ (تفسیر ابن جریرؒ، ۱۰/۷)

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت

:۔صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سورہ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپؐ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپؐ غار حراء میں کئی کئی راتیں گزارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن اسی غار میں آپؐ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضورؐ نے فرمایا کہ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس کے بعد خود حضورؐ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہوگئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:۔

''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ....الخ،

(۹۶:۱تا۵)

''پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔'' الخ

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو ''فَتْرَتِ وَحِی'' کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غار حراء میں آیا تھا، آپؐ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۂ مدّثّر کی آیات آپؐ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ

جاری ہوگیا۔

مکّی اور مدَنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی صورتوں کے عنوان میں دیکھا ہوگا کہ کسی سورۃ کے ساتھ مکّی اور کسی کے ساتھ مدنی لِکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے مفسرین کی اصطلاح میں ''مکی آیت'' کا مطلب وہ آیت ہے جو آپؐ کے بغرضِ ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے پہلے نازل ہوئی، اور ''مدنی آیت'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی، بعض لوگ مکی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اُتری، لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لیے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لیے انہیں مکی کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات منٰی، عرفات یا سفرِ معراج کے دوران نازل ہوئی وہ بھی مکی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ جو آیتیں سفرِ ہجرت کے دوران مدینہ کے راستہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ مدنی ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپؐ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپؐ مدینہ طیبہ سے سیکڑوں میل دور بھی تشریف لے گے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ [۱]

پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکی یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورہ مدثر پوری مکی ہے،

۱۔(البرہان، ۱/ ۱۸۸ اور مناہل العرفان، ۱/ ۱۸۸)

اور سورہ آلِ عمران پوری مدنی، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت مکی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورہ اعراف مکی ہے، لیکن اس میں : وَ اسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ سے لے کر وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ الخ (۷:۱۶۳) تک کی آیات مدنی ہیں، اسی طرح سورہ حج مدنی ہے لیکن اس میں چار آیتیں یعنی: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ سے لے کر عَذَابَ يَوْمٍ عَقِيمٍ تک مکی ہیں (۲۲:۵۲۔۵۵)۔

اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ کسی سورت کا مکہ یا مدنی ہونا عموماً اس کی اکثر آیتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوگئیں اُسے مکی قرار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ہوں۔ [1]

مکہ و مدنی آیتوں کی خصوصیات

علماء تفسیر نے مکی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بین فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ ان میں سے بعض خصوصیات قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بعض اکثری ہیں، قواعد کلیہ یہ ہیں:۔

۱۔ ہر وہ سورت جس میں لفظ کَلَّا (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔

۲۔ ہر وہ سورت جس میں (حنفی مسلک کے مطابق) کوئی سجدے کی آیت آتی ہے، مکی ہے۔

۱۔ (مناہل العرفان، ۱/ ۱۹۲)

۳۔سورہ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ وابلیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکی ہے۔ [1]

۴۔ ہر سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

۵۔ ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے،۔

اور مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کی خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

۱۔مکی سورتوں میں عموماً ''یاأَیُّهَا النَّاسُ'' (اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مدنی سورتوں میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) کے الفاظ سے۔

۲۔مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات وسُور طویل اور مفصل ہیں۔

۳۔مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر ونشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر وتسلّی کی تلقین اور پچھلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام وقوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد وقتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کیے گے ہیں۔

۴۔مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے

۵۔مکی سورتوں کا اُسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، اس میں استعارات وتشبیہات اور تمثیلیں زیادہ سادہ ہیں۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز واسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی

۱۔(یہ قاعدہ اتقان وغیرہ سے ماخوذ ہے اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورۂ حج مکی ہے، لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہؓ وتابعین سے مروی ہے تو سورۂ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ محمد تقی عثمانی)

وجہ سے پیدا ہوا ہے مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بُت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لیے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بُت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آ چکی تھی، لوگ جُوق در جُوق اسلام کے سائے تلے آ رہے تھے، علمی سطح پر بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لیے یہاں احکام وقوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔

قرآن کریم کا تدریجی نزول

پیچھے آ چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تیئیس سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبرئیل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جُز لے بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ، (نساء: ۹۴) ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے دوسری طرف پوری سورہ انعام ایک ہی مرتبہ ہوئی ہے (ابن کثیر ۲/ ۱۲۲)

قرآن کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَا

ذٰلِكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (الفرقان: ۳۲، ۳۳)

''اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح) ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے) تاکہ ہم آپؐ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے''

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائیں ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:۔

۱۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے اس لیے اگر سارا قرآن ایک ہی مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا اس کے بخلاف حضرت موسیٰؑ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس لیے ان پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی۔

۲۔اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

۳۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبرئیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپؐ کی تقویت قلب کا سبب بنتا تھا۔

۴۔قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات سے متعلق ہے اس

لیے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کیے گے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی۔ ١

شانِ نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ازخود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سول وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہیے، یہ پس منظر مفسّرین کی اصطلاح میں ''سبب نزول'' یا ''شانِ نزول'' کہلاتا ہے، مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ہے:۔

لَتَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئین، اور بِلا شبہ ایک مؤمن کنیز ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ مشرکہ تمہیں پسند ہو۔''

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گے تو عناق نے انہیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ

١۔(تفسیر کبیر٦/٣٣٦)

آیت نازل ہوئی اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کردی۔ ①

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ''شانِ نزول'' یا سببِ نزول''، قرآن کریم کی تفسیر میں ''شان نزول'' نہایت اہمیت کا حاصل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اُن کا شان نزول معلوم نہ ہو۔

قرآن کریم کے سات حروف اور قرأتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لیے امت محمدؐیہ کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنوغِفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آگے، اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری اُمّت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں میری امّت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امّت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی اُمت قرآن کو سات (۷)

۱۔(اسباب النزول للواحدیؒ،ص ۳۸)

حروف پر پڑھے، پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قرأت درست ہوگی۔ [۱]

چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنْهُ. (صحیح بخاریؒ مع القسطلانیؒ، ۷/ ٤٥٣)

''یہ قرآن سات (۷) حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمہارے لیے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات (۷) حروف سے کیا مراد ہے؟ محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قرأتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق واختلاف کُل سات (۷) نوعیتوں پر مشتمل ہے، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:۔

(1) اسماء کا اختلاف: جس میں اِفراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر وتانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قرأت میں تَمَّتْ میں تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ ہے اور دوسری قرأت میں تَمَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ،

(2) افعال کا اختلاف: کہ کسی قرأت کہ کسی قرأت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قرأت میں رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا ہے اور دوسری میں رَبُّنَا بَعَّدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا،

(3) وجوہ اعراب کا اختلاف: جو میں اعراب یا زیر زبر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا يُضَارَّ كَاتِبٌ کی جگہ لَا يُضَارُّ كَاتِبٌ اور ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدُ کی جگہ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ

(4) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف؛ کہ ایک قرأت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو مثلاً ایک قرأت

۱۔(بحوالہ مناہل العرفان ۱/ ۱۳۳)

میں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور دوسری میں تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ،

(5) تقدیم وتاخیر کا اختلاف؛ کہ ایک قراء میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بَالْحَقِ اور وَجَآءَت سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ،

(6) بدلیت کا اختلاف؛ کہ ایک قرأت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قرات میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً نُنْشِزُهَا اور نَنْشُرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوْا اور فَتَثَبَّتُوْا، اور طَلْحٍ اور طَلْعٍ،

(7) لہجوں کا اختلاف: جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے، مثلاً مُوْسٰی کو ایک قرأت میں مُوْسَیْ کی طرح پڑھا جاتا ہے،

بہرحال! اختلافِ قرأت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قرأتیں نازل ہوئی تھیں اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا تھا۔ صرف تلاوت کی سہولت کے لیے ان کی اجازت دی گئی تھی،

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اسلوب کے پوری طرح عدی نہیں تھے، اس لیے اُن سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قرأتوں کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے، جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ دور فرمایا، اس دَور کو ''عرصۃ اخیرہ'' کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی قرأتیں منسوخ کردی گئیں، اور صرف وہ قرأتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے اپنے عہد خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے ، اوران سات نسخوں میں تمام قرأتوں کواس طرح سے جمع فرمایا، کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر زبر پیش نہیں ڈالے، تاکہ ان ہی مذکورہ قرأتوں میں سے جس قرأت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں، اس طرح اکثر قرأتیں اس رسم الخط میں سماگئیں، اور جوقرأتیں رسم الخط میں نہ سماسکیں اُن کومحفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قرأت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قرأت کے مطابق، امت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قرأتوں کو یادرکھنے کا اس قدراہتمام کیا کہ علم قرأت ایک مستقل علم بن گیا، اور سینکڑوں علما، قراء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کردیں،

دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں بھیجے توان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جواُن کی تلاوت سکھاسکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قرأتوں کے مطابق لوگوں کوقرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قرأتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قرأتوں کو یادکرنے اور دوسروں کوسکھانے ہی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں، اوراس طرح ''علم قرأت'' کی بنیاد پڑگئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لے ائمۂ قرأت سے رجوع کرنے لگے۔

کسی نے صرف ایک قرأت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری امت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ ''قرأت'' قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی

جاتی ہوں:۔

(1) مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو،

(2) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو،

(3) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قرأت میں مشہور ہو،

جس قرأت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جا سکتا، اس طرح متواتر قرأتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لیے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قرأتوں کو اختیار کر کے ان ہی کی تعلیم دینی شروع کردی، اور وہ قرأت اُس امام کے نام سے مشہور ہوگئی، پھر علماء نے ان قرأتوں کو اختیار کر کے ان ہی کی تعلیم دینی شروع کردی، اور وہ قرأت اُس امام کے نام سے مشہور ہوگئی، پھر علماؑ نے ان قرأتوں کو جمع کرنے کے لیے کتابیں لکھنی شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ، امام ابوحاتم سجتانیؒ، قاضی اسمٰعیلؒ اور امام ابو جعفر طبریؒ (متوفی ۳۲٤ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں بیس سے زیادہ قرأتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراء کی قرأتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہوگئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قرأتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے محض اتفاقاً ان سات قرأتوں کو جمع کردیا تھا، ان کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قرأتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علّامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ ''سبعۃ احرف'' کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قرأتیں مراد ہیں جنہیں ابن مجاہدؒ نے جمع کیا ہے، حالانکہ پیچھے بتایا جاچکا ہے کہ یہ سات قرأتیں صحیح قرأتوں کا محض ایک حصہ ہیں، ورنہ ہر

وہ قرأت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابل قبول اور ان سات قابل قبول اور ان سات حروف میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات قراء

بہر حال! علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ عبداللہ بن کثیر الداریؒ (متوفی ۱۲۰ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابوایوب انصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قرأت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قرأت کے راویوں میں بزّیؒ اور قنبلؒ زیادہ مشہور ہیں،

۲۔ نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیمؒ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر (۷۰) ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہ راست حضرت اُبی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قرأت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابوموسیٰؒ قالونؒ (متوفی ۲۲۰ھ) اور ابوسعید ورشؒ (متوفی ۱۹۷ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۳۔ عبداللہ الیحصبیؒ، جو ابن عامرؒ کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۱۱۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قرأت کا فن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قرأت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قرأت کے راویوں میں ہشامؒ اور ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں،

۴۔ ابوعمر وزبّان بن العلاء (متوفی ۱۵۴ھ) آپ نے حضرت مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور اُبی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قرأت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی،

آپ کی قرأت کے راویوں میں ابوعمر الدوریؒ (متوفی ۲٤٦ھ) اور ابوشعیب سوسیؒ (متوفی ۲٦۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۵۔حمزۃ بن حبیب الزیات مولیٰ عکرمہ بن ربیع الیتمیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) آپ سلیمان اعمشؒ کے شاگرد ہیں وہ یحیٰ بن وثابؒ کے، وہ زرّین جُبیشؒ کے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشام (متوفی ۱۸۸ھ) اور خلّاد بن خالدؒ (متوفی ۲۲۰ھ) زیادہ مشہور ہیں،

٦۔عاصم بن ابی النجود الاسدیؒ (متوفی ۱۲۷ھ) آپ زرّ بن حُبیشؒ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوعبدالرحمٰن سُلمیؒ کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قرأت کے راویوں میں شعبہ بن عیّاشؒ (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؒ (متوفی ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں آج کل عموماً تلاوت ان ہی حفص بن سلیمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے،

۷۔ابوالحسن علی بن حمزۃ الکسائی النّحویؒ (متوفی ۱۸۹ھ) ان راویوں میں ابوالحارث مروزیؒ (متوفی ۲٤۰ھ) اور ابوعمر الدّوریؒ (جو ابوعمروؒ کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخرالذکر تینوں حضرات کی قرأتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں،

لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قرأتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی کہ صحیح قرأتیں اِن سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدّد علماء (مثلاً علّامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن مہرانؒ) نے سات کے بجائے دس قرأتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ ’’قرآت عشرہ‘‘ کی اصطلاح مشہور ہوگئی، ان دس قرأتوں میں مندرجہ بالا سات قرّاء کے علاوہ ان تین

حضرات کی قرأتیں بھی شامل کی گئیں:۔

۱۔یعقوب بن اسحٰق حضرمیؒ (متوفی ۲۰۵ھ) آپ کی قرأت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی،

۲۔خلف بن ہشامؒ (متوفی ۲۰۵ھ) جو حمزہؒ کی قرأت کے بھی راوی ہیں،آپ کی قرأت کوفہ میں زیادہ رائج تھی۔

۳۔ابوجعفر یزید بن القعقاعؒ (متوفی ۱۳۰ھ) جن کی قرأت مدینہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی،

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ(۱۴) قاریوں کی قرأتیں جمع کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قراء کی قرأتوں کا اضافہ کیا:۔

(1) حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جن کی قرأت کا مرکز بصرہ تھا،

(2) محمد بن عبدالرحمٰن ابن محیصؒ (متوفی ۱۲۳ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا،

(3) یحیٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۲۰۲ھ) جو بصرہ کے باشندے تھے،

(4) ابوالفرج شنبوذیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے،

بعض حضرات نے چودہ(۱۴) قاریوں میں حضرت شنبوذیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے، ان میں سے پہلی دس(۱۰) قرأتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں۔ [۱]

عہد رسالتؐ میں حفاظت قرآن

قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی

۱۔(مناہل العرفان بحوالہ منجد المقرئین لابن الجزریؒ)۔

مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لیے عہد رسالتؐ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کرلیا جائے چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اُس کے الفاظ کو اُسی وقت دُہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہوجائیں، اس پر سورۂ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لیے آپؐ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دُہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپؐ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ اِدھر آپ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپؐ کو یاد ہوجاتیں، اس طرح سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم وتغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دَور کیا۔ (۱)

پھر آپ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سیکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کرکے اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کردی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے دُہراتے رہتے تھے، حضرت عُبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص

۱۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص۳۶ ج۔۹)

ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے، تا کہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجد نبویؐ میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہؐ لی علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تا کہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے۔ (۱)

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہوگئی جسے قرآن کریم ازبر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُم سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظِ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لیے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لیے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لیے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوسکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظے کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب

۱۔ (مناہل العرفان ۱/ ۲۳٤)

نامے یاد ہوتے تھے، اس لیے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوت حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں،

کتابت وحی

قرآن کریم کو حفظ کرانے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کے لیے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی، اور آپؐ کے جسم اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہوجاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا (کسی اور چیز کا ٹکڑا) لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ لکھواتے رہتے، اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہرحال؛ جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے ''پڑھو'' میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرما دیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔ [١]

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، جن میں خلفائے راشدینؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر

١۔(مجمع الزوائد ١/١٥٦ بحوالہ طبرانی)

ہیں۔ (۱)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔ (۲)

اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لیے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کیے گے ہیں۔ (۳)

اس طرح عہد رسالتؐ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرام بھی اپنی یادداشت کے لیے آیات قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام کے لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی نے ایک صحیفہ میں آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں۔ (۴)

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جمع قرآن

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی

۱۔(تفصیل کے لیے دیکھیں فتح الباری ۹/ ۱۸ اور زادالمعاد ۱/ ۳۰)

۲۔(فتح الباری ۹/ ۱۸)

۳۔(فتح الباری ۹ /۱۱)

۴۔(سیرت ابن ہشام)

کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ''عمرؓ نے ابھی آ کر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں'' میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں،

عمر نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ''تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بد گمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہٰذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو''۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ”خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا“ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لیے کھول دیا، جو حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھی کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا۔ ①

اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ بھی سینکڑوں حفّاظ اُس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جا سکتا تھا،

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لیے گے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کہ جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں حضرت زیدؓ نے انہیں یک جا فرمایا تا کہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان

۱۔ (صحیح بخاریؒ، کتاب فضائل القرآن)

عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے ، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

(1) سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے ،

(2) پھر حضرت عمرؓ بھی حافظِ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے۔ [۱]

(3) کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو اہلِ اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دے دی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ [۲]

(4) اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔ [۳]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے سُورہ برأۃ کی آخری آیات لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ الخ مجھے صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں'' اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی اور کو یاد

۱۔(فتح الباری ۹/ ۱۱ بحوالہ ابن ابی داوٗد)

۲۔(اتقان ۱/ ۱۰)

۳۔(البرہان فی علوم القرآن للزرکشیؒ ۱/ ۲۳۸)

نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جُز قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوا سے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں۔

ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزوِ قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے پاس آیات قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں، کسی اور کے پاس نہیں۔ [۱]

بہرکیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتّب شکل میں تحریر فرمایا۔ [۲]

لیکن ہر سورت علیٰحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لیے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو ''اُمّ'' کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:۔

(1) اس نسخہ میں آیاتِ قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتّب تھیں لیکن سورتیں مرتّب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔ [۳]

(2) اس نسخہ میں قرآن کے ساتوں حروف (جن کی تدریج پیچھے آچکی ہے) جمع تھے۔ [۴]

۱۔(البرہان ۱/۲۳۴،۲۳۵)

۲۔(اتقان ۱/۶۰)

۳۔(اتقان، حوالہ بالا)

۴۔(مناہل العرفان ۱/۲۴۶، وتاریخ القرآن للکردیؒ، ص ۲۸)۔

(3) اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی،

(4) اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتّب نسخہ تمام اُمّت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے،

حضرت ابوبکرؓ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپؓ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انہیں امّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکم نے اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر امّت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہیے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ (۱)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر رومؔ اور ایرانؔ کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی ، اُدھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قرأتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لیے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قرأت کے مطابق

۱۔(فتح الباری ۹/ ۱۶)

قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انہوں نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قرأتوں کا یہ اختلاف دو ردراز ممالک تک پہنچ گیا۔

جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے بعض لوگ اپنی قرأت کو صحیح اور دوسرے کی قرأت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قرأتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لیے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لیے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دی جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قرأت صحیح اور کون سی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا،

اس کارنامے کی تفصیل روایات حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قرأتوں کے بارے میں اختلاف ہورہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے، اور جاکر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و

نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قرأت پڑھتے ہیں، جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں،

حضرت عثمانؓ خود ہی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قرأت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلم نے دوسری قرأت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرأت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ:۔''

مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہٰذا آپ اُن لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے''۔ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ''میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مُصحف پر جمع کر دیں تا کہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے'' صحابہؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قرأتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک

دوسرے سے اختلاف کرتے ہو،اس سے ظاہر ہے کہ جولوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تواور بھی زیادہ تکذیب اوراختلاف کرتے ہوں گے،لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآن کا ایسانسخہ تیار کریں جوسب کے لیے واجب الاقتداء ہو،

اس غرض کے لیے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجیے،ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کردیں گے،حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی،جوحضرت زید بن ثابتؓ،حضرت عبداللہ بن زبیرؓ،حضرت سعید بن العاصؓ کی ایک جماعت بنائی،جوحضرت زید بن ثابتؓ،حضرت عبداللہ بن زبیرؓ،حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی،اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں،ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے،اور باقی تینوں حضرات قریشی،اس لیے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ ''جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو(یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کون سا لفظ کس طرح لکھا جائے؟)تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا،اس لیے کہ قرآن کریم ان ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے،''

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا،لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لیے ساتھ لگا دیا گیا۔ (۱)

۱۔(یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ص ۱۳ تا ۱۰ ج ۹ سے ماخوذ ہیں،)

ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:۔

(1) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سُورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔[۱]

(2) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرأتیں سما جائیں، اسی لیے اُن پر نہ نقطے لگائے گے اور نہ حرکات (زیر زبر پیش) تا کہ اسے تمام متواتر قرأتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، مثلاً سرھا لکھا تا کہ اسے نَنْشُرُ ھَا اور نُنْشِزُ ھَا دونوں طرح پڑھا جا سکے کیونکہ یہ دونوں قرأتیں درست ہیں۔[۲]

(3) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابوحاتم سجستانیؒ کا ارشاد ہے کہ کُل سات نسخے تیار کیے گے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔[۳]

(4) مذکورہ بالا کام کرنے کے لیے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو ان ہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لیے وہی طریق کار اختیار کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ لعیہ وسلم

۱۔(مستدرک ۲/ ۲۲۹)

۲۔(مناھل العرفان ۱/ ۲۵۳و۲۵۴)

۳۔(فتح الباری ۹/ ۱۷)

کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ ازسرنو مقابلہ کر کے یہ نسخے تیار کیا گیا، اس مرتبہ سورہ احزاب کی ایک آیت: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ علٰحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی ، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی،

کیونکہ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں کہ: ''مصحف لکھتے وقت سورۃ احزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا''۔ اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت ہجرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گے ظاہر ہے کہ یہ آیت اُن میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔

اس لیے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مِل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علٰیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورہ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خُذیمہؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی،

(5) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش فرما دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تا کہ رسم الخط، مسلمہ قرأتوں کے

اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے،

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری امت نے بہ نظر استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

''عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سِوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا۔ [۱]

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات

حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمّت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اِسی طریقے کے مطابق لکھے گے، اور صحابہؓ و تابعینؒ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر، زبر، پیش سے خالی تھے، اس لیے اہلِ عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اِسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لیے مختلف اقدامات کیے گے، جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطے اہل عرب میں ابتداء حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا۔ اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے

۱۔ (فتح الباری ۹/ ۱۵)

عادی تھے کہ انہیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، اور سیاق وسباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی بہ آسانی ہو جاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں، بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالم اسلام کے مختلف حصّوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گے تھے جو اسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں، کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابو الاسود دوَلیؒ نے انجام دیا۔ ۱

بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین کے تحت کیا۔ ۲

اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے ان سے یہ کام کرایا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ کارنامہ حجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ یحیٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم اللیثیؒ کے ذریعہ انجام دیا۔ ۳

حرکات لفظوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زَبر، پیش) بھی تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کِس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابو الاسود دوَلیؒ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحیٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا۔ ۴

۱۔(البرہان ۱/ ۲۵۰)

۲۔(صبح الاعشی ۳/ ۱۵۵)

۳۔(تفسیر القرطبیؒ ۱/ ۶۳)۔

۴۔(قرطبی ۱/ ۶۳)۔

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیشِ نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دولیؒ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آج کل رائج ہیں بلکہ زبر کے لیے حرف کے اوپر ایک نقطہ (ـ۔ـ) زیر کے لیے حرف کے نیچے ایک نقطہ اور پیش کے لیے حرف کے سامنے ایک نقطہ اور تنوین کے لیے دو نقطے (اوپر یا نیچے یا کھڑے دو نقطے) مقرر کئے گئے۔ بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں۔ [۱]

اس کے بعد حجّاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؒ، نصر بن عاصم لیثیؒ اور حسن بصریؒ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لیے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی موجودہ صورتیں مقرر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہٗ اعلم۔

احزاب یا منزلیں صحابہؓ اور تابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے ''حِزب'' یا ''منزل'' کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو کُل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا۔ [۲]

اجزاء یا پارے آج کل قرآن کریم تیس (۳۰) اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لیے آسانی کے خیال سے تیز مساوی حصّوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت

۱۔ (صبح الاعشی ۳/۱۶۰و۱۶۱)
۲۔ (البرہان ۱/۲۵۰)

عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہٰذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں ان کا رواج ہے۔ [۱]

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہدِ صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لیے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

اخماس اور اعشار

قرون اُولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ ''خمس'' یا ''خ'' اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ ''عشر'' یا ''ع'' لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو ''اخماس'' اور دوسری قم کی علامتوں کو ''اعشار'' کہا جاتا تھا۔ [۲]

علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب یہ پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیف مامون نے اس کا حکم دیا تھا۔ [۳]

لیکن یہ دونوں اقوال اس لیے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں ''اعشار'' کا تصوّر ملتا

۱۔(البرہان ۱/ ۲۵۰ ومناہل العرفان ۱۔۴۰۲)

۲۔(مناھل العرفان ۱/ ۳۰۴)

۳۔(البرہان ۱/ ۲۵۱)

ہے، چنانچہ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں ''اعشار'' کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے ۔ (۱)

رکوع

''اخماس'' وراعشار'' کی علامتیں تو بعد میں متروک ہو گئیں ،لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے، اوراس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ''ع'') بنادی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے ،اوراس کو''رکوع'' اسی لیے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن میں ۵٤٠ رکوع ہیں۔ (۲)

اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے، تو ستائیسویں شب میں قرآن کریم ختم ہو سکتا ہے۔ (۳)

۱۔(مصنف ابن ابی شیبہؒ ۲/ ٤٩٧)

۲۔(فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ٥٤٠ ہی بین کی گئی ہے،لیکن جب ہم نے قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ٥٥٨ پائی۔اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ ان کی گنتی کے مطابق رکوعات کی ل تعداد ٥٦٧ ہے، کہ رکوع کی علامت لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو، واللہ اعلم:

۳۔(فتاویٰ عالمگیریہ فصل التراویح ۱/ ٩٤)

رموز اوقاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لیے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھ دیئے گے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، اس میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابوعبداللہ محمد بن طیفور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے۔ [۱]

ان رموز کی تفصیل یہ ہے،

ط:۔ یہ''وقفِ مطلق'' کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہوگئی ہے اس لیے یہاں وقف کرنا بہتر ہے

ج:۔ یہ''وقفِ جائز'' کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز :۔ یہ''وقف مجوّز'' کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ قف نہ کیا جائے۔

ص:۔ یہ''وقف مرخّص'' کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہوگیا ہے، اس لیے سانس لینے کے لیے دوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہیں۔ [۲]

۱۔(النشری فی القرآت العشر ۱/۲۲۵)
۲۔(المخ الفکریہ، ص ۶۳)

م :۔ یہ ”وقفِ لازم“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے وقفِ واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے۔ [۱]

لا :۔ یہ ”لَاتَقِفْ“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ”یہاں اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتری یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں۔ [۲]

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندیؒ کے وضع کیے ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:۔

مع :یہ ”معانقہ“ کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے، جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ ∴ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ ∴ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ :الخ اس میں اگر التّوراۃ پر وقف درست نہیں، اور اگر اَلْاِنْجِيل پر وقف کرنا ہے تو اَلتَّوْرٰة پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقفت نہ کریں تو درست ہے، اس کا ایک نام ”مقابلہ“ بھی ہے، اور اس کی سب

۱۔(النّشر ۱/۲۳۱)

۲۔(النشر، ص ۲۳۳ ج۱)(o گول دائرہ یہ علامتِ آیت ہے

سے پہلے نشان دہی امام ابوالفضل رازیؒ نے فرمائی ہے۔[۱]

سکتہ :۔ یہ ”سکتہ“ کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہیے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

وقفہ :۔ اس جگہ ”سکتہ“ سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہیے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔

ق :۔ یہ ”قِيْلَ عَلَيْهِ الْوَقْفُ“ کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

قف :۔ یہ لفظ ”قِفْ“ ہے جس کے معنی ہیں ”ٹھہر جاؤ“۔ اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہوسکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

صلے :۔ یہ ”اَلْوَصْلُ اَوْلٰی“ کا مخفّف ہے جس کے معنی ہیں کہ ”ملا کر پڑھنا بہتر ہے“۔

صل :۔ یہ ”قَدْ يُوْصَلُ“ کا مخفّف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف النّبی صلّی اللہ علیہ وسلم: یہ اُن مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

قرآن کریم کی طباعت

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دَور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم

۱۔(النّشر،ص ۲۳۷ ج۱ والاتقان ص ۸۸ ج۱)

کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لیے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصّل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لیے مستقِل ایک تصنیف چاہیے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ کے مقام پر ۱۱۱۳ء میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہّ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہوسکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۷۸۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہوگے۔ [۱]

علم تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علمِ تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں، عربی زبان میں ’’تفسیر‘‘ کے لفظی معنی ہیں ’’کھولنا‘‘ اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے (البرہان) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:۔

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ ۝ (۱۶:۴۴)۔

’’اور ہم نے قرآن آپؐ پر اُتارا تا کہ آپؐ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن للکردی ص ۱۸۶، اور علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح اردو ترجمہ از غلام احمد حریری ۱۴۲)۔

اُن کی طرف اُتاری گئیں ہیں“۔

نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (۳:۱۶٤)

بِلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جب کہ اُن کے درمیان ان ہی میں سے ایک رسول ؐ بھیجا، جو اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور انہیں اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے“۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابۂ کرامؓ کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپؐ سے رجوع کرتے اور انہیں تسلی بخش جواب مِل جاتا، لیکن آپؐ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقِل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ اُمّت کے لیے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور ملحد و گمراہ لوگوں کے لیے اس کی معنوی تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امّت نے یہ کارنامہ اس حُسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ اس کی

وہ صحیح تفسیر وتشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیر قرآن کے مآخذ

علمِ تفسیر کو اس اُمّت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کیسی کیسی مشقتیں اُٹھائیں؟ اور یہ جدّو جہد کتنے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا کیا ہیں؟ اور عِلم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کِن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، یہ سرچشمے کُل چھ (٦) ہیں۔

ا۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کردیتی ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کی دُعاء میں یہ جملہ موجود ہے کہ ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ ''یعنی'' ہمیں اُن لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا'' اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعیّن کردیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ

الصّٰلِحِيْنَ ﴿٦٩﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء صدّیقین، شہداء اور صالح لوگ''۔

چنانچہ مفسرین کرامؒ جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲۔ حدیث

''حدیث'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپؐ کو مبعوث ہی اس لیے فرمایا تھا کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرما دیں، چنانچہ آپؐ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحُسن وخوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپؐ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے۔ اس لیے مفسرین کرامؒ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کیے ہیں۔

البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لیے محقق، مفسّرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقیدِ روایات کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہٰذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہی ہے اور اس میں قدم رکھنا ان ہی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ

کی ہیں۔

۳۔صحابہؓ کے اقوال

صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کے وقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اورانہوں نے نزولِ قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس لیے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابل اعتماد ہوسکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرامؓ کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہؓ کا اتفاق ہوتو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرامؓ کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کون سی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصول فقہ، اصولِ حدیث اور اصول تفسیر میں مدوّن ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔تابعینؒ کے اقوال

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرامؓ سے سیکھی ہے، اس لیے اُن کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعینؒ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا

سکتا ہے۔[1]

۵۔ لُغتِ عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لیے تفسیر قرآن کے لیے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شانِ نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لیے اُن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ اُن کی تفسیر کا ذریعہ صرف لُغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لیے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

٦۔ تدبّر اور استنباط

تفسیر کا آخری مأخذ ''تدبّر اور استنباط'' ہے، قرآن کریم کے نکات واسرار ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے، جس کی کوئی حدّ ونہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور وفکر کرتا ہے اُتنے ہی نئے نئے اسرار ونکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرامؒ اپنے اپنے تدبّر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار ونکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جب کہ وہ مذکورہ بالا پانچ مآخذ سے متصادم نہیں ہوں، لہذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن وسنت، اجماع، لغت یا صحابہؓ کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی

۱۔(الاتقان ۲/ ۱۷۹)

دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہوتو اس کا کوئی اعتبار نہیں بعض صوفیاءؒ نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن اُمّت کے محقق علماء نے انہیں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن وسنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ (١)

اسرائیلیات کا حکم

''اسرائیلات'' اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرینؒ کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انہیں سند کے ساتھ پہنچتی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لیے اُن کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ پہلے اہل کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انہیں قرآن کریم میں پچھلی اُمّتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انہوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انہوں نے اپنے پُرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوگئی ہیں، حافظ ابن کثیرؒ نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

١۔ وہ روایات جن کی سچائی قرآن وسنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور

١۔ (اتقان ٢/١٨٤)

حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کا کوہ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

۲۔ وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن وسنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہو گے تھے ،اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے کہ: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (۲:۱۰۲)، (اور سلیمانؑ کافر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا) اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

۳۔ وہ روایات جن کے بارے میں قرآن وسنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ تورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؒ نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انہیں نقل کرنا جائز تو ہے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں ہے۔ [۱]

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلّقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصرف اور بلاغت و ادب

۱۔ (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ وتفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لیے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شُدھ بُدھ رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں بلکہ پُرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چُوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے،

جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے کہ ڈاکٹر بننے کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری

ہے، جب ڈاکٹر اور انجنیئر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن وحدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم وفن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم وفن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن وسنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لیے کسی علم وفن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (٥٤:١٧١)

’’اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کردیا ہے‘‘۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لیے کسی لمبے چوڑے علم وفن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیّت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت وموعظت کے مضامین بیان کیے گے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت ودوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کردیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظِ لِلذِّکرِ (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کررہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام وقوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کما حقہ، سمجھنا اور ان سے احکام ومسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل ہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لیے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علّامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفّانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہیں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ:۔

فتعلّمنا القراٰن والعلم والعمل جمیعاً

''ہم نے قرآن اور علم وعمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے''۔ ⑴

چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورہ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ ⑵

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری عربی تھی، جو عربی کے شعروادب میں مہارت تامّہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن

۱۔(اتقان ۲/ ۱۷۲)

۲۔(اتقان ۲/ ۱۷۲ نوع ۷۷)

کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے اتنی طویل مدّت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لیے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزول وحی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود ''عالم قرآن'' بننے کے لیے باقاعدہ حضورؐ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزول قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شُدبُد پیدا کرکے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسّر قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ:۔

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوّأ مقعدہ فی النّار

''جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنّم میں بنالے''۔ ١

اور:۔ من تکلّم فی القرآن برأیہ فأصاب فقد أخطأ

''جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہدے تب بھی اس نے غلطی کی''۔ ٢

احقر

ڈاکٹر محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

١۔(ابوداؤدؒ، ازاتقان ٢/ ١٧٩)

٢۔(ابوداؤدونسائیؒ، ازاتقان ٢/ ١٧٩)

سورۃ الفاتحہ

اس سورت میں 1 رکوع، 7 آیتیں، 27 کلمے اور 140 حروف ہیں۔ [۱]

سورہ فاتحہ کا مقام نزول

سورہ فاتحہ کے نزول کے متعلق متعدد روایات ہیں' بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے' اس لیے محققین کا یہ موقف ہے کہ یہ سورت دوبار نازل ہوئی ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں۔ علامہ سیوطی نے ان تمام روایات کو جمع کر دیا ہے۔

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

واحدی نے "اسباب النزول" میں اور ثعلبی نے اپنی تفسیر میں حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں ایک خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے۔

امام ابن ابی شیبہ نے "مصنف" میں اور ابو نعیم اور بیہقی دونوں نے اپنی اپنی "دلائل النبوۃ" اور واحدی اور ثعلبی نے از ابی میسرہ از عمرو بن شرجیلؒ روایت کیا ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: جب میں خلوت میں ہوتا ہوں تو ایک آواز سنتا ہوں' بہ خدا! آپ امانت کو ادا کرتے ہیں' صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں' اسی اثناء میں حضرت ابو بکرؓ آئے، اس وقت گھر میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہیں تھے' حضرت خدیجہؓ نے انکو بتایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ

۱۔ تفسیر بصیرت قرآن

وآلہ وسلم) نے یہ فرمایا تھا' اور کہا: آپ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ورقہ کے پاس جائیں، جب رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ ورقہ کے پا چلیں' آپ نے پوچھا: تم کو کس نے بتایا؟ انہوں نے کہا: حضرت خدیجہؓ نے پھر دونوں ورقہ کے پاس گئے' اور اس کو واقعہ سنایا' آپ نے فرمایا: جب میں خلوت میں تھے تو آپ کو آواز آئی: یا محمد! کہیے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العلمین" اور اس کو "ولا الضالین"۔ تک پڑھا' اور کہا: کہیے: "لا الہ الا اللہ" پھر آپ ورقہ کے پاس گئے اور اس کو یہ واقعہ سنایا' ورقہ نے کہا: آپکو بشارت ہو' میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جس کے آنے کی ابن مریم (علیہ السلام) کو بشارت دی گئی تھی اور آپ کے پاس حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ناموس کی مثل ہے' اور آپ نبی مرسل ہیں۔

امام ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب بنوسلمہ کے جوان مسلمان ہوئے اور عمرو بن جموع کا بیٹا مسلمان ہوا تو عمرو کی بیوی نے عمرو سے کہا: تم اپنے بیٹے سے پوچھو وہ اس شخص سے کیا روایت کرتے ہیں؟ عمرو نے اپنے بیٹے سے کہا: مجھے اس شخص کا کلام سناؤ تو اس کے بیٹے نے پڑھا: (آیت) "الحمد للہ رب العلمین" اور "الصراط المستقیم"۔ تک پڑھا اس نے کہا: یہ کتنا حسین اور جمیل کلام ہے کیا اس کا سارا کلام اسی طرح ہے؟ اس کے بیٹے نے کہا: اے ابا اس سے بھی زیادہ حسین ہے، اور یہ ہجرت سے پہلے واقعہ ہے' ان تینوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام ابن ابی شیبہؒ نے "مصنف" میں ابوسعید بن اعرابی نے "معجم" میں اور طرانیؒ نے "اوسط" میں مجاہدؒ کی سند سے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب فاتحۃ الکتاب نازل ہوئی تو ابلیس خوب رویا اور یہ

مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔

وکیع اور فریابی نے اپنی تفسیروں میں ابوبکر بن انباری نے "فضائل قرآن" میں امام ابن ابی شیبہؒ نے "مصنف" میں عبد بن حمید اور ابن منذرؒ نے اپنی تفسیر میں ابوبکر بن انباری نے "کتاب المصاحف" میں' ابوالشیخ نے "العظمۃ" میں اور ابونعیمؒ نے "حلیہ" میں مجاہدؒ سے روایت کیا ہے کہ فاتحۃ الکتاب مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

وکیعؒ نے اپنی تفسیر میں مجاہدؒ سے روایت کیا ہے کہ فاتحۃ الکتاب مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ [۱]

اب تینوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔

سورہ فاتحہ کے اسماء

اس سورہ کا نام سورہ الفاتحہ ہے فتح کا ایک معنی کھولنا بھی ہے چونکہ یہ سورہ قرآن کریم کو کھولنے والی ہے، اس سے قرآن کریم کی ابتداء ہوتی ہے اس لیے اس کو فاتحہ کہتے ہیں۔

فاتحہ کے لفظی معنی ہیں ابتدا کرنے والی کے۔ قرآن مجید کی اس ابتدائی سورت کو بھی اسی لیے الفاتحہ کہتے ہیں۔ یہ گویا دیباچہ قرآن ہے۔

امام سیوطیؒ نے تفسیر اتقان میں سورہ فاتحہ کے پچیس نام ذکر کئے ہیں' جن میں چند نام یہ ہیں:

(۱) **فاتحۃ الکتاب**: فاتحۃ الکتاب کے ساتھ اس سورت کو اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ مصحف کا افتتاح اس سورت سے ہوتا ہے، تعلیم کی ابتداء بھی اس سورت سے ہوتی ہے اور نماز میں قرأت کا افتتاح بھی اس سورت سے ہوتا ہے اور ایک قول کے مطابق کتاب اللہ کی سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی تھی اور

۱۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

بہ کثرت احادیث میں تصریح ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو فاتحۃ الکتاب فرمایا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے فاتحۃ الکتاب کونہیں پڑھا اس کی نماز (کامل) نہیں ہوئی۔ [۱]

(۲) **ام القرآن**: نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو "ام القرآن" فرمایا ہے امام داری روایت کرتے ہیں حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

الحمد للہ "ام القرآن" ہے اور "ام الکتاب" ہے اور "سبع مثانی" ہے۔ [۲]

امام مسلمؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ "لا صلوۃ لمن لم یقرء بام القرآن" جو ام القرآن نہ پڑھے اس کی نماز کامل نہیں ہے۔ [۳]

(۳) **سورہ الحمد**: اس سورت کا نام "سورہ الحمد" بھی ہے کیونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی حمد ہے، جیسے سورہ بقرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سورت میں بقرہ کا ذکر ہے، اسی طرح سورہ اعراف، سورہ انفال اور سورہ توبہ کے اسماء ہیں، نیز مذکور الصدر "سنن دارمی" کی حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو الحمد للہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ [۴]

(۴) **السبع المثانی**: قرآن مجید میں ہے:

۱۔ (جامع ترمذی ص ۶۳، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی) اس حدیث کو امام ابن ماجہ اور امام احمد

۲۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۱، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

۳۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

۴۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۱، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

(آیت) ولقد اتینک سبعا من المثانی، (الحجر: ۸۷) ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو دہرائی جاتی ہیں۔

امام بخاری (رح) نے روایت کیا ہے: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (آیت) "الحمد للہ رب العلمین"۔ السبع المثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔ [۱]

سنن دارمی کی مذکور الصدر حدیث میں بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو السبع المثانی فرمایا ہے۔ اس سورت کو السبع اس لیے فرمایا ہے کیونکہ اس میں سات آیتیں ہیں اور مثانی فرمانے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(اول) اس سورت کے نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے اور نصف میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے (ثانی) ہر دو رکعت نماز میں اس کو دو مرتبہ پڑھا جاتا۔ (ثالث) یہ سورت دوبار نازل کی گئی ہے۔

(۵) **ام الکتاب**: سنن دارمی کی مذکور الصدر حدیث میں اس سورت کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے "ام الکتاب" فرمایا ہے اور "صحیح بخاری" میں ہے: حضرت ابوسعید خدری (رض) نے ایک شخص پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جس کو بچھو نے کاٹا ہوا تھا اور کہا: میں نے صرف ام الکتاب پڑھ کر دم کیا ہے۔ [۲]

(٦) **الوافیہ**: سفیان بن عینیہ نے اس کا نام سورہ وافیہ رکھا، کیونکہ صرف اس سورت کو نماز میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورہ الکوثر کو بھی ایک رکعت میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا لہٰذا یوں کہنا چاہیے کہ اس سورت کے مضامین جامع اور وافی ہیں اس لیے اس کو وافیہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷٤۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

۲۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷٤۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

(۷) **الکافیہ**: اس سورت کو کافیہ اس لیے کہتے ہیں کہ دوسری سورتوں کے بدلہ میں اس سورت کو پڑھا جاسکتا ہے اور اس سورت کے بدلہ میں کسی سورت کو نہیں پڑھا جاسکتا۔ حضرت عبادہ بن الصامت ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ام القرآن" دوسری سورتوں کا عوض ہے اور دوسری کوئی سورت اس کا عوض نہیں۔ [۱]

(۸) **الشفاء**: امام دارمی روایت کرتے ہیں: حضرت عبدالملک بن عمیر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب، ہر بیماری کی شفاء ہے۔ [۲]

(۹) **سورہ الصلوٰۃ**: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس سورت پر صلوٰۃ کا اطلاق کیا ہے، امام مسلم ؒ نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے: میں نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نماز (سورہ فاتحہ) کو میرے اور میرے بندہ کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا گیا ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے، پس جب بندہ کہتا ہے: (آیت) "الحمدللہ رب العلمین"۔ تو میں کہتا ہوں: بندہ نے میری حمد کی۔ [۳]

(۱۰) **سورہ الدعا**: یہ سورت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے، پھر بندہ کی عبادت کا ذکر ہے، پھر اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی دعا ہے اور دعا اور سوال کا یہی اسلوب ہے کہ پہلے داتا کی حمد و ثناء کی جائے، پھر دست طلب بڑھایا جائے، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی ہے، پھر اپنے لیے دعا کی ہے:

۱۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۔ ۱۹ الجامع الاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۱۳)

۲۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۰، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

۳۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰۔ ۱۶۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۷۵ ھ)

ترجمہ (وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہی مجھے ہدایت دیتا ہے اور وہی مجھے کھلاتا ہے اور وہی مجھے وفات دے گا اور پھر زندہ فرمائے گا اور اسی سے مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن وہی میری (ظاہری یا اجتہادی) خطائیں معاف فرمائے گا اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیکوں کے ساتھ لاحق کر دے اور میرے بعد آنے والی نسلوں میں میرا ذکر خیر جاری رکھ اور مجھے جنۃ النعیم کے وارثوں میں شامل کر دے۔ (الشعراء: ۸۵-۸۷)

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے دعا کی: ترجمہ: اے آسمانوں اور زمینوں کو ابتداء پیدا کرنے والے' تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے' میری وفات اسلام پر کر اور مجھے نیکوں کے ساتھ لاحق کر دے (یوسف: ۱۰۱)

(۱۱) اساس: ایک شخص نے امام شعبی سے اپنے پہلو میں درد کی شکایت کی تو امام شعبی نے کہا: تو اساس القرآن، فاتحہ الکتاب پڑھ۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لیے ایک اساس (بنیاد) ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے، کیونکہ اس سے زمین پھیلائی اور آسمانوں کی اساس عریب ہے یہ ساتواں آسمان ہے، زمین کی اساس عجیب ہے، یہ نچلی ساتویں زمین ہے، جنتوں کی اساس جنت عدن ہے، یہ جنتوں کی ناف ہے اس پر جنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آگ کی اساس جہنم ہے اور نیچے والا ساتواں طبقہ ہے اس پر درکات کی بنیاد رکھی گئی ہے، خلق کی اساس آدم ہیں اور انبیاء کی اساس نوح ہیں، بنی اسرائیل کی اساس یعقوب ہیں، کتب کی اساس قرآن ہے، قرآن کی اساس سورہ فاتحہ ہے، سورہ فاتحہ کی اساس بسملہ ہے جب تو بیمار ہو یا تجھے تکلیف ہو تو تجھے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے،

تجھے شفا ہوگی۔ [۱]

علامہ آلوسی نے سورہ فاتحہ کے بائیس اسماء کا ذکر کیا ہے‘ ان میں فاتحہ القرآن‘ تعلیم القرآن‘ تعلیم المسئلہ‘ سورہ السوال‘ سورہ المناجاۃ‘ سورہ التفویض شافعیہ‘ اور سورہ النور بھی ہیں۔

سورہ فاتحہ کے فضائل

خواب اور تعبیر: جس نے سورہ فاتحہ کو پورا یا کچھ خواب میں پڑھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ ایسی دعائیں کرے گا جو قبول ہوں گی اور ایسا فائدہ حاصل کرے گا جس سے اس کو مسرت ہوگی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے کی عمر دراز ہوگی اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اور وہ مستجاب الدعوات ہوگا اور جس کی دلیل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا ہے کہ آپ ہر دعا کے بعد پہلے اور بعد الحمدللہ رب العلمین پڑھا کرتے تھے۔ (تعبیر الرویا علامہ ابن سیرین)

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ بیان کرتے ہیں، ایک دن جبرائیل (علیہ السلام) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے اوپر کی طرف سے بڑے زور سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی، انھوں نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا: ”آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے، جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا تھا اور اس سے ایک فرشتہ اترا ہے۔“ پھر فرمایا: ”اس دروازے سے یہ فرشتہ زمین پر اترا ہے، یہ آج کے دن سے پہلے کبھی نہیں اترا۔“

اس فرشتے نے (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو) سلام کیا اور کہا: ”آپ کو ان دونوروں کی خوشخبری ہو جو آپ کو عنایت ہوئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے، ان میں سے ایک

۱۔ تفسیر قرطبی

سورہ الفاتحہ ہے اور دوسرا نور ہے سورہ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ جب بھی ان دونوں میں سے کوئی کلمہ تلاوت کریں گے تو آپ کو مانگی ہوئی چیز ضرور عطا کر دی جائے گی۔ [١]

سورہ فاتحہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت ہے، جیسا کہ سیدنا ابوسعید بن معلیٰ ؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بلایا، میں اسی وقت حاضر نہ ہوا (بلکہ نماز پڑھ کر گیا) اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا (اس وجہ سے دیر ہوئی) تو آپ نے فرمایا: "کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا: اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ [الانفال: ٢٤] "تم اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو، جب وہ تمہیں بلائے۔" پھر مجھ سے فرمایا: "تیرے مسجد سے باہر جانے سے پہلے میں تجھے قرآن کی ایک ایسی سورت بتاؤں گا جو (اجر و ثواب میں) ساری سورتوں سے بڑھ کر ہے۔"

پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، جب آپ نے باہر آنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں تم کو ایک سورت بتلاؤں گا جو قرآن کی سب سورتوں سے بڑھ کر ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہ سورت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے، یہی السبع المثانی (یعنی سات آیتیں ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں) اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔" [٢]

اس سورہ کریمہ کے پڑھ کر پھونکنے سے یعنی دم سے سانپ وغیرہ کے زہر کا اثر اللہ کے حکم سے ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں کہ عرب کے ایک قبیلہ کے پاس سے کچھ صحابہ کا گزر ہوا، قبیلہ والوں نے صحابہ کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا، اسی اثنا میں ان کے سردار کو بچھو (یا سانپ)

١۔ [مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل الفاتحۃ وخواتیم سورہ البقرۃ۔۔الخ: ٨٠٦]

٢۔ [بخاری، کتاب التفسیر، باب ماجاء فی فاتحۃ الکتاب: ٤٤٧٤]

نے کاٹ لیا۔قبیلہ والوں نے صحابہ سے کہا،تمہارے پاس کوئی دوا ہو، یا تم لوگوں میں کوئی دم جھاڑ کرنے والا شخص ہو؟ صحابہ نے کہا،تم نے ہماری مہمان نوازی نہیں کی ،لہٰذا جب تک تم ہمیں کچھ مال نہ دو گے ہم علاج نہیں کریں گے۔اس پر ان لوگوں نے کچھ بکریاں دینے کا وعدہ کیا تو ایک شخص نے سورہ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور ساتھ ساتھ وہ تھوک جمع کرتا اور (متاثرہ جگہ) تھتکارتا جاتا،تو یوں سردار اچھا ہو گیا۔ وہ بکریاں لے کر آئے تو بعض صحابہ نے کہا، ہم بکریاں نہیں لیں گے، جب تک کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت نہ کرلیں۔ واپسی پر انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس پر مسکرا دیے اور اس شخص سے فرمایا: ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورت رقیہ (دم) ہے؟ (تم نے ٹھیک کیا) یہ بکریاں لے لو اور اپنے ساتھ میرا بھی حصہ نکالو۔“ [۱]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ پڑھ کر شخص پر دم کرنا جائز ہے‘ اس لیے سورت کو ”سورہ الرقیہ“ اور ”سورہ الشفاء“ بھی کہتے ہیں‘ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اجرت کا مطالبہ اس لیے کیا تھا کہ اہل بستی نے ان کی مہمانی سے انکار کر دیا تھا، لہٰذا جائز دم کرنا اور اس کی اجرت لینا جائز ہے، لیکن اسے ایک مستقل پیشہ بنا لینا ثابت نہیں۔ پھر مہمل الفاظ سے تعویذ لکھنا، انھیں پانی میں گھول کر پلانا، گلے میں لٹکانا یا کسی دوسری جگہ باندھنا، تو ایسے کام شرعاً ناجائز ہیں۔

تورات و انجیل اور قرآن مجید میں سورہ فاتحہ کی مثل کوئی سورت نہیں، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابی بن کعب ؓ سے فرمایا: ”کیا تم اس بات کو پسند

۱۔[بخاری، کتاب الطب، باب الرقی بفاتحۃ الکتاب: ۵۷۳۶۔ مسلم، کتاب السلام، باب جواز أخذ الأجرۃ علی الرقیۃ بالقرآن والأذکار: ۲۲۰۱]

کرتے ہو کہ میں تمہیں ایک ایسی سورت سکھاؤں کہ اس جیسی سورت نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ زبور میں، نہ انجیل میں اور نہ قرآن میں۔" ابی بن کعب ؓ نے عرض کیا، ہاں! اے اللہ کے رسول! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میں امید کرتا ہوں کہ تم اس دروازے سے نہ نکلنے پاؤ گے کہ وہ تمہیں سکھادی جائے گی۔" سیدنا ابی ؓ کہتے ہیں، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ سے بات کرنے لگے، میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا، اس ڈر سے کہ کہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بات ختم کرنے سے پہلے (دروازہ پر) نہ پہنچ جائیں۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! وہ کون سی سورت ہے جس کے بتانے کا آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟" سیدنا ابی ؓ کہتے ہیں، میں نے سورہ الفاتحہ پڑھ کر سنائی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ نے اس سورت کے مثل نہ تورات میں کوئی سورت نازل کی، نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ فرقان (قرآن) میں اور بیشک وہ سبع مثانی ہے۔"[۱]

امام مسلمؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میرے اور میرے بندے کے درمیان صلوۃ (سورہ فاتحہ) کو آدھا آدھا تقسیم کردیا گیا ہے' اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے' اور جب بندہ کہتا ہے '(آیت) "الحمدللہ رب العالمین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندہ نے میری حمد کی' اور جب وہ کہتا ہے: "الرحمن الرحیم" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری ثناء کی' اور جب وہ کہتا ہے، (آیت)

۱۔[مسند أحمد:۲/۴۱۲، ۴۱۳، ح:۹۳۶۴۔ ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل فاتحۃ الکتاب:۲۸۷۵] یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

"۔ مالک یوم الدین" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' میرے بندہ نے میری تعظیم کی، اور ایک بار فرمایا، میرے بندہ نے (خود) کو میرے سپرد کر دیا' اور جب وہ کہتا ہے (آیت) "۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے' اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے، اور جب وہ کہتا ہے : (آیت) "۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرمایا ہے، یہ میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے۔ [1]

اس حدیث میں سورہ فاتحہ کا ذکر ہے اور اس کے شروع میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کا ذکر نہیں ہے' اس سے علماء احناف اور مالکیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورہ فاتحہ کا جز نہیں ہے۔

امام دارمی ؒ روایت کرتے ہیں:

عبدالملک بن عمیر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب سے ہر بیماری کی شفاء ہے۔ [2]

حافظ نور الدین الہیثمی ؒ بیان کرتے ہیں:

حضرت ابو زید ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مدینہ کے کسی راستہ میں جا رہا تھا' آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو تہجد کی نماز میں ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھ رہا تھا' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھڑے ہو کر اس سورت کو سنتے رہے حتی کہ اس نے وہ سورت ختم کر لی،

۱۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰۔۱۶۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

۲۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۰' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

آپ نے فرمایا: قرآن میں اس کی مثل (اور کوئی سورت) نہیں ہے۔[۱]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جس دن فاتحۃ الکتاب (سورہ فاتحہ) نازل ہوئی اس دن ابلیس بہت رویا تھا اور یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی تھی اس حدیث کو امام طبرانیؒ نے "معجم اوسط" میں روایت کیا ہے اور اسکی سند صحیح ہے۔[۲]

سورہ فاتحہ کے مضامین:

قرآن مجید کے حسب ذیل مضامین ہیں:

(۱) توحید: نزول قرآن کے وقت دنیا میں بالعموم بت پرستی کا دور دورہ تھا' اور کفار عرب کے دعوی دار ہونے کے باوجود اپنے زعم میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے بتوں کی عبادت کرتے تھے' اس لیے قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ صرف خالق اور رب ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کو واحد ماننا کافی نہیں ہے بلکہ استحقاق عبادت کے اعتبار سے بھی اس کو واحد ماننا ضروری ہے' یعنی اس کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔

(۲) نبوت: عام انسان کی عقل اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو جاننے کے لیے ناکافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حاصل کرنے سے عاجز ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہ نمائی کے لیے انبیاء (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا اور نبی چونکہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے' اس کو ماننا اللہ کو ماننا اور اس کا انکار کرنا

۱۔ امام طبرانی (رح) نے اس حدیث کو "معجم اوسط" میں روایت کیا ہے' اس کی سند میں ایک راوی حسن بن دینار ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ج ٦ ص ۳۱۰' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱٤۰۲ھ)

۲۔ (مجمع الزوائد ج ٦ ص ۳۱۱' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱٤۰۲ھ)

اللہ کا انکار کرنا ہوتا ہے‘اس لیے قرآن نے نبی کے ماننے کو ضروری قرار دیا ہے۔

(۳) عبادت: بدن‘ مال اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق صرف کرنا عبادت ہے‘ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ انسان خود اور اس کا مال اس کی ملکیت نہیں ہے‘ اللہ کی ملکیت ہے‘ اب وہ کسی طرح اپنی جان اور مال کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق صرف کرے، یہ قرآن نے تفصیل سے بتایا ہے۔

(٤) وعدہ کیا ہے اور بندہ کی نافرمانی کرنے اللہ تعالیٰ نے اس کو عذاب سے ڈرایا ہے‘ اس وعد اور وعید کو اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے۔

(٥) قصص اور امثال: گزشتہ امتوں کے صالحین کے واقعات اور نافرمانوں پر عذاب کی عبرت انگیز مثالیں۔

(٦) معاد: مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور مومنین کے لیے جزاء اور کفار کے لیے سزا کا بیان۔

(٧) دعا: تمام عبادات کا خلاصہ اور حاصل اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انسان کو ہدایت عطا فرمائے اور اس پر تاحیات برقرار رکھے اور آخرت میں عذاب سے نجات‘ جنت نعیم‘ اپنی خوشنودی‘ رضا اور دیدار عطا فرمائے، سورہ فاتحہ میں ان تمام مضامین کو اجمال‘ اختصار اور اشارات سے بیان کر دیا گیا ہے۔

(١) سورہ فاتحہ کے شروع میں فرمایا: (آیت) ”الحمد للہ رب العلمین “۔تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے“ یعنی حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے‘ کیونکہ‘ زمین‘ پہاڑ‘ سمندر‘ جمادات‘ نباتات‘ حیوانات‘ انسان اور جن یہ سب اپنے وجود میں کسی موجد کے اور اپنی بقا میں کسی رب

کے محتاج ہیں، اور یہ سب ممکنات ہیں، اس لیے ان کو پیدا کرنے والا اور ان کو باقی رکھنے والا ممکن نہیں ہوسکتا کیونکہ ممکن تو پھر انہی کی طرح اپنے وجود اور بقاء میں محتاج ہوگا، اس لیے ضروری ہے کہ ان کا موجد اور ان کا رب واجب بالذات ہو، اس کا ئنات رنگ و بو میں جو حسن اور کمال ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے، اور حمد، حسن اور کمال پر ہوتی ہے تو تمام محامد کا وہی مستحق ہے اور تمام تعریفیں اسی کے لائق ہیں، اس آیت میں جہاں یہ بتایا ہے کہ تعریف کا مستحق صاحب کمال نہیں ہے خالق کمال ہے، وہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمام کائنات کا خالق اور مربی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ قرآن کا وہ پہلا مضمون ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

(۲) سورہ فاتحہ کی چھٹی آیت میں ہے: (آیت) "۔صراط الذین انعمت علیھم "۔ان لوگوں راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا: اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ان کا بیان اس آیت میں ہے:

(آیت) "أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ "۔ (النساء۶۹) جن پر اللہ نے انعام کیا وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

نیز فرمایا:

(آیت) أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ ، (مریم: ۵۸) جن پر اللہ نے انعام کیا وہ نسل آدم سے انبیاء ہیں۔

قرآن مجید کا دوسرا اہم مضمون نبوت ہے اور اس کی طرف اشارہ (آیت) "صراط الذین انعمت علیھم "میں ہے۔

(۳) قرآن مجید کا تیسرا اہم مضمون عبادت ہے، اور اس کا ذکر (آیت) "ایاك نعبد " ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" میں ہے۔

(٤) وعداور وعید کی طرف اشارہ (آیت) "ملك یوم الدین" میں ہے۔
(٥) گزشتہ امتوں کے واقعات اور مثالیں' نیکوں پر انعام اور بدکاروں پر غضب اور عذاب' اس کی طرف اشارہ چھٹی اور ساتویں (آیت) "صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین" میں ہے۔
(٦) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور مومنین کے لیے جزاء اور کفار کے لیے سزا کی طرف اشارہ بھی (آیت) مالك یوم الدین" میں ہے۔
(٧) قرآن مجید کا بہت اہم مضمون اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے اور اس سورت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کس طرح دعا کی جائے' اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے، جس کا ذکر (آیت) "الحمدللہ رب العلمین الرحمن الرحیم" میں ہے پھر خضوع اور خشوع کا اظہار کیا جائے جس کا ذکر (آیت) "ایاک نعبدوایاک نستعین" میں ہے' پھر اپنے عجز اور احتیاج کو بیان کیا جائے جس کا بیان (آیت) "۔ایاک نعبدوایاک نستعین" میں ہے' پھر حرف مدعا زبان پر لایا جائے اور اس سے مانگا جائے ' نیز یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے کیا مانگا جائے اور کیا نہ مانگا جائے تو بتلایا اس سے صراط مستقیم پر برقرار رہنے کی ہدایت مانگو' وہ راستہ جو اللہ تعالیٰ کے انعام یافتگان کا راستہ ہے نہ ان کا راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا اور نہ گمراہوں کا' پھر جیسے ہی ہدایت کی دعا ختم ہوتی ہے تو اس کے جواب میں فورا ہدایت آجاتی ہے۔(آیت) "الم ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ" یعنی تم نے ہم سے ہدایت مانگی تھی تو یہ پوری کتاب تمہارے لیے ہدایت ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ سے دعا کرو گے تو اس دعا کی استجابت یقینی ہے۔

تعوذ

﴿ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ ۝ ﴾

”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود سے۔“

(شیطن): یہ شطن سے بنا ہے، اس کے لفظی معنی دوری کے ہیں، شیطان مردود ہر بھلائی سے دور ہے اس لیے اس کو شیطان کہتے ہیں، سرکش اور شریر کو بھی شیطان کہتے ہیں۔

(رجیم): دھتکارا ہوا، مردود، ملعون، یہ فعیل کے وزن پر معفول کے معنی میں ہے شیطان کو رجیم اس لیے کہتے کہ جب وہ چوری سے کان لگا کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتا ہے تو اس کو شہاب ثاقب سے رجم کیا (مارا) جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

(آیت) ”من السترق السمع فاتبعه شهاب مبين“۔ (حجر ۱۸) مگر جو کوئی چوری سے (فرشتوں کی بات) سنکر بھاگے تو دہکتا ہوا انگارا اس کے پیچھے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہ بندوں کو شیطان کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ [النحل:۹۸] ”پس جب تو قرآن پڑھے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کر۔“

اور فرمایا: وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ [الاعراف: ۲۰۰] ”اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تجھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بیشک وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اور فرمایا: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ [المؤمنون: ۹۷، ۹۸] "اور تو کہہ اے میرے رب! میں شیطانوں کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب! میں اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آ موجود ہوں۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شیطان مردود سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ شیطان، انسان کا ایسا رذیل دشمن ہے جو کسی بھی بھلائی اور احسان کو نہیں مانتا اور ہر وقت اس کے خلاف سازش میں لگا رہتا ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت کر کے خبر دی کہ جبرائیل امین سب سے پہلے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو وحی لے کر نازل ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے کہا اے محمد تعوذ پڑھیے، یعنی اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہیے پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہیے۔ [۱]

صاحب کشاف نے 2/343 میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم پڑھا تو آپ نے مجھے فرمایا اے ابن ام عبد تم اس طرح پڑھو اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ مجھے جبرائیل نے لوح محفوظ سے لکھ کر اسی طرح پڑھایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن مجید پڑھنے سے پہلے "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھتے تھے۔ [۲]

۱۔ تفسیر اسباب نزول محمد علی نیشاپوری ۴۶۵ھ
۲۔ (المصنف ج ۱ ص ۸۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامیؒ بیروتؒ ۱۳۹۰ھ)

حضرت سیدنا ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب رات کو قیام فرماتے تو نماز شروع کرتے ہوئے "اللہ اکبر" کہتے، پھر یہ پڑھتے: (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ تَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلاَ اِلٰهَ غَيْرُكَ) "میں پاکی بیان کرتا ہوں تیری اے اللہ! تیری ہی حمد وثنا کے ساتھ، تیرا نام بہت برکت والا ہے، تیری شان بہت بلند وبالا ہے اور تیرے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں۔" پھر آپ تین بار "لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ" پڑھتے، پھر یہ پڑھتے: (أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ)، پھر تین بار "اللہ اکبر" کہتے، پھر یہ پڑھتے: (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ) "میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں جو سننے والا، جاننے والا ہے شیطان مردود سے، یعنی اس کے وسوسے سے اور اس کی پھونک اور اس کے جادو سے۔"[1]

غصہ کے وقت اللہ کی پناہ طلب کرنا جیسا کہ سیدنا سلیمان بن صرد ؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمیوں نے آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے ان میں سے ایک تو اس قدر غصے میں تھا کہ غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بیشک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ اسے پڑھ لے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے اور وہ کلمہ یہ ہے: (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ)" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص سے کہا، کیا تم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نہیں سنا؟ اس

١۔[مسند أحمد: ٣/ ٥٠، ح: ١١٤٧٩۔ أبوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب من رأی الاستفتاح بسبحانک اللّٰھم وبحمدک: ٧٧٥۔ ترمذی، کتاب الصلوۃ، باب مایقول عند افتتاح الصلوۃ: ٢٤٢]

نے جواب دیا کہ میں مجنون نہیں ہوں۔ (۱)

بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت اللہ کی پناہ طلب کرنا جیسا کہ سیدنا انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیت الخلا میں داخل ہوتے تو فرماتے : (اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِكَ مِنَ الۡخُبُثِ وَالۡخَبَاۤئِثِ) ”اے اللہ! میں ناپاک جنوں اورناپاک جننیوں سے تیری پناہ چاہتاہوں۔“ (۲)

بیوی سے ہم بستری کے وقت شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ چاہنا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اگرتم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی سے جماع کے وقت یہ دعا پڑھ لے: (بِسۡمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبۡنَا الشَّیۡطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیۡطَانَ مَا رَزَقۡتَنَا) ” اللہ کے نام کے ساتھ، اے اللہ! ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھ اور ہمیں تو جو اولاد عطا فرمائے اسے بھی شیطان سے بچانا“ تو اگر اس ملاپ سے بچہ پیدا ہوگا تو شیطان اسے کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔“ (۳)

کسی وادی یا منزل پر پڑاؤ کے وقت اللہ کی پناہ میں آنا جیسا کہ سیدہ خولہ بنت حکیم ؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا: ”جو شخص کسی جگہ پڑاؤ کرے اور یہ دعا پڑھے: (اَعُوۡذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ) ”اللہ کے تمام کلمات کے ساتھ، ان سب چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جن کو اس نے پیدا کیا“ تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی،

۱۔[بخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٥ ۔ مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یملک نفسه عند الغضب ۔۔ الخ: ٢٦١٠]

۲۔[بخاری، کتاب الوضوء، باب ما یقول عند الخلاء: ١٤٢ ۔ مسلم، کتاب الحیض، باب ما یقول إذا أراد دخول الخلاء: ٣٧٥]

۳۔[بخاری، کتاب النکاح، باب ما یقول الرجل إذا أتی أهله: ٥١٦٥ ۔ مسلم، کتاب النکاح، باب ما یستحب أن یقوله عند الجماع: ١٤٣٤]

یہاں تک کہ وہ وہاں سے کوچ کر جائے۔“ (۱)

مسجد میں داخل ہوتے وقت اللہ کی پناہ میں آنا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوتے تو یہ فرماتے تھے: (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ) ”میں عظمت والے اللہ اور اس کے کریم چہرے کی اور اس کی قدیم سلطنت کی پناہ چاہتا ہوں، مردود شیطان سے۔“ نیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے: ”جو ایسا کہے تو شیطان کہتا ہے کہ تو مجھ سے آج پورا دن محفوظ رہے گا۔“ (۲)

مسجد سے نکلتے وقت اللہ کی پناہ طلب کرنا جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”تم میں سے جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سلام پڑھے اور یہ دعا پڑھے: (اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ) ”اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔“ اور جب مسجد سے نکلے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سلام پڑھے اور یہ کہے: (اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِيْ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ) ”اے اللہ! مجھے شیطان مردود کے شر سے محفوظ رکھ۔“ (۳)

نماز میں شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ چاہنا جیسا کہ سیدنا عثمان بن ابی العاص ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی، اے اللہ کے رسول! میرے اور میری نماز اور

۱۔[مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی التعوذ من سوء القضاء۔ الخ: ۲۷۰۸]

۲۔[أبوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب مایقول الرجل عند دخولہ المسجد: ٤٦٦]

۳۔[ابن ماجہ، کتاب المساجد، باب الدعاء عند دخول المسجد: ۷۷۳]

قراءت کے درمیان شیطان حائل ہو جاتا ہے، وہ مجھ پر قراءت کو خلط ملط کرتا ہے، تو آپ نے فرمایا: ”یہ شیطان ہے، جسے خنزب کہا جاتا ہے، جب تم اس کے حائل ہونے کو محسوس کرو تو اس (کے شر) سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو (یعنی ”أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ“ پڑھو) اور تین بار اپنی بائیں جانب تھتکارو۔“ عثمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ عزوجل نے اس شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔ [۱]

بچوں کے لیے اللہ کی پناہ کے خواہاں ہونا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حسن و حسینؓ کے لیے ان کلمات کے ذریعے پناہ طلب کیا کرتے تھے: (أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ) ”میں اللہ کے تمام کلمات کے ساتھ (تم دونوں کے لیے) ہر شیطان سے اور اس مخلوق سے جو بدی کا ارادہ کرے اور ہر نظر لگانے والی آنکھ سے پناہ مانگتا ہوں۔“ [۲]

بیماری کے وقت اللہ کی پناہ مانگنا جیسا کہ سیدنا عثمان بن ابی العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایک بیماری کی شکایت کی جو اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے پہلی دفعہ محسوس کی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اپنے ہاتھ کو اپنے جسم پر تکلیف والی جگہ رکھ کر تین مرتبہ ”بسم اللہ“ کہہ اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھ: (أَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَ قُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَ أُحَاذِرُ) ”میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور قدرت کی پناہ پکڑتا ہوں اس چیز کے شر سے جو میں پاتا ہوں اور

۱۔[مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلوة: ۲۲۰۳۔ مسند أحمد: ۴/ ۲۱۶، ح: ۱۷۹۱۸]

۲۔[بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، بابٌ: ۳۳۷۱]

جس سے ڈرتا ہوں۔“[۱]

برا خواب دیکھنے پر اللہ کی پناہ طلب کرنا جیسا کہ سیدنا ابو قتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، پس اگر تم میں سے کوئی شخص برا خواب دیکھ کر اس سے ڈر جائے تو وہ اپنی بائیں جانب تھتکارے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگے تو وہ اسے نقصان نہ پہنچائے گا۔“[۲]

عقائد میں شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنا جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”تم میں سے کسی ایک کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں اور فلاں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ فلاں چیز کس نے پیدا کی ہے؟ حتیٰ کہ یہ تک کہتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟ لہٰذا جب ایسی سوچ آئے تو بندہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے (یعنی ” أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ “ پڑھ لے) اور آئندہ ایسی سوچ سے باز رہے۔“[۳]

موت کے وقت شیطانی حملہ سے اللہ کی پناہ چاہنا جیسا کہ سیدنا ابو الیسرؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا کیا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ التَّرَدِّيْ ، وَالْهَدْمِ ، وَالْغَرَقِ ، وَالْحَرِيْقِ ، وَاَعُوْذُبِكَ اَنْ يَّتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ ، وَاَعُوْذُبِكَ أَنْ اَمُوْتَ فِيْ سَبِيْلِكَ مُدْبِرًا ، وَاَعُوْذُبِكَ اَنْ

۱۔[مسلم، کتاب السلام، باب استحباب وضع یدہ علی موضع الألم ۔۔ الخ: ۲۲۰۲]

۲۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده: ۳۲۹۲]

۳۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده: ۳۲۷۶۔ مسلم، کتاب ایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان وما یقوله من وجدها: ۱۳٤/۲۱٤]

اَمُوْتَ لَدِیْغًا) ”اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کسی چیز کے نیچے آنے سے، اونچی جگہ سے گرنے سے، ڈوبنے اور جلنے سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں کہ موت کے وقت شیطان مجھے خبطی بنائے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تیری راہ میں جہاد سے بھاگتا ہوا مروں اور اس بات سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ کسی زہریلے جانور کے ڈسنے سے مجھے موت آئے۔“ ⑴

صبح وشام کے وقت اللہ کی پناہ میں آنا جیسا کہ سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اگر تم شام کو یہ کلمات پڑھ لیتے: (أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ) ”میں اللہ کے مکمل کلمات کے ساتھ تمام چیزوں کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جو اس نے پیدا کی ہیں“ تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچتا۔“ ⑵

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس کا تخت سمندر میں ہے وہ روزانہ اپنے لشکر کی ٹکڑیاں بھیجتا رہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کریں جو جتنا زیادہ لوگوں میں فتنہ پھیلاتا ہے اتنا ہی زیادہ ابلیس کے نزدیک اس کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ ⑶

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء مالکیہ کا مذہب:

علامہ قرطبی مالکیؒ لکھتے ہیں:

امام مالکؒ فرض نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، اور تراویح میں پڑھنے کے قائل ہیں۔ ⑷

۱۔[نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب الاستعاذۃ من التردی والھدم:۵۵۳۳]

۲۔[مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی التعوذ من سوء القضاء ودرک الشقاء وغیرہ:۲۷۰۹]

۳۔(مسند احمد)

۴۔(الجامع الاحکام القرآن ج۱ ص۸۶ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

علامہ دردیر مالکی لکھتے ہیں:

نفل نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا (بلا کراہت) جائز ہے اور فرض نماز میں مکروہ ہے۔ ①

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا مذہب:

علامہ ابن قدامہؒ حنبلی لکھتے ہیں۔

نماز میں قرات سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے حسن ابن سیرینؒ عطاؒ، ثوریؒ، اوزاعیؒ شافعیؒ اور اصحاب رائے کا یہی نظریہ ہے، امام مالکؒ نے کہا: نماز میں قرات سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نماز کو (آیت) الحمدللہ رب العلمین " سے شروع کرتے تھے۔ ②

حضرت انسؓ کی حدیث کا محمل یہ ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھتے تھے، سراً پڑھتے تھے اور جہراً قرات (آیت) "الحمدللہ رب العلمین " سے شروع کرتے تھے تاکہ اس روایت کا ان احادیث سے تعارض نہ ہو جس میں قرات قرآن سے پہلے" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھنے کی تصریح ہے۔

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء شافعیہ کا مذہب:

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

۱۔(الشرح الکبیر علی ھامش الدسوقی ج۱ ص۲۵۱، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

۲۔(صحیح بخاری و صحیح مسلم)(المغنی ج۱ ص۳۴۶، مطبوعہ دارالفکر، بیروت ۵۔۱۴ھ)

دعاء استفتاح (سبحانک اللھم) کے بعد" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھنا مستحب ہے' ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ" اعوذ باللہ السمیع من الشیطن الرجیم" پڑھنے اور ہر اس لفظ کا پڑھنا جائز ہے جس سے یہ معنی حاصل ہو' اور زیادہ یہ ہے کہ نماز سری ہو یا جہری اس کو سراً پڑھے' ایک قول یہ ہے کہ جہری نماز میں جہراً پڑھے' ایک قول یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اختیار ہے' ایک قول یہ ہے کہ مستحب یہ ہے کہ قطعاً آہستہ پڑھے' نیز مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں اعوذ باللہ پڑھے اور پہلے رکعت میں پڑھنا زیادہ موکد ہے' امام شافعی نے اس کی تصریح کی ہے۔ (۱)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء احناف کا مذہب:

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

جب نماز میں قرات شروع کرے تو اعوذ باللہ پڑھے' اگر سورہ فاتحہ مکمل پڑھنے کے بعد اس کو اعوذ باللہ پڑھنا یاد آیا تو اب اس کو چھوڑ دے اور اگر سورہ فاتحہ کے دوران اس کو یاد آیا تو اعوذ باللہ پڑھے اور از سر نو سورہ فاتحہ پڑھے اور جب شاگرد استاد کو قرآن مجید سنائے تو اس وقت اعوذ باللہ نہ پڑھے' یعنی اس وقت پڑھنا سنت نہیں ہے' جب مسبوق اپنی بقیہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو تو قرات سے پہلے اعوذ باللہ پڑھے' امام عید کی نماز میں تکبیرات عید کے بعد اعوذ باللہ پڑھے کیونکہ تکبیرات عید کے بعد قرات شروع ہوتی ہے۔ (۲)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

۱۔ (روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۳۴۶' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

۲۔ (درمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۱ ص ۳۲۹۔۳۲۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اگر سورہ فاتحہ کے دوران اس کو اعوذ باللہ پڑھنا یاد آیا تو اب سورہ فاتحہ کو دوبارہ اعوذ باللہ کے ساتھ پڑھنا درست نہیں ہے' کیونکہ اس سے لازم آئے گا کہ سنت کی وجہ سے فرض (قرات) کو چھوڑ دیا جائے' نیز اس سے واجب کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا کیونکہ سورہ فاتحہ یا اس کے اکثر حصہ کو دوبارہ پڑھنا سجدہ سہو کا موجب ہے' اور فقیہ ابو جعفر نے "نوادر" میں ذکر کیا ہے کہ نماز میں اللہ اکبر پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ اور "بسم اللہ" پڑھی اور ثناء پڑھنا بھول گیا تو اب ثنا نہ پڑھے' اسی طرح اگر اس نے اللہ اکبر کے بعد قرات شروع کر دی اور ثناء' اعوذ باللہ اور "بسم اللہ" پڑھنا بھول گیا تو اب ان کو دوبارہ نہ پڑھے کیونکہ ان کا محل فوت ہو گیا اور اس پر سجدہ سہو نہیں ہے، اس کو زاہدی نے ذکر کیا ہے (خلاصہ یہ ہے کہ علامہ حصکفی کا یہ کہنا درست نہیں کہ اگر اعوذ پڑھنا بھول گیا اور سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کر دی تو اعوذ پڑھ کر از سر نو سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کرے)

"ذخیرہ" میں یہ مذکورہ ہے کہ اگر کوئی شخص "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھے اور اس سے اس کا مقصد قرآن مجید کی تلاوت ہو تو اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھے اور اگر حصول برکت کے لیے بسم اللہ پڑھتا ہے تو پھر اس سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی شخص شکر ادا کرنے کی نیت سے (آیت) "الحمد للہ رب العلمین" پڑھتا ہے تو پھر اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے' اور اگر قرآن مجید کا قصد کرتا ہے تو پھر اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا ضروری ہے، یہ قاعدہ پڑھنے کے اعتبار سے ہے افعال کے لیے یہ قاعدہ نہیں ہے' اس لیے بیت الخلاء جانے سے پہلے "اعوذ باللہ من الخبث والخبائث" پڑھنا اس قاعدے کے منافی نہیں ہے۔[۱]

۱۔ (ردالمختار ج۱ ص ۳۲۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں:

نماز میں ثناء کے بعد اعوذ باللہ پڑھنا جمہور علماء کے نزدیک سنت ہے۔ ثوری اور عطا نے یہ کہا ہے کہ یہ واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید پڑھنے سے پہلے" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھنے کا حکم دیا ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے۔ اعوذ باللہ پڑھنے کے محل میں اختلاف ہے' امام ابو یوسف کے نزدیک اس کا محل ثناء کے بعد ہے اور یہ قرات کے تابع نہیں ہے' لہٰذا جو شخص بھی ثناء پڑھے گا وہ اعوذ باللہ پڑھے گا' کیونکہ اعوذ باللہ پڑھنا دفع وسوسہ کے سب محتاج ہیں' لہٰذا امام اور منفرد جس طرح ثناء کے بعد اعوذ باللہ پڑھیں اس طرح مقتدی بھی پڑھے اور عید کی نماز میں بھی امام اس کو ثناء کے بعد پڑھے نہ کہ تکبیرات کے بعد' اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اعوذ باللہ پڑھنا قرات کے تابع ہے، لہٰذا جو شخص تلاوت قرآن کرے گا وہی اعوذ باللہ پڑھے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کرو' اور مقتدی پر چونکہ قرات نہیں اس لیے وہ اعوذ باللہ نہیں پڑھے گا اور امام اور مفرد چونکہ قرات کرتے ہیں اس لیے وہ اعوذ باللہ پڑھیں گے۔ اسی طرح عید کی نماز میں چونکہ قرات تکبیرات کے بعد شروع ہوتی ہے اس لیے تکبیرات کے بعد اعوذ باللہ پڑھی جائے گی۔ فتاوی قاضی خاں' ہدایہ' اس کی شروع' کافی' اختیار اور اکثر کتابوں میں امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنا قرات کے تابع ہے اور ہمارا بھی یہی مختار ہے۔ (۱)

نیز علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں:

۱۔ (غنیۃ المستملی ص ۳۰۴' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۱۲ھ)

دوسری رکعت میں ثناء پڑھے گا نہ اعوذ باللہ پڑھے گا کیونکہ ان کا محل اول صلوۃ اور اول قرات ہے' اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دوسری رکعت میں قرات سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھنے سے امام ابویوسف کی تائید ہوتی ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنا ثنا کے تابع ہے اور جب دوسری رکعت میں ثناء نہیں پڑھی جائے گی تو اعوذ باللہ بھی نہیں پڑھی جائے گی' اگر یہ قرات کے تابع ہوتی جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے تو دوسری رکعت میں قرات سے پہلے اعوذ باللہ کو بھی پڑھا جاتا' سو اس طریقہ میں امام ابو یوسف کے قول پر عمل ہے حالانکہ تمہارے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول مختار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب نمازی نے ایک مرتبہ قرات سے پہلے اعوذ باللہ کو پڑھ لیا اور قرات کے درمیان میں کسی اجنبی فعل کو داخل نہیں کیا تو اس کے لیے دوبارہ اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں ہے اور افعال نماز' قرات کے حق میں اجنبی نہیں ہیں کیونکہ نماز کے اعتبار سے تمام افعال واحد ہیں' لہٰذا اس کی قرات کے دوران کوئی اجنبی فعل خلل انداز نہیں ہوا' اس لیے اب اعوذ باللہ کا تکرار مسنون نہیں ہے۔ (۱)

تسمیہ

﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

تفسیر: بسم اللہ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے، ایک حرف بائ، دوسرے اسم، تیسرے اللہ، حرف بائ، عربی زبان میں بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوتی ہے، جن میں سے تین معنی مناسب مقام

ا۔(غنیۃ المستملی ص ۳۲٤' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ١٤١٢ھ)

ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لیے جا سکتے ہیں:

اول، مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا، دوسرے، استعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا، تیسرے تبرک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔ لفظ اسم میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لیے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نام سے کیا جاتا ہے، لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم کہا ہے۔

بسم اللہ: میں الف کتابت سے حذف کر دیا گیا۔ اور اقرا باسم ربک (العلق: 1) میں ذکر کر دیا کیونکہ اس میں بھی دونوں جمع ہو سکتے ہیں مگر بسم اللہ میں تو کثرت استعمال کی وجہ سے تلفظ سے ساقط کر دیا گیا (اور اقرا باسم میں کثرت استعمال نہیں اس لیے کتابۃ حذف نہیں کیا گیا) بسم اللہ کی با کو حذف کے بدلے میں لمبا لکھا جائے گا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ ب کو لمبا لکھو، س کو ظاہر کرو اور م کو گول لکھا کرو۔ (اس میں کتاب اللہ کی تعظیم ہے)۔[۱]

(رحمن): بہت رحم کرنے والا، مبالغہ کا صیغہ اور "رحمۃ" سے مشتق ہے، جس کے معنی دل کی نرمی کے ہیں، دنیا و آخرت دونوں میں رحم کرنے والے کو رحمن کہتے ہیں، اس کی رحمت تمام مخلوق پر ازل سے ابد تک یکساں حاوی ہے، مثلاً بارش، ہوا، اور دوسری مہربانیاں، نیک و بد سب پر یکساں ہوتی ہیں، یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔

۱۔ تفسیر مدارک التنزیل عبد اللہ بن احمد النسفی ۷۱۰ھ

(رحیم): بڑا مہربان، یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے اور رحیم سے اللہ تعالیٰ کی وہ خاص رحمت مراد ہے جو آخرت میں صرف مومنوں کے لیے ہو رحیم سے اللہ تعالیٰ کی وہ خاص رحمت مراد ہے جو آخرت میں صرف مومنوں کے لیے ہوگی، جیسا کہ ارشاد ہے۔

(آیت)" وکان بالمؤمنین رحیما "۔(احزاب ۴۳)

اور اللہ ایمان والوں پر بہت مہربان ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے فضائل وفوائد اور حکمتیں:

(۱) علامہ ابن جریر طبریؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنی کو مقدم کر کے ہمیں یہ ادب سکھایا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ اپنے تمام اقوال' افعال اور مہمات کو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی سے شروع کیا کریں[۱]

(۲) علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ کھانے' پینے' ذبح کرنے، جماع کرنے' وضو کرنے' کشتی میں سوار ہونے' غرض ہر (صحیح) کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت)" فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ "۔(الانعام:۱۱۸) تو اس (ذبیحہ) سے کھاؤ' جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

وقال ارکبوا فیھا بسم اللہ مجریھا ومرسھا "۔(ھود:۴۱) اور نوح نے کہا: اس کشتی میں سوار ہو جاؤ' اس کا چلنا اور رکنا اللہ کے نام سے ہے۔

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دروازہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو' چراغ گل کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو' برتن ڈھانکتے ہوئے بسم اللہ پڑھو' اور مشک کا منہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو اور

۱۔(جامع البیان ج ۱ ص ۳۸' مطبوعہ مطبعہ امیریہ کبری' بولاق' مصر' ۱۳۲۳ ھ)

فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص عمل تزویج (بیوی سے صحبت) کے وقت کہے: بسم اللہ اے اللہ! ہم کو شیطان سے محفوظ رکھ اور جو (اولاد) ہم کو عطا کرے اس کو بھی شیطان سے محفوظ رکھ تو اگر اس عمل میں ان کے لیے اولاد مقدر کی جائے گی تو اس کو شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا' اور آپ نے عمر بن ابی سلمہ سے فرمایا: اے بیٹے! بسم اللہ پڑھو' اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ' اور آپ نے فرمایا: شیطان ہر کھانے کو حلال کر لیتا ہے۔ ماسوا اس کھانے کے جس پر بسم اللہ پڑھی گئی ہو' حضرت عثمان بن ابی العاص ؓ نے آپ سے شکایت کی کہ جب سے وہ اسلام لائے ہیں ان کے جسم میں درد رہتا ہے' آپ نے فرمایا: تین بار بسم اللہ پڑھو' اور سات بار یہ پڑھو" اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر " یہ تمام احادیث صحیح ہیں' اور امام ابن ماجہؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب بنو آدم بیت الخلاء میں داخل ہوں تو ان کی شرم گاہوں اور شیاطین کے درمیان بسم اللہ حجاب ہے' اور امام دار قطنی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وضو کرتے تو پہلے بسم اللہ پڑھتے' پھر اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے۔ [۱]

(۳) حضرت ابو الملیح ؓ ایک صحابی سے بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں گدھے پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے سوار تھا، گدھا ذرا پھسلا تو میں نے کہا، شیطان کا برا ہو، تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: "یہ نہ کہو کہ شیطان کا برا ہو، کیونکہ اس سے شیطان پھول جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اپنی قوت کے ساتھ اسے گرایا ہے، سو اگر تم "بسم اللہ" کہو تو اس سے شیطان اپنے آپ کو نہایت

۱۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۱ ص ۹۸۔۹۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

چھوٹا اور حقیر سمجھتا ہے، یہاں تک کہ مکھی سے بھی زیادہ چھوٹا اور زیادہ حقیر۔“[۱]

(۴) خط کتابت کا آغاز ”بسم اللہ“ سے کرنا چاہیے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہرقل کے نام ایک خط لکھا تھا، جب بادشاہ نے اس خط کو منگوایا تو اس کے شروع میں یہ لکھا تھا: (بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ)۔[۲]

(۵) سیدنا سلیمان (علیہ السلام) نے جو خط ملکہ سبا کو لکھا تھا اس کا آغاز یوں ہوتا ہے: اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ [النمل: ۳۰] ”بیشک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بیشک وہ اللہ کے نام سے ہے، جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔“

سیدنا مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مروان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب حدیبیہ کے مقام پر صلح نامہ لکھوانے کا ارادہ کیا تو آپ نے کاتب کو بلوایا اور اس سے فرمایا: (اُكۡتُبۡ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ) ”بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھو۔“[۳]

وضو سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھنا جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (تَوَضَّأُوۡا بِسۡمِ اللّٰهِ) ”اللہ کے نام کے ساتھ وضو کرو۔“[۴]

(۶) بیوی سے مباشرت کرنے سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھنا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے

۱۔[مسند أحمد: ۵/ ۵۹، ح: ۲۰۶۱۶۔ السنن الکبری للنسائی: ۶/ ۱۴۲، ح: ۱۰۳۸۸]

۲۔[بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔۔ الخ: ۷۔ مسلم، کتاب الجهاد، باب کتب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔۔ الخ: ۱۷۷۳]

۳۔[بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد۔۔ الخ: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔ مسلم، کتاب الجهاد، باب صلح حدیبیة: ۱۷۸۳/ ۹۲]

۴۔[نسائی، کتاب الطهارة، باب التسمیة عند الوضوء: ۷۸]

ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس آئے تو یہ کہے: (بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا) "اللہ کے نام کے ساتھ، اے اللہ! ہمیں شیطان سے محفوظ رکھ اور جو (اولاد) تو ہمیں دے اسے بھی شیطان سے محفوظ رکھ" تو اب اگر اس کے مقدر میں اولاد ہے تو شیطان اس کو کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"[۱]

(۷) کسی بیماری سے شفایابی کے لیے جو دعا پڑھ کر مریض کو دم کیا جاتا ہے، وہ بھی "بسم اللہ" سے شروع ہوتی ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں، جبرائیل (علیہ السلام) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور پوچھا: "اے محمد! کیا آپ بیمار ہیں۔" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہاں!" تو جبرائیل (علیہ السلام) نے یہ دعا پڑھی: (بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ) "اللہ کے نام کے ساتھ، میں تمہارے لیے ہر اس چیز سے جو تمہیں تکلیف پہنچاتی ہے اور ہر نفس کی برائی سے یا حاسد کی نظر بد کی برائی سے شفا طلب کرتا ہوں۔ اللہ تمہیں شفا عطا فرمائے، میں اللہ کے نام کے ساتھ تمہارے لیے شفا طلب کرتا ہوں۔"[۲]

(۸) جس جگہ درد ہو وہاں ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ "بسم اللہ" پڑھنا جیسا کہ سیدنا عثمان بن ابی العاصؓ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے جسم میں کسی جگہ درد ہونے کی شکایت کی، جو قبول اسلام کے بعد پہلی دفعہ ہوئی تھی، تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اپنا ہاتھ درد کے مقام پر رکھو، پھر تین مرتبہ (بِسْمِ اللّٰهِ) اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھو: (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ

۱۔ [بخاری، کتاب النکاح، باب ما یقول الرجل إذا أتی أھلہ: ٥١٦٥۔ مسلم، کتاب النکاح، باب ما یستحب أن یقولہ عند الجماع: ١٤٣٤]

۲۔ [مسلم، کتاب السلام، باب الطب والمرض والرقی: ٢١٨٦]

وَاُحَاذِرُ) ”میں اللہ کی اور اس کی قدرت کی پناہ طلب کرتا ہوں اس بیماری کی برائی سے جو اس وقت مجھے لاحق ہے اور اس سے بھی جس کے آئندہ ہونے کا اندیشہ ہے۔“ ①

(۹) بیمار کی شفایابی کے لیے انگشت شہادت زمین پر رکھیے، پھر اسے اٹھا کر یہ دعا پڑھیے جیسا کہ سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ بیشک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (مریض کی شفا کے لیے) یہ دعا پڑھتے تھے: (بِسْمِ اللهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا وَرِيقَةُ بَعْضِنَا، يُشْفَى سَقِيمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا) ”اللہ کے نام کے ساتھ، ہماری زمین کی مٹی اور ہم میں سے بعض کے لعاب دہن سے ہمارے رب کے حکم سے ہمارا مریض شفایاب ہو جائے۔“ ②

(۱۰) کھانا کھانے سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھنا چاہیے جیسا کہ سیدنا عمر بن ابی سلمہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں جب بچہ تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پرورش میں تھا اور (کھانا کھاتے وقت) میرا ہاتھ برتن میں چاروں طرف گھوما کرتا تھا، تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (يَا غُلَامُ ! سَمِّ اللهَ، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ) ”اے لڑکے! بسم اللہ پڑھ کر اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔“ ③

اگر کھانے سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھنا بھول جائے تو یاد آنے پر یہ دعا پڑھیے جیسا کہ سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو بسم اللہ کہے،

۱۔[مسلم، کتاب السلام، باب استحباب وضع یدہ علی موضع الألم مع الدعاء:۲۲۰۲]

۲۔[بخاری، کتاب الطب، باب رقیۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم):۵۷۴۶]

۳۔[بخاری، کتاب الأطعمۃ، باب التسمیۃ علی الطعام والأکل بالیمین:۵۳۷۶۔ مسلم، کتاب الأشربۃ، باب آداب الطعام والشراب وأحکامہما: ۲۰۲۲]

اگر شروع میں "بسم اللہ" بھول جائے تو یہ دعا پڑھے: (بِسۡمِ اللّٰهِ فِیۡ اَوَّلِهٖ وَاٰخِرِهٖ) "اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ (کھاتا ہوں) اس کے شروع اور اس کے آخر میں۔" [1]

(١١) جانور ذبح کرتے وقت کی دعا، سیدنا انس ؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو چتکبرے، سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دی اور انھیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور آپ نے یہ دعا پڑھی: (بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکۡبَرُ) "اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ سب سے بڑا ہے۔" [2]

(١٢) شکار کے لیے شکاری جانور یا تیر چھوڑتے وقت "بسم اللہ" کہنا جیسا کہ سیدنا عدی بن حاتم ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب تم (شکار کے لیے) اپنا کتا چھوڑو تو (بِسۡمِ اللّٰهِ) کہو اور اگر تم اپنا تیر پھینکو تو (بِسۡمِ اللّٰهِ) کہو۔" [3]

(١٣) جس ذبیحہ کے متعلق علم نہ ہو کہ اس پر "بسم اللہ" پڑھی گئی ہے یا نہیں تو خود "بسم اللہ" پڑھ لیجیے جیسا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا کہ بعض لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ انھوں نے اس پر (بِسۡمِ اللّٰهِ) پڑھی ہے یا نہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم اس پر بسم اللہ پڑھ لو اور کھالو۔" عائشہ صدیقہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ یہ لوگ ابھی اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ [4]

(١٤) گھر میں داخل ہوتے وقت "بسم اللہ" پڑھنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے سیدنا جابر بن عبداللہ ؓ

---

[1] ۔[ترمذی، کتاب الأطعمة، باب ما جاء فی التسمیة علی الطعام: ١٨٥٨]

[2] ۔[بخاری، کتاب الأضاحی، باب التکبیر عند الذبح: ٥٥٦٥۔ مسلم، کتاب الأضاحی، باب استحباب استحسان الضحیة ۔۔ الخ: ١٩٦٦]

[3] ۔[مسلم، کتاب الصید، باب الصید بالکلاب المعلمة والرمی: ١٩٢٩/٦۔ بخاری، کتاب الذبائح، باب ما جاء فی التصید: ٥٤٨٧]

[4] ۔[بخاری، کتاب الذبائح، باب ذبیحة الأعراب ونحوهم: ٥٥٠٧]

بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں: ”جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اور کھانا کھاتے وقت اللہ کا ذکر کرے تو شیطان (اپنے ساتھیوں سے) کہتا ہے، اب تمہارے لیے نہ ٹھکانا ہے نہ کھانا اور اگر وہ شخص داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہ لے تو شیطان (اپنے ساتھیوں سے) کہتا ہے، اب تمہیں رہنے کے لیے ٹھکانا مل گیا۔“ [۱]

(۱۵) سونے سے قبل ”بسم اللہ“ پڑھ کر انجام دیے جانے والے چند اعمال بیان کرتے ہوئے سیدنا جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب تم سونے لگو تو دروازوں کو اللہ کا نام لے کر بند کر دو، کیونکہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھولتا، اللہ کا نام لے کر مشکیزوں کے منہ باندھ دو، اللہ کا نام لے کر اپنے برتنوں کو ڈھانک دو، خواہ کسی چیز کو چوڑائی میں رکھ کر ہی ڈھک سکو اور (اللہ کا نام لے کر) اپنے دیے بجھا دو۔“ [۲]

(۱۶) لشکر کو روانہ کرتے وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نصیحت، سیدنا بریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی لشکر کو نصیحت فرماتے تو کہتے: (اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰہِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) ”اللہ کا نام لے کر اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔“ [۳]

(۱۷) بستر پر لیٹتے وقت، سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بستر پر آئے تو وہ اپنے تہ بند کے ایک کونے (یا کسی اور کپڑے)

۱۔ [مسلم، کتاب الأشربۃ، باب آداب الطعام والشراب وأحکامھما: ۲۰۱۸]

۲۔ [بخاری، کتاب الأشربۃ، باب تغطیۃ الإناء: ۵۶۲۳]

۳۔ [مسلم، کتاب الجھاد، باب تأمیر الإمام۔۔۔ الخ: ۱۷۳۱/۳]

سے اپنے بستر کو اللہ کا نام لے کر (یعنی ”بِسۡمِ اللّٰہِ“ کہہ کر) تین دفعہ جھاڑے۔“[۱]

(۱۸) سواری پر سوار ہوتے وقت ”بسم اللہ“ پڑھنا جیسا کہ علی بن ربیعہؒ کہتے ہیں، میرے سامنے حضرت سیدنا علیؓ کے لیے سواری لائی گئی، جب انھوں نے رکاب میں پیر رکھا تو ”بسم اللہ“ کہا، پھر جب اس کی پیٹھ پر سیدھے بیٹھ گئے تو کہا ”الحمدللہ“ پھر کہا (سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ ۔ وَاِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ) ”اللہ تمام برائیوں سے پاک ہے، جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کر دیا۔ حالانکہ ہم اس کو قابو میں نہ لا سکتے تھے اور بیشک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ پھر سیدنا علیؓ نے کہا، میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا وہ بھی ایسا ہی کرتے تھے جیسا میں نے کیا۔[۲]

(۱۹) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، حضور صَلَّی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ”جس اہم کام کی ابتداء ”بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ“ سے نہ کی گئی تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے۔[۳]

(۲۰) ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جہنم کی انیس داروغوں سے جو بچنا چاہے وہ ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھے، اس کے بھی انیس حروف ہیں، ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی کی ہے، جس میں ہے میں نے تیس سے اوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے، یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس وقت فرمایا تھا، جب ایک شخص نے: ربنا لك الحمد، حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیه، پڑھا تھا اس میں بھی تیس سے

۱۔[مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب الدعاء عند النوم: ۲۷۱٤ ۔ بخاری، کتاب التوحید، باب السؤال بأسماء اللہ تعالیٰ والاستعاذة بها: ۷۳۹۳]

۲۔أبوداؤد، کتاب الجهاد، باب مایقول الرجل إذا رکب: ۲٦۰۲ ۔ ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء مایقول إذا رکب دابة: ۳٤٤٦]

۳۔(کنز العمال، کتاب الاذکار، الباب السابع فی تلاوة القران وفضائله، الفصل الثانی ۔۔ الخ، ۱/ ۲۷۷، الجزء الاول، الحدیث: ۲٤۸۸)

اوپر حروف ہیں۔ اتنے ہی فرشتے اترے، اسی طرح "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" بھی انیس حروف ہیں، اور وہاں فرشتوں کی تعداد بھی انیس ہیں۔

(۲۱) علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں: سعید بن ابی سکینہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھتے دیکھا تو فرمایا: اس کو خوبصورت لکھو' کیونکہ ایک شخص نے بسم اللہ کو خوبصورت لکھا تو اس کو بخش دیا گیا۔

(۲۲) قیصر روم نے حضرت عمرؓ کی طرف لکھا کہ اس کے سر میں درد رہتا ہے جس سے افاقہ نہیں ہوتا' میرے لیے کوئی دوا بھیج دیجیے حضرت عمرؓ نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیجی' وہ اس ٹوپی کو پہن لیتا تو آرام آجاتا اور اس ٹوپی کو اتار دیتا تو پھر سر میں درد شروع ہو جاتا۔ وہ حیران ہوا' اور ایک دن اس نے ٹوپی کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک کاغذ تھا جس میں لکھا ہوا تھا "بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔

(۲۳) بعض کفار نے حضرت خالد بن ولیدؓ سے کہا: آپ ہمیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں' آپ ہمیں اسلام کی صداقت پر کوئی نشان دکھایئے تاکہ ہم بھی اسلام لے آئیں' حضرت خالدؓ نے زہر منگایا اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر کھا لیا اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے صحیح سالم کھڑے رہے' مجوس نے کہا: واقعی یہ دین حق ہے۔

(۲۴) حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ایک قبر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ عذاب کے فرشتے ایک مردہ کو عذاب دے رہے ہیں' جب اپنے کام سے واپس لوٹے تو اس قبر میں رحمت کے فرشتوں کو دیکھا جن کے پاس نور کے طباق تھے' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس سے تعجب ہوا' انہوں نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ اے عیسیٰ! یہ شخص گناہ گار تھا اور جب یہ

مرا تو عذاب میں مبتلا ہو گیا' مرتے وقت اس کی بیوی حاملہ تھی' اس کے بچہ ہوا' اس نے اس کو پالا حتی کہ وہ بڑا ہو گیا' اس کو مکتب میں داخل کیا' وہاں اس کو معلم نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" (ان کی زبان میں) پڑھائی تو مجھے حیا آئی کہ جو بچہ زمین کے اوپر میرا نام لے رہا ہے' اس کے باپ کو میں زمین کے نیچے عذاب میں مبتلا رکھوں!

(۲۵) سورہ توبہ میں قتال ذکر ہے' لہٰذا اس سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھی گئی' اور ذبح سے پہلے "بسم اللہ' اللہ اکبر" کہا جاتا ہے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نہیں کہا جاتا کیونکہ ذبح کے وقت رحمت کا ذکر مناسب نہیں ہے' تو جو شخص ہر روز سترہ مرتبہ فرض نمازوں میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھے گا وہ کب عذاب میں مبتلا ہوگا۔ [1]

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے احکام شرعیہ اور مسائل:

علامہ سید احمد طحطاوی رحمہ اللہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے احکام شرعیہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

(۱) ذبح کرتے وقت شکار کی طرف تیر پھینکتے وقت اور شکاری کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ "البحر الرائق" میں لکھا ہے کہ بسم اللہ کہنا ضروری نہیں ہے صرف اللہ کا نام لینا شرط ہے' اور بعض کتابوں میں ہے: "الرحمن الرحیم" نہ کہے (صرف بسم اللہ کہے) کیونکہ ذبح کے وقت رحمت کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

(۲) "قنیہ" میں لکھا ہے کہ ہر رکعت میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا واجب ہے' اور اس کے ترک سے سجدہ سہو کرنا لازم ہے' لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔

۱۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۹۔۸۷' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

(۳) وضو کی ابتداء میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا سنت ہے' استنجاء سے پہلے اور بعد میں' لیکن حالت استنجاء اور محل نجاست میں نہ پڑھے۔ اگر وضو کے شروع میں "بسم اللہ" پڑھنا بھول گیا تو دوران وضو جب بھی یاد آئے بسم اللہ پڑھ لے' وضو کے اول میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا سنت ہے اور درمیان میں پڑھنا مستحب ہے۔

(۴) کھانے کی ابتداء میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا سنت ہے' اگر بھول گیا تو درمیان میں پڑھنا بھی سنت ہے اور درمیان میں یوں پڑھے: بسم اللہ اولہ واخرہ"۔

(۵) سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے خواہ نماز سری ہو یا جہری۔

(٦) کسی کتاب کے شروع میں اور ہر نیک اور اہم کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے "اعوذ باللہ" کے بعد "بسم اللہ" پڑھنا مستحب ہے۔

(۸) مشتبہ چیز کھاتے وقت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا مکروہ ہے' جمہور کے نزدیک تمبا کو نوشی کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے۔

(۹) سورہ انفال کے بعد سورہ توبہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے' اگر توبہ سے ہی پڑھنا شروع کیا ہے تو پھر بعض مشائخ کے نزدیک بسم اللہ مکروہ نہیں ہے۔

(۱۰) اٹھنے' بیٹھنے' چلنے پھرنے اور دیگر کاموں کے وقت بسم اللہ پڑھنا مباح ہے۔

(۱۱) " خلاصہ الفتاوی" میں مذکور ہے: اگر کسی شخص نے شراب پیتے وقت یا حرام کھاتے وقت یا زنا کرتے وقت بسم اللہ پڑھی تو وہ کافر ہو جائے گا' یہاں حرام سے مراد حرام قطعی ہے' کیونکہ کسی کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ سے استعانت اور برکت حاصل کرنے کے لیے بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ

سے مدد اسی کام میں حاصل کی جائے گی جس کام کو اس نے جائز کیا ہو اور اس پر وہ راضی ہو' اس لیے کسی حرام کام پر بسم اللہ پڑھنا اس کو حلال قرار دینے کے مترادف ہے اور حرام کو حلال قرار دینا کفر ہے۔

(۱۲) جنبی اور حائضہ کے لیے بطور قرآن "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا حرام ہے' البتہ بطور ذکر اور برکت حاصل کرنے کے لیے پڑھنا جائز ہے۔ [۱]

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے متعلق فقہی مباحث۔

ایک بحث یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے شروع میں جو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھی ہے وہ قرآن کریم کا جز ہے یا نہیں۔ دوسری بحث یہ ہے کہ آیا وہ سورہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں' تیسری بحث یہ ہے کہ سورتوں کے اوائل میں جو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھی ہے وہ ان سورتوں کا جز ہے یا نہیں، چوتھی بحث یہ ہے کہ نماز میں بسم اللہ پڑھی جائے یا نہیں' چھٹی بحث یہ ہے کہ بسم اللہ کو جہراً پڑھا جائے یا آہستہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے آیت قرآن ہونے کی تحقیق:

علامہ ابوبکر رازی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ نمل کی یہ آیت "۔ اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ "(النمل: ۳۰) قرآن کریم جز ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ (آیت) "اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ" ہے۔ مسعودی نے حارث کلبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہلے مکاتیب کی

۱۔ (حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۔۵' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

ابتداء میں باسمک اللہم لکھتے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: "بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا"۔ (ھود:٤١) تو آپ بسم اللہ لکھنے لگے پھر یہ آیت نازل ہوئی: قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ"۔ (الاسراء۔١١٠) تو آپ "بسم اللہ الرحمن" لکھنے لگے۔ "سنن ابوداؤد میں روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو اس وقت تک نہیں لکھا جب تک کہ سورہ نمل نازل ہوئی، اور جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صلح نامہ حدیبیہ لکھوایا تو آپ نے حضرت علی (رض) سے فرمایا: لکھو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تو سہیل نے کہا: "باسمک اللہم" لکھو کیونکہ ہمارے نزدیک رحمن معروف نہیں ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پہلے قرآن مجید میں نہیں تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سورہ نمل میں نازل کیا۔ [١]

ہر چند کہ سورہ نمل مکی سورت ہے لیکن اس سے پہلے متعدد سورتیں نازل ہو چکی تھیں، اگر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہر سورت کے اوائل کا جز ہوتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابتدا ہی سے "باسمک اللہم" کے بجائے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھتے، لہٰذا "سنن ابوداؤد" کی مذکور الصدر حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سورہ نمل نازل ہونے سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" قرآن مجید میں نہیں تھی اور نہ ہی اوائل سورہ قرآن کا جز تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے سورہ فاتحہ کے جز نہ ہونے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ:

١۔ (صحیح بخاری ج ١ ص ٣٧٩، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ١٣٨١ھ)

علامہ ابوبکر رازی حنفی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں' قراء کوفیہ نے اس کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت قرار دیا ہے اور قراء بصریہ نے اس کو سورت فاتحہ کی آیات سے شمار نہیں کیا' ہمارے اصحاب (فقہاء احناف) سے یہ تصریح منقول نہیں ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے' البتہ ہمارے شیخ ابوالحسن کرخی ؒ نے فقہاء احناف کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ بسم اللہ کو نماز میں جہراً نہیں پڑھا جائے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ فقہاء احناف کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت نہیں ہے ورنہ اس کو بھی جہراً پڑھا جاتا جیسے سورہ فاتحہ کی باقی آیات کو جہراً پڑھا جاتا ہے۔ امام شافعی ؒ کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے۔

فقہاء احناف کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے اور میرے بندے کے درمیان صلوۃ (سورہ فاتحہ) کو نصف' نصف تقسیم کر دیا گیا ہے' نصف میرے لیے اور نصف میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے' پس جب بندہ کہتا ہے:' (آیت) "الحمد للہ رب العالمین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندہ نے میری حمد کی' اور جب بندہ کہتا ہے: "الرحمن الرحیم" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری تعظیم کی یا میری ثناء کی' اور جب بندہ کہتا ہے، (آیت) "۔ مالک یوم الدین" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' بندہ نے (خود) کو میرے سپرد کر دیا' اور جب بندہ کہتا ہے (آیت) "۔ ایاک نعبد وایاک نستعین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے' اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے، اور جب وہ کہتا ہے: (آیت) "۔ اھدنا الصراط المستقیم"۔ اخیر سورت

تک'۔تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے۔[۱]

اگر بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جز ہوتی تو سورہ فاتحہ کی آیات میں اس کا بھی ذکر اس حدیث میں ہوتا' اور جب آپ نے سورہ فاتحہ کی آیات میں بسم اللہ کا ذکر نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ بسم اللہ' سورہ فاتحہ کی آیت اور جز نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورہ فاتحہ کی جز نہیں ہے، اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک سورہ فاتحہ کی جز ہے۔

اوائل سورہ میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے ان سورتوں کے جز نہ ہونے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ:

علامہ نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

اوائل سورہ میں بسم اللہ قرآن کا جز ہے' کیونکہ امام مسلمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس ہوئے ہوئے تھے' پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے' پھر آپ نے تلاوت کی: (آیت) "بسم الله الرحمن الرحيم " انا اعطينك الكوثر فصل لربك وانحر ان شانئك هو الابتر (الکوثر)۔[۲]

۱۔(احکام القرآن ج ۱ ص ۹۔۸' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱٤٠٠ھ)

اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷٠۔۱٦۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷٥ھ)

۲۔(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷٥ھ)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورہ کوثر سے پہلے" بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو تبرکا پڑھا ہے' سورہ کوثر کی آیت ہونے کے لحاظ سے نہیں پڑھا کیونکہ اگر" بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہر سورت ابتداء میں اس کا جز ہوتی تو آپ پر سب سے پہلے" بسم اللہ الرحمن الرحیم" نازل ہوتی حالانکہ" صحیح بخاری" اور دیگر کتب صحاح میں یہ تصریح ہے کہ آپ پر سب سے پہلے (آیت)" اقرا باسم ربک الذی خلق"۔(العلق:۱) نازل ہوئی ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ آپ پر سب سے پہلے یہی آیت نازل ہوئی ہے۔

علامہ ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ سورہ نمل میں" بسم اللہ الرحمن الرحیم" کتاب اللہ کی آیت ہے اور ہر سورت کی ابتداء میں اس کے آیت ہونے میں اختلاف ہے' امام مالک اور امام ابوحنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ہر سورت کی ابتداء میں یہ آیت نہیں ہے' اس کو اس لیے ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں سے سورت شروع ہوئی ہے۔ (۱)

علامہ ابوالحسن مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ کے سوا ہر سورت کے اول میں بسم اللہ اس سورت کا جز نہیں ہے' علامہ زرکشی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ (۲)

علامہ ابوبکر رازی حنفی لکھتے ہیں:

۱۔(احکام القرآن ج۱ ص ۵ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت)

۲۔(انصاف ج۲ س ۴۸ 'مطبوعہ دار ااحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۲ ھ) غالبا علامہ مرداوی کو اس مسئلہ میں امام شافعی کے اختلاف کا علم نہیں ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ آیا اوائل سورہ میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ان سورتوں کی ایک آیت ہے یا نہیں؟ ہمارے نزدیک ہر سورت کے اول میں جو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہے وہ اس سورت کی آیت نہیں ہے' کیونکہ اس سورت کے ساتھ بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھا جاتا' نیز جب یہ سورہ فاتحہ کی جز نہیں ہے تو اسی طرح باقی سورتوں کی بھی جز نہیں ہے' کیونکہ یہ کسی کا قول نہیں ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی جز نہیں ہے اور باقی سورتوں کی جز ہے' اور امام شافعیؒ کا یہ قول ہے کہ ہر سورت سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اس سورت کی ایک آیت ہے اور ان سے پہلے یہ قول کسی نے نہیں کہا۔ اس سے پہلے یہ اختلاف تھا کہ یہ سورہ فاتحہ کی جز ہے یا نہیں۔ اوائل سورہ سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے جز نہ ہونے کے یہ دلائل ہیں:

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ سے پوچھا: اس کا کیا سبب ہے کہ آپ نے سورہ توبہ اور سورہ انفال کو سات بڑی سورتوں میں رکھا ہے اور آپ نے ان دو سورتوں کے درمیان "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نہیں لکھی؟ حضرت عثمانؓ نے کہا: جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کئی آیات نازل ہوتیں تو آپ کسی لکھنے والے کو بلاتے اور فرماتے: اس آیت کو فلاں سورت میں رکھو' اور جب آپ پر ایک یا دو آیتیں نازل ہوتیں تب بھی آپ اسی طرح فرماتے' سورہ انفال کا مضمون سورہ توبہ کے مضمون کے مشابہ تھا تو میں نے یہ گمان کیا کہ یہ اس کے ساتھ لاحق ہے' اس لیے میں نے ان دونوں کو سات بڑی سورتوں میں رکھا' اور ان کے درمیان "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی سطر نہیں لکھی۔ اس حدیث میں حضرت عثمانؓ نے یہ تصریح کی ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کسی سورت کا جز نہیں ہے اور وہ سورت سے پہلے بسم اللہ کو صرف دو سورتوں کے درمیان فصل کے لیے لکھتے تھے' نیز اگر ہر سورت سے پہلے بسم اللہ اس سورت کا جز ہوتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بتلانے سے ہر شخص کو اس کا علم

ہوتا، جیسا کہ دوسری آیات کا سب کو بغیر کسی نزاع کے علم ہے۔ دوسری دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قرآن میں ایک سورت کی تیس آیات ہیں جو اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کرتی رہے گی حتی کہ اس کی مغفرت کردی جائے گی (وہ سورت ہے) (آیت) "تبارك الذی بيده الملك" اور تمام قراء وغیرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سورہ (آیت) "تبارك الذی" میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے علاوہ تین آیتیں ہیں، اگر بسم اللہ اس سورت کا جز ہو تو اس سورت کی اکتیس آیتیں بن جائیں گی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس حدیث کے خلاف ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ تمام قراء اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ سورہ کوثر کی تین اور سورہ اخلاص کی چار آیتیں ہیں، اگر بسم اللہ کو ان سورتوں کا جز مانا جائے تو پھر ان کی آیتوں کی تعداد چار اور پانچ ہو جائے گی اور یہ ان کے اتفاق کے خلاف ہے۔[۱]

نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق مذاہب اربعہ:

علامہ ابوبکر رازی حنفیؒ لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ، اور امام شافعیؒ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں "اعوذ باللہ" کے بعد سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے، اور اس میں اختلاف ہے کہ آیا ہر رکعت میں بسم اللہ پڑھی جائے یا نہیں، اسی طرح سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے یا نہیں۔ امام ابویوسفؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ ہر رکعت میں ایک مرتبہ سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھے اور امام ابوحنیفہؒ اور امام یوسفؒ کے

۱۔(احکام القرآن ج۱ ص ۱۱۔۹، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱٤٠٠ھ)

نزدیک (ضم) سورت سے پہلے دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھے' اور امام محمدؒ اور حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہؒ ؒ سے یہ روایت کیا ہے کہ جب پہلی رکعت میں قرات سے پہلے بسم اللہ پڑھ لی ہے تو اب اس نماز میں سلام پھرنے تک اس پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم نہیں ہے' اور اگر اس نے ہر سورت کے ساتھ بسم اللہ پڑھ لی تو مستحسن ہے۔ حسن بن زیاد نے کہا: اگر وہ مسبوق ہے تو اس کی پہلی رکعت میں اس پر بسم اللہ پڑھنا ضروری نہیں ہے' کیونکہ امام پہلی رکعت میں بسم اللہ پڑھ چکا ہے اور امام کی قرات اس کی قرات ہے۔

امام مالک بن انس ؒ نے یہ کہا ہے کہ فرض نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھے نہ بلند آواز سے اور نفل میں اس کو اختیار ہے' اگر چاہے تو پڑھے اور اگر چاہے تو ترک کردے اور ہمارے نزدیک تمام نمازوں میں بسم اللہ پڑھے کیونکہ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز میں پڑھتے تھے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم " الحمد للہ رب العلمین "۔ اور حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)' حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی اقتداء میں نمازیں پڑھیں' وہ پست آواز سے بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ وہ جہراً بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ [1]

امام شافعی ؒ کے نزدیک چونکہ ہر سورت کے اول میں بسم اللہ اس سورت کا جز ہے اس لیے ان کے نزدیک ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے گی اور امام احمد کے نزدیک بسم اللہ صرف سورہ فاتحہ کا جز ہے اس لیے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے گی اور سورت سے پہلے نہیں پڑھی جائے گی۔

۱۔(احکام القرآن ج۱ ص ۱۴۔۱۳ ملخصا' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

نماز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو آہستہ سے پڑھنے کی تحقیق اور مذاہب

اربعہ:

علامہ ابوبکر رازی حنفیؒ لکھتے ہیں:

ہمارے اصحاب (احناف) اور ثوری نے یہ کہا ہے کہ نماز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو آہستہ پڑھا جائے، اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ بسم اللہ کو نماز میں جہراً پڑھے، یہ اختلاف اس وقت ہے جب امام نماز میں جہراً قرات کرے، اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا بہت اختلاف ہے، عمر بن ذرؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے بلند آواز سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھی، حماد نے ابراہیم سے روایت کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب "بسم اللہ الرحمن الرحیم" آہستہ پڑھتے تھے، جہر سے نہیں پڑھتے تھے، اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" آہستہ پڑھتے تھے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے مروی ہے، اور مغیرہؓ نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا بدعت ہے، امام ابوحنیفہؒ، حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نماز میں بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا اعرابیوں (بدوؤں) کا طریقہ ہے، اسی طرح حضرت عکرمہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ابووائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نماز میں "نہ بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو جہر سے پڑھتے تھے نہ "اعوذ باللہ" کو نہ آمین کو، اور حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ، نماز میں بسم اللہ کو آہستہ سے پڑھتے تھے اور

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ جہر سے بسم اللہ پڑھنے کو بدعت کہتے تھے۔ (۱)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز کو" اللہ اکبر" اور (آیت) "الحمد للہ رب العلمین" کی قرات سے شروع کرتے تھے اور سلام سے ختم کرتے تھے۔' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی فرض نماز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو جہراً نہیں پڑھا' نہ حضرت ابوبکرؓ نے نہ حضرت عمرؓ نے۔ (۲)

علامہ ابوالحسن مرداوی حنبلیؒ لکھتے ہیں:

بسم اللہ کو نماز میں جہراً نہ پڑھا جائے' خواہ ہم اس کو سورہ فاتحہ کا جز کہیں یا نہ کہیں' یہی صحیح قول ہے' مجد نے اپنی شرح میں اس کی تصیح کی ہے اور انھوں نے لکھا ہے کہ ترک جہر کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں ہے' خواہ ہمارے نزدیک یہ سورہ فاتحہ کا جز ہے' ابن حمدانؒ' ابن تمیمؒ' ابن جوزیؒ اور زرکشیؒ وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے اور اس قول کو مقدم رکھا ہے اور یہی جمہور کا موقف ہے۔ (۳)

علامہ نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

سنت یہ ہے کہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ اور اس کے بعد کی سورت سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو جہراً پڑھا جائے۔ (۴)

علامہ ابن رشد مالکیؒ لکھتے ہیں:

۱۔(جامع ترمذی ص ٦٢)

۲۔(احکام القرآن ج ۱ ص ١٦۔١٧' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ١٤٠٠ھ)

۳۔(انصاف ج ۲ ص ٤٩۔٤٨' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ١٣٧٢ھ)

۴۔(شرح مسلم ج ۱ ص ٣٤٨' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٧٥ھ)

امام مالکؒ نے فرض نماز میں بسم اللہ پڑھنے سے منع کیا ہے خواہ جہری نماز ہو یا سری، سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھے نہ اس کے بعد والی سورت سے پہلے اور نفل نماز میں جائز کہا ہے۔ ①

خلاصہ یہ ہے امام شافعیؒ کے نزدیک جہری نماز میں سورہ فاتحہ اور بعد کی سورت سے پہلے بسم اللہ کو جہراً پڑھے اور امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جہری نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ کو آہستہ پڑھے اور امام مالکؒ کے نزدیک فرض نماز میں مطلقا بسم اللہ نہ پڑھے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① ﴾

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔

الحمد کا لفظی معنی اور تفسیر

الحمد کے شروع میں الف لام استغراق پر دلالت کر رہا ہے۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ تمام طرح کی حمد و ثناء کا مستحق صرف اللہ پاک ہے حمد سے مقصود یہ ہے کہ زبان کے ساتھ کسی کے ذاتی اختیاری اوصاف پر تعریف کی جائے۔ عام ہے کہ کسی احسان کے سبب اس کی تعریف ہو یا بلا کسی احسان کے اس کی تعریف کی جائے۔ چونکہ اللہ پاک تمام کائنات کا پروردگار ہے اس لیے وہ ہر قسم کی حمد و ثنا کا مستحق ہے۔

حمد اور شکر میں لغوی فرق :۔ حمد کا معنی تعریف بھی ہوسکتا ہے اور شکر بھی۔ تعریف (حمد) عام ہے اور شکر خاص۔ حمد کا تعلق قابل تعریف کارناموں سے ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان، شمس و قمر اور ستاروں کی حرکت غرض تمام کائنات کا اس قدر مربوط اور منظم نظام بنا دیا ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی

۱۔ (بدایۃ المجتہد ج۱ ص ۸۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

ہے۔اس پر اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔اور شکر کا تعلق ان خاص انعامات سے ہوتا ہے جو کسی خاص ذات سے متعلق ہوں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا انسان کو احسن تقویم پر پیدا کرنا۔کسی کو صحت اور رزق کی فراوانیوں سے مالا مال کرنا۔ایسی نعمتوں کے اعتراف کو شکر کہا جاتا ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کی حمد اور شکر کا مستحق ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمام شکر اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات پر انعام کرتا ہے اور مخلوق اس کی حمد وثنا کرتی ہے۔ایک یہ تفسیر بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمتوں پر شکر ہے جو اس نے اپنے مومن بندوں پر کیں اور ان کو ایمان کی ہدایت عطا فرما کر سب سے بڑا انعام دیا۔[۱]

حضرت قتادہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ حمد،شکر کی اصل ہے،جس نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی اس نے ذرا بھی شکر نہیں کیا۔[۲]

ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ الحمد اللہ کے معنی یہ ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی شکر کے لائق ہے،اس کے سوا مخلوق میں سے کوئی بھی شکر کے لائق نہیں کیونکہ وہ تمام نعمتیں جو شمار سے باہر ہیں اور جن کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا،اسی کی طرف سے ہیں۔[۳]

امام قرطبیؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ میری امت میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں ساری دنیا دیدے اور وہ (اس پر)

۱۔تفسیر ابن عباس جلد ۱

۲۔(تفسیر مظہری ۴۔۱)

۳۔(ابن کثیر ۲۲۔۱)۔

الحمدللہ کہے تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل ہے۔قرطبی فرماتے ہیں کہ ساری دنیا دے دینا اتنی بڑی نعمت نہیں جتنی بڑی نعمت الحمدللہ کہنے کی توفیق دینا ہے،اس لیے کہ دنیا تو فانی ہے اور اس کا ثواب باقی ہی باقی ہے،قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

(آیت)"المال والبنون زينة الحيوة الدنيا والبقيت الصلحت خير عند ربك ثوابا"۔(کہف:٤٦)

مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی آرائش ہیں اور تیرے رب کے نزدیک باقی رہنے والی نیکیاں ثواب میں بہتر ہیں۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ[الزمر:٧٥] "اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"

اسی طرح حمد کے عموم میں مکان (جگہ) کا بھی عموم ہے،یعنی وہ کسی بھی جگہ میں ہو،زمین میں ہو یا آسمان میں،یا ان کے درمیان ہو یا عرش پر،فرمایا:(وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)[الروم:١٨]

امام عبدالرزاق نے المصنف میں اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں الخطابی نے الغریب میں بیہقی نے الادب میں دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ثعلبی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے وہ

۱۔(ابن کثیر ۲۳۔۱)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ الحمد للہ شکر کی اصل ہے اس بندے نے شکر ادا نہیں کیا جس نے اس کی حمد بیان نہیں کی۔

ثنائے رحمٰن پر بارگاہ الٰہی سے جواب، سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ فرماتا ہے، نماز کو میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کرلیا ہے اور میرے بندے کو وہ چیز مل جائے گی جس کا وہ سوال کرے گا۔ جب بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندے نے میری تعریف کی۔"[۱]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) "سب سے بہتر ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔"[۲]

سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایسا کوئی نہیں جس کو اللہ سے زیادہ (اپنی) تعریف پسند ہو، اسی لیے اللہ نے خود بھی اپنی تعریف کی ہے۔"[۳]

سیدنا ابو مالک اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ) "الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے۔"[۴]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں، ایک شخص آیا اس حالت میں کہ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا، وہ صف میں داخل ہوا اور اس نے کہا: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ) "سب تعریف اللہ کے لیے

۱۔[مسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔۔ الخ:۳۹۵]

۲۔[ترمذی، الدعوات، باب ماجاء أن دعوۃ المسلم مستجابۃ:۳۳۸۳، عن جابر (رض)

۳۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ عز وجل (قل إنما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن):٤٦٣٧۔ مسلم، کتاب التوبۃ، باب غیرۃ ا:٢٧٦٠]

۴۔[مسلم، کتاب الطهارۃ، باب فضل الوضوء:۲۲۳]

ہے، ایسی تعریف جو بہت زیادہ ہو، پاک ہو اور اس میں برکت دی گئی ہو۔" جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز مکمل کی تو فرمایا: "یہ کلمات کس نے کہے تھے؟"۔ اس شخص نے کہا، میں آیا، میرا سانس چڑھا ہوا تھا تو میں نے یہ کلمات پڑھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میں نے بارہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے کہ کون ان کلمات کو اوپر لے جائے۔" ۱

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ اسی اثنا میں ایک شخص نے یہ کلمات کہے: (اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا) "اللہ سب سے بڑا ہے، بہت بڑا، ساری تعریف اللہ کے لیے ہے، بہت زیادہ صبح وشام اللہ کے لیے تسبیح ہے۔" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "یہ کلمات کہنے والا کون ہے؟" لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا، اے اللہ کے رسول! (یہ کلمات کہنے والا) میں تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ان کلمات کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے۔" ۲

رات کو دیر تک (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ) پڑھنا جیسا کہ سیدنا ربیعہ بن کعب الاسلمیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دروازے کے قریب سویا کرتا تھا، کیونکہ میں آپ کے وضو کے لیے پانی مہیا کیا کرتا تھا، میں سنتا تھا کہ رات کو بہت دیر تک آپ (سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ) اور (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ) پڑھتے رہتے تھے۔ ۳

۱۔ [مسلم، کتاب المساجد، باب مایقال بین تکبیرۃ الاِحرام والقراءۃ: ٦٠٠]

۲۔ [مسلم، کتاب المساجد، باب مایقال بین تکبیرۃ الاِحرام والقراءۃ: ٦٠١]

۳۔ [ترمذی، کتاب الدعوات، باب منہ [دعاء سمع اللہ لمن حمدہ]: ٣٤١٦۔ ابن حبان: ٢٥٩٤]

خطبہ کا آغاز "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سے کرنا چاہیے جیسا کہ سیدنا جابر بن عبداللہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب لوگوں کو خطاب فرماتے تو اس میں اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے تھے۔ [۱]

سیدہ اسماء بنت ابوبکر ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کو خطاب کیا تو اللہ کی حمد بیان کی۔ [۲]

سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو خطبہ سیدنا ضماد ؓ کے سامنے دیا تھا، اس کی ابتدا ان الفاظ سے کی تھی: (اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ) "ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے اور ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں۔" [۳]

احرام باندھ کر سب سے پہلے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہنا چاہیے جیسا کہ سیدنا انس ؓ روایت کرتے ہیں، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سوار ہوئے اور سواری آپ کو لے کر مقام بیداء پر کھڑی ہوگئی تو آپ نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہِ" اور "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہنا شروع کر دیا۔ [۴]

بیدار ہوتے وقت کلمات حمد ادا کرنا جیسا کہ سیدنا حذیفہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ) "سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی

۱۔ [مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ: ۸۶۷/۴۵]

۲۔ [بخاری، کتاب الجمعۃ، باب من قال فی الخطبۃ بعد الثناء، أما بعد!: ۹۲۲]

۳۔ [مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ: ۸۶۸]

۴۔ [بخاری، کتاب الحج، باب التحمید والتسبیح والتکبیر قبل الإھلال عند الرکوب علی الدابۃ: ۱۵۵۱]

طرف (بروز قیامت) اٹھ کر جانا ہے۔“[1]

سونے کے لیے بستر پر آ کر کلمات حمد ادا کرنا جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، بیشک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بستر پر آتے تو یہ دعا پڑھتے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا، فَكَمْ مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهُ وَلَا مُؤْوِيَ) ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا، پلایا، ہمارے لیے کافی ہوا اور ہمیں ٹھکانا دیا، کتنے آدمی وہ ہیں کہ جن کا نہ کوئی کفایت کرنے والا ہے اور نہ ان کو کوئی ٹھکانا دینے والا۔“[2]

کھانا کھانے کے بعد کی دعا میں کلمات حمد، سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دستر خوان اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا) ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے، ایسی تعریف جو کثرت سے ہو، پاک ہو، بابرکت ہو، نہ کافی سمجھی گئی، نہ چھوڑی گئی اور اے ہمارے رب! کوئی بھی اس سے بے پروا نہیں۔“[3]

چھینک آنے پر ”الحمد للہ“ کہنا چاہیے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو وہ ”الحمد للہ“ کہے۔“[4]

اچھا خواب دیکھنے پر ”الحمد للہ“ کہنا جیسا کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب الدعوات، باب وضع الید تحت الخد الیمنی: ٦٣١٤۔ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب الدعاء عند النوم: ٢٧١١]

[2]۔ [مسلم، کتاب الدعوات، باب ما یقول عند النوم: ٢٧١٥]

[3]۔ [بخاری، کتاب الأطعمة، باب ما یقول إذا فرغ من طعامه: ٥٤٥٨]

[4]۔ [بخاری، کتاب الأدب، باب إذا عطس کیف یشمت؟: ٦٢٢٤]

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا: "جب تم میں سے کوئی ایسا خواب دیکھے جو اسے اچھا معلوم ہوتو وہ یقیناً اللہ کی طرف سے ہے، لہٰذا اسے اللہ کی حمد بیان کرنی چاہیے۔" (۱)

بہتری یا بھلائی کی کوئی چیز دیکھنے پر "الحمدللہ" کہنا چاہیے جیسا کہ سیدنا ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، جو شخص بھلائی پائے اسے اللہ کی حمد بیان کرنی چاہیے اور جو اس کے علاوہ کوئی چیز پائے تو وہ اپنے نفس کے علاوہ کسی کو ملامت نہ کرے۔" (۲)

جب ابر کھل جائے تو "الحمدللہ" کہنا چاہیے جیسا کہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آفاق میں سے کسی افق میں بادل آتا دیکھتے تو آپ جس کام میں بھی مشغول ہوتے، خواہ نماز ہی میں کیوں نہ ہوتے، اسے چھوڑ کر بادل کی طرف مشغول ہوجاتے اور فرماتے: (اَللّٰھُمَّ ! اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا اُرْسِلَ بِهِ) "یا اللہ! ہم اس چیز کے شر سے تیری پناہ میں آتے ہیں جو کچھ دے کر یہ (بادل) بھیجا گیا ہے۔" اگر بارش شروع ہوجاتی تو دو بار یا تین بار فرماتے: (اَللّٰھُمَّ ! صَیِّبًا نَافِعًا) "اے اللہ! اس بارش کو فائدہ مند بنا دے۔" اور اگر اللہ ابر کھول دیتا اور بارش نہ ہوتی تو آپ اس پر بھی اللہ کی حمد بیان فرماتے۔ (۳)

رب العٰلمین کا معنی اور تفسیر

(رب): مالک، آقا، پرورش کرنا، تربیت کرنا، کام بنانا کسی شئے کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے آہستہ آہستہ درجہ، کمال تک پہنچانے کو تربیت کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔

۱۔[بخاری، کتاب التعبیر، باب الرؤیا من اللہ: ٦٩٨٥]

۲۔[مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم: ٢٥٧٧]

(علمین): یہ عالم کی جمع ہے جو علامہ سے مشتق ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا تمام موجودات ہیں، اس کا اطلاق ہر مخلوق پر ہوتا ہے جیسے عالم انس، عالم جن، عالم ملائکہ، وغیرہ۔

مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی تربیت (پرورش کرنے) کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) تربیت عامہ (۲) تربیت خاصہ تربیت عامہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا، ان کو رزق بہم پہنچایا اور ان مفادات و مصالح کی طرف ان کی راہ نمائی کی جن میں ان کی دنیاوی زندگی کی بقا ہے۔ تربیت خاصہ وہ تربیت ہے جو اس کے اولیا کے لیے مخصوص ہے پس وہ ایمان کے ذریعے سے ان کی تربیت کرتا ہے، انہیں ایمان کی توفیق سے نوازتا اور ان کی تکمیل کرتا ہے وہ ان سے ان تمام امور کو دور کرتا ہے جو راہ حق پر چلنے سے انہیں باز رکھتیں ہیں اور ان تمام رکاوٹوں کو ہٹاتا ہے جو ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔

تربیت خاصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہر بھلائی کی توفیق ملتی اور ہر برائی سے حفاظت نصیب ہوتی ہے۔ شاید یہی معنی انبیائے کرام (علیہ السلام) کی دعاؤں کا سرنہاں ہے کہ ان میں اکثر "رب" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ انبیائے کرام کی فریادیں تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی ربوبیت خاصہ کے تحت آتی ہیں۔ [۱]

حضرت ابن عباس نے فرمایا: عالمون سے مراد جن وانس ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لیکون للعلمین نذیرا (الفرقان) (اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن وانس کو ڈرانے والے تھے نہ کہ چوپاؤں کو)۔ فراء اور ابو عبیدہ نے کہا: العالم سے مراد ہر ذی عقل ہے اور یہ چار امم ہیں:

۱۔ تفسیر سعدی

انسان، جن، ملائکہ اور شیاطین۔ بہائم، چوپاؤں کو عالم میں نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ جمع ذی عقل کی جمع ہوتی ہے۔

اعشی نے کہا: ما ان سمعت بمثلھم فی العالمینا میں نے ذی عقل لوگوں میں ان کی مثل نہیں سنا۔

زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد وہ ہیں جن کو رزق دیا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قول ابوعمرو بن علاء کا ہے کہ وہ روحانیون ہیں۔ حضرت ابن عباس ؓ کے قول کا معنی بھی یہی ہے، ہر ذی روح جو زمین کی سطح پر چلا۔ وہب بن منبہ ؒ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ان عالموں میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں۔ دنیا، مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے۔ مقاتل نے کہا: عالمون، اسی ہزار عالم ہے، چالیس ہزار عالم خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار عالم سمندر میں ہیں۔ ربیع بن انس نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جن ایک عالم ہے، انسان ایک عالم ہے، اس کے علاوہ زمین کے چار کونے ہیں، ہر کونے میں پندرہ ہزار عالم ہیں اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنی عبادت کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ عالم ہر مخلوق و موجود کو شامل ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قال فرعون وما رب العلمین قال رب السموت والارض وما بینھما (الشعراء)

اور یہ علم اور علامۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ اپنے موجد پر دلالت کرتا ہے اسی طرح زجاج نے کہا: عالم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں پیدا فرمایا۔ خلیل نے کہا: العلم، العلامۃ اور المعلم ہر

اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر دلالت کرے۔ (۱)

﴿ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ ﴾

جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

الرحمٰن الرحیم کا معنی اور تفسیر

یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں رحم سے مشتق ہیں، بعض علماء کا قول ہے کہ دونوں کا ایک معنی ہے اور اکثر علماء یہ فرماتے ہیں کہ رحمن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے چونکہ دونوں ہی مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اس لیے ہر ایک کے ترجمہ میں معنی مبالغہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ رَحۡمٰن اللہ پاک کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور رحیم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کی مخلوق کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ کما قال تبارک وتعالیٰ فی شان نبیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام (بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ط)

اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ کا برابر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے وہ ساری مخلوق پر رحم فرماتا ہے، سب کا وجود اور بقا آرام وسکون سب اسی کی رحمت سے ہے۔ (۲)

یہ دونوں نام ”رحم“ سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ رحمن میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، اسی لیے ”یَارَحۡمٰنَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ!“ کہا جاتا ہے۔ وہ رحمن ہے، سو دنیا میں اس کی رحمت عام ہے جس سے کافر و مومن سب بلا تخصیص فیض یاب ہو رہے ہیں، تاہم آخرت میں وہ صرف رحیم ہے،

۱۔ (الجامع الاحکام القرآن ج۱ ص ۱۳۸ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ) ، تفسیر ابن کثیر

۲۔ تفسیر انوار البیان

یعنی اس کی رحمت صرف مومنین کے لیے خاص ہوگی۔ نیز اسم "رحمٰن" بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، کسی اور کو اس نام کے ساتھ موسوم نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ اَيًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى [بنی اسرائیل: ۱۱۰] "کہہ دے اللہ کو پکارو، یا رحمٰن کو پکارو، تم جس کو بھی پکارو گے سو یہ بہترین نام اسی کے ہیں۔"

اسمائے حسنیٰ کو یاد کرنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے سیدنا ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بیشک اللہ تعالیٰ کے ایک کم سو (یعنی ننانوے) نام ہیں، جو انھیں یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"[1]

سیدنا عبدالرحمن بن عوف ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میں رحمن ہوں، میں نے "رحم" کو پیدا کیا اور اسے اپنے نام سے مشتق کیا ہے، جس نے اسے ملایا، میں اسے ملاؤں گا اور جس نے اسے توڑا میں بھی اسے توڑ دوں گا۔"[2]

ثنا کے کلمات پر رحمٰن کے عطیات کا تذکرہ کرتے ہوئے سیدنا ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمارہے تھے: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کرلیا ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جس کا وہ سوال کرے، بندہ جب کہتا ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی ہے، بندہ جب کہتا ہے: الرَّحۡمٰنِ

۱۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب إن للہ مائۃ اسم إلا واحدۃ: ۷۳۹۲۔ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی أسماء اللہ تعالیٰ وفضل من أحصاھا: ۲۶۷۷]

۲۔ [ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی قطیعۃ الرحم: ۱۹۰۷۔ ابن حبان: ٤٤٣]

الرَّحِیۡمِ تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی ہے۔“ (۱)

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اگر مومن کو اللہ کے عذاب کے بارے میں صحیح علم ہو جائے تو کوئی بھی اس کی جنت کی خواہش نہ کرے اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کے پاس کتنی رحمت ہے تو کوئی بھی اللہ کی جنت سے ناامید نہ ہو۔“ (۲)

اللہ کی رحمت کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو ایک کتاب میں، جو اس کے پاس عرش پر ہے، یہ لکھ دیا، بیشک میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔“ (۳)

اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پناہ ہے، تاہم اللہ رب العزت کی رحمت کی وسعت پر تکیہ کر کے بے عملی کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیے، بلکہ محنت وکاوش اور عمل کی راہ کا راہی بن کر اپنے آپ کو امیدوارِ رحمت ثابت کرنا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ رحمت الٰہی کا سمندر اسی کے لیے جوش میں آتا ہے جو خود کو اس کا طالب ثابت کرتا ہے اور جو حصول رحمت کے لیے آگے بڑھے اللہ تعالیٰ اس کی قدردانی کرتا ہے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اگر میرا بندہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں، اگر بندہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں ایک باع (دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ جتنا) اس کے قریب ہو جاتا

۱۔[مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔۔۔ الخ: ۳۹۵]

۲۔[مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وأنہا تغلب غضبہ: ۲۷۵۵]

۳۔[بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ (ویحذرکم اللہ نفسہٗ): ۷۴۰۴۔ مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وأنہا تغلب غضبہ: ۲۷۵۱]

ہوں اور اگر بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑتا ہوا آتا ہوں۔“[۱]

دنیا میں تمام باہمی محبتیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث ہیں، تاہم آخرت میں اس کی رحمت اور زیادہ وسیع ہوگی جیسا کہ سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”بیشک اللہ کے پاس سو رحمتیں ہیں، ان سو رحمتوں میں سے اس نے جن وانس، مویشی اور کیڑوں مکوڑوں میں ایک رحمت نازل فرمائی ہے۔ اسی ایک رحمت کی بدولت جنات، انسان اور حیوان ایک دوسرے پر مہربان ہوتے اور رحم کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے وحشی جانور تک اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہیں، ان رحمتوں سے اللہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔“[۲]

دنیا میں محبت ومہربانی کی انتہا ماں کی محبت ہے، لیکن اللہ کی اپنے بندے سے محبت ومہربانی اس سے بھی کہیں زیادہ اور بے انتہا ہے جیسا کہ حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کچھ قیدی لائے گئے، ان قیدیوں میں ایک عورت کسی کو تلاش کر رہی تھی، جب اس نے ان قیدیوں میں ایک بچے کو پایا تو اسے اٹھا لیا، چھاتی سے لگایا اور دودھ پلانا شروع کر دیا، تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے فرمایا: ”کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟“ ہم نے کہا، نہیں، اللہ کی قسم! وہ اسے آگ میں نہیں ڈال سکتی، تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جتنی مہربان یہ عورت اپنے بچے پر ہے اس سے زیادہ مہربان اللہ اپنے بندوں پر

۱۔[بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ (ویحذرکم اللہ نفسہٗ): ۷۴۰۵۔ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب الحث علی ذکر اللہ تعالیٰ: ۲۶۷۵]

۲۔[مسلم کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وأنہا تغلب غضبہ: ۲۷۵۲/۱۹۔ بخاری، کتاب الأدب، باب جعل اللہ الرحمۃ فی ماءۃ جزء: ۶۰۰۰]

ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، اس لیے وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ بندے بھی بندوں سے مہربانی ہی کا برتاؤ کریں۔ جیسا کہ سیدنا اسامہ بن زید ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔“[۲]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔“[۳]

سیدنا عبداللہ بن عمرو ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”دوسروں پر رحم کرنے والوں پر رحمن رحم فرماتا ہے، تم اہل زمین پر رحم کرو تو جو آسمان میں ہے وہ تم پر رحم فرمائے گا۔“[۴]

﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۳ ﴾

جو بدلے (روز جزاء) کے دن کا مالک ہے۔

ملک یوم الدین کی تشریح

مالک یوم الدین: لفظ ”مالک“ ”ملک“ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں

۱۔[مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وأنہا تغلب غضبہ: ۲۷۵٤۔ بخاری، کتاب الأدب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ: ٥۹۹۹]

۲۔[بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی قول اللہ تعالیٰ (إن رحمۃ اللہ قریب من المحسنین): ۷٤٤۸۔ مسلم، کتاب الجنائز، باب البکاء علی المیت: ۹۲۳]

۳۔[بخاری، کتاب الأدب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ: ٥۹۹۷]

۴۔[ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ الناس: ۱۹۲٤]

تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو۔(قاموس)

(دین): بدلہ، جزا، حساب، ایک مقررہ دن میں اچھے برے، نیک و بد، ظالم و مظلوم سب کو ان کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، وہی بدلہ کا دن ہے، قرآن کریم میں ہے۔

امام طبریؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔ مالک یوم الدین سے مراد حساب کا دن ہے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت جس میں ابن عباسؓ بھی شامل ہیں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ (۱)

2۔ امام قرطبیؒ نے ابن مسعودؓ سے نقل کیا کہ الدین اعمال کے بدلے اور حساب کو کہتے ہیں اور یہی قول ابن عباسؓ نے اختیار کیا ہے۔ (۲)

ضحاک نے ابن عباسؓ سے روایت کی کہ (آیت) "ملک یوم الدین"۔ کے معنی یہ ہیں کہ اس دن کسی شخص کو حکم کی قدرت نہ ہوگی جیسے دنیا میں بادشاہوں اور حاکموں کو ہوتی ہے پس قیامت کے دن نہ صرف یہ کہ کوئی ملکیت کا دعویدار نہ ہوگا بلکہ اس مالک حقیقی کی اجازت کے بغیر کوئی زبان تک نہ ہلا سکے گا

یوم کا عرفی اور شرعی معنی:

علامہ آلوسی لکھتے ہیں: عرف میں طلوع شمس سے لے کر غروب شمس تک کے زمانہ کو یوم کہتے ہیں، اور اعمش کے سوا اہل سنت کے نزدیک شریعت میں طلوع فجر ثانی سے لے کر غروب شمس تک کے وقت کو یوم کہتے ہیں اور یوم قیامت اپنے معروف معنی میں حقیقت شرعیہ ہے۔ (۳)

یوم قیامت کی مقدار:

۱۔(المستدرک 2/258)

۲۔(احکام 1/125)

۳۔(روح المعانی ج ۱ ص ۸٤، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قیامت کے دن کے متعلق قرآن مجید میں ہے: (آیت) "تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ إِلَيۡهِ فِي يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِينَ أَلۡفَ سَنَةٍ (المعارج: ٤) جبرائیل اور فرشتے اس کی طرف عروج کرتے ہیں (جس دن عذاب ہوگا) اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

امام ابویعلیٰؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں، عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن مجید میں اس دن کے متعلق ہے کہ وہ پچاس ہزار برس کا ہوگا، یہ کتنا لمبا دن ہوگا؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ وقدرت میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے! مومن پر اس دن میں تخفیف کی جائے گی، حتی کہ وہ جتنی دیر میں دنیا میں فرض نماز پڑھتا تھا اس پر وہ دن اس سے بھی کم وقت میں گزرے گا۔ [1]

نیز حافظ الہیثمیؒ لکھتے ہیں: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: لوگ رب العلمین، کے سامنے آدھے دن تک کھڑے رہیں گے جو پچاس ہزار برس کا ہوگا اور مومن پر آسانی کردی جائے گی، جیسے سورج کے مائل بہ غروب ہونے سے اس کے غروب ہونے تک، اس حدیث کو امام ابویعلی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ [2]

امام احمدؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوسعید خدریؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ کافر کے لیے قیامت کا دین پچاس ہزار برس کا مقرر کیا جائے گا کیونکہ اس نے دنیا میں

١۔(مسند ابویعلی ج ٢ ص ١٣٤، مطبوعہ دار المامون ترات، بیروت، ١٤٠٤ھ) حضرت ابوسعید خدری (رض) کی حدیث مذکور کے متعلق حافظ الہیثمیؒ لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد اور امام ابویعلیؒ نے روایت کیا ہے، اس کا ایک راوی ضعیف ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٣٣٧، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ١٤٠٢ھ)

٢۔(مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٣٣٧، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ١٤٠٢ھ)

نیک عمل نہیں کئے۔ (۱)

اللہ تعالیٰ جس طرح قیامت کے دن کا مالک ہے، اسی طرح وہ دوسرے تمام دنوں کا بھی مالک ہے۔ یہاں قیامت کے دن کا ذکر بالخصوص اس لیے آیا کہ اس دن تمام مخلوقات کی بادشاہت ختم ہوجائے گی، تمام شاہان دنیا اوران کی رعایا، سب آزاد و غلام اور چھوٹے بڑے برابر ہوجائیں گے اور صرف ایک اللہ کی ملوکیت و بادشاہت باقی رہے گی۔ سبھی اس کے جلال و جبروت کے سامنے سرنگوں ہونگے، سبھی اس کی جنت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہونگے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اس دن اپنے اختیار اور انسان کی بے اختیاری کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: (ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ○ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ)[الانفطار:۱۷ تا ۱۹] ”اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔“

اور فرمایا: (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ)[المؤمن:۱٦] ”آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، دبدبے والا ہے۔“

سیدنا ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (يَا فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ! سَلِيْنِيْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِيْ لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا) ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے تو جو چاہے مجھ سے مانگ لے، مگر میں (روز قیامت)

۱۔(مسند ج ۳ ص ۷۵، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کے حضور تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔“[۱]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”بندہ جب (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔“[۲]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے دن بدترین نام اس شخص کا ہو گا جو اپنا نام ”ملک الاملاک“ (یعنی شہنشاہ) رکھے۔“[۳]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”روز قیامت اللہ تعالیٰ زمین کو پکڑ ے گا اور آسمان کو لپیٹ کر اپنے دائیں ہاتھ میں لے لے گا اور فرمائے گا: ”میں ہوں بادشاہ، کہاں ہیں دنیا کے بادشاہ؟“۔[۴]

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؁۴ ﴾

هم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

معبود اور مستعان صرف اللہ کی ذات ہے

اِيَّاكَ نَعْبُدُ ”عبادت“ کا لغوی معنی ہے بطور تعظیم معبود کے لیے عجز و انکسار، خشوع و خضوع اور بندگی و

۱۔[بخاری، کتاب التفسیر، باٌب (وأنذر عشیرتک الأ قربین):٤٧٧١۔مسلم، کتاب ال إیمان، باب فی قولہ تعالیٰ (وأنذر عشیرتک الأ قربین):٢٠٦
]

۲۔[مسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔۔الخ:٣٩٥]

۳۔[بخاری، کتاب الأ دب، باب أبغض الأ سماء إلی اللہ:٦٢٠٥۔مسلم، کتاب الآداب، باب تحریم التسمی بملک الأ ملاک أو بملک الملوک:٢١٤٣]

۴۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب یقبض اللہ الأ رض یوم القیامۃ:٦٥١٩۔مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار:٢٧٨٧]

پرستش۔

امام ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے لفظ آیت "ایاک نعبد" کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے ایک مانتے ہیں اور ہم تجھ ہی سے ڈرتے ہیں اے ہمارے رب ہم تجھ ہی سے امید رکھتے ہیں تو ہمارا رب ہے تیرے سوا کوئی نہیں لفظ آیت "وایاک نستعین" اور ہم تجھ ہی سے تیری اطاعت پر اور اپنے تمام کاموں پر مدد مانگتے ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ کمال محبت کے ساتھ کمال اطاعت کا نام عبادت ہے، عبادت کا مفہوم زندگی کے تمام شعبوں، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، معاملات، اور اخلاق و آداب وغیرہ سب پر حاوی ہے، نعبد جمع کا صیغہ ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندگی کرنے والا اپنی عبادت پر ناز نہ کرے بلکہ یہ خیال کرے کہ عبادت کرنے والا صرف وہی نہیں بلکہ بیشمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک ہے۔ [۱]

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "نعبد" کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے۔ [۲]

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ (آیت) "ایاک نعبد"۔ کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم خاص تیری ہی توحید مانتے ہیں اور تجھ ہی سے ڈرتے ہیں اور تیری ہی ذات سے امید رکھتے ہیں، تیرے سوا کسی اور کی نہ تو ہم عبادت کرتے ہیں، نہ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ کسی سے امید رکھتے ہیں۔ [۳]

۱۔(معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۱۰،۱۶۔۱)

۲۔(مظہری ۹۔۱)

۳۔(ابن کثیر ۲۶۔۱)

علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

(آیت) "ایاک نستعین" کا معنی یہ ہے: اے ہمارے! ہم اپنی عبادات' اپنی طاعات اور اپنے تمام معاملات میں صرف تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں' تیرے سوا اور کوئی مددگار نہیں ہے' کفار اپنے معاملات میں اپنے باطل معبودوں سے مدد طلب کرتے ہیں اور ہم اخلاص کے ساتھ تیری عبادت کرتے ہیں اور اپنے تمام امور میں تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ہم اپنی اطاعت اور تمام امور میں تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ [۱]

توحید کی تین قسمیں: اس سورت میں توحید کی تینوں قسموں کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

1۔توحید ربوبیت: رب العالمین سے ماخوذ ہے۔توحید ربوبیت یہ ہے کہ آسمان وزمین اور اس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کا خالق ورازق اور مالک ومدبر صرف اللہ تعالیٰ ہے

2۔توحید الوہیت۔لفظ اللہ اور ایاک نعبد وایاک نستعین سے ماخوذ ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت کی جتنی قسمیں ہوسکتی ہیں ان سب کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

3۔توحید اسماء وصفات۔کلمہ، الحمد، سے ماخوذ ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحیح احادیث میں اللہ کے جتنے اسماء وصفات ثابت کیے ہیں، ان کو اسی طرح مانا جائے، نہ ان کا انکار کیا جائے، نہ ان کی مثال بیان کی جائے اور نہ ہی کسی غیر اللہ کے ناموں اور صفات کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ حضرت امام مالکؒ سے عرش پر مستوی ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا الاستواء معلوم، والکیف مجھول والسوال عنہ بدعۃ والایمان بہ واجب۔ یعنی

۱۔(جامع البیان ج۱ ص ۵۳ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، یعنی یہ نہیں معلوم کہ اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیا کیفیت ہے، اور اس کے بارے میں پوچھنا بدعت ہے، یعنی اسلاف کرام کبھی اس کی کرید میں نہ پڑے، اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

نذر و نیاز، خشوع و خضوع، تذلل و تعظیم اور سجدہ و تقرب سب کا مستحق صرف اور صرف اللہ رب العزت ہے، جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

(وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا) [النساء:٣٦] ''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ۔'' اور فرمایا: (اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا) [الکھف:١١٠] ''تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔'' اور فرمایا: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) [النحل:٣٦] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔'' اور فرمایا: (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) [الذاریات:٥٦] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

عبادت صرف اللہ کا حق ہے جیسا کہ سیدنا معاذؓ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے گدھے پر سوار تھا، جسے عفیر کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے پوچھا: ''اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟'' میں نے

عرض کیا، اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا: "بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو شخص شرک نہ کرے وہ اسے عذاب نہ دے۔" (۱)

سیدنا ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بندہ جب کہتا ہے: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جس کا وہ سوال کرے۔" (۲)

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: "استعانت" کا مفہوم یہ ہے کہ حصول نفع اور دفع ضرر کے لیے اللہ تعالیٰ پر پورا پورا بھروسا کیا جائے اور اسی سے مدد چاہی جائے، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اسے ضرور پورا کرے گا اور اللہ تعالیٰ نہ صرف کی گئی دعا سنتا ہے اور اس پر عطا فرماتا ہے، بلکہ انسانی حاجات پوری کرنے کے لیے خود صدا لگاتا ہے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہؓ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا بزرگ و برتر رب آسمان دنیا پر نازل ہوتا ہے اور فرماتا ہے، کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے اپنی حاجات مانگے اور میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش چاہے اور میں اسے بخش دوں؟"۔ (۳)

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے سوار

۱۔[بخاری، کتاب الجھاد، باب اسم الفرس والحمار: ۲۸۵۶]

۲۔[مسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔۔الخ: ۳۹۵]

۳۔[بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء نصف اللیل: ۶۳۲۱]

تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے لڑکے! یقیناً میں تجھے کچھ باتیں سکھا رہا ہوں، (وہ یہ کہ) تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت کر، وہ تیری حفاظت کرے گا، جب تو اللہ کی حفاظت کرے گا، تو اس کو اپنے روبرو پائے گا، تو جب سوال کرے تو اللہ تعالیٰ (ہی) سے سوال کر اور جب مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ (ہی) سے مدد مانگ اور اس حقیقت کو جان لے کہ اگر ساری امت تجھے کچھ نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو تجھے وہ نفع ہی پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے تحریر کر دیا ہوا ہے اور اگر تمام امت تجھے کچھ نقصان پہنچانے کے لیے متحد ہو جائے تو تجھے اتنا ہی ضرر پہنچا سکیں گے جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہوا ہے، قلموں کو اٹھا لیا گیا ہے اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔" [۱]

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔

استعانت و توسل کی تحقیق

مدد ماتحت اسباب:

☆ یہ دوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے کا مسئلہ ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد تو مادی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد لینے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اس استعانت میں داخل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادی اسباب کے

۱۔ [ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب [حدیث حنظلۃ۔۔]:۲۵۱۶

ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعاء کرنے کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا روایات حدیث اور اشارات قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص اور غیر اللہ کے لیے حرام وشرک ہے۔

مخصوص مدد:

اب وہ مخصوص استعانت وامداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور غیر اللہ کے لیے شرک ہے کونسی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبروں یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادر مطلق اور مختار مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادر مطلق اور مختار مطلق ی کفار بھی نہیں کہتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل وشرک قرار دیتا ہے، ایاک نستعین میں یہی مراد ہے، کہ ایسی استعانت وامداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت واختیار کا کچھ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اس دائرے میں وہ خود مختار ہے یہی وہ استعانت واستمداد ہے جو مومن وکافر میں فرق اور اسلام وکفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک وحرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائم اور اس پر عامل ہیں، محتاط مقام: اس معاملے میں دھوکہ یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس مغالطے میں پڑ سکتا ہے کہ اس

فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار سپرد کر دیا ہے، یا بہت انبیاء (علیہم السلام) کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے یہ بہت سے کام وجود میں آتے ہیں، جن کو کرامات کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت واختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاء واولیاء کو ایک درجے میں مختار کار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، پیغمبر اور ولی کا اس کے وجود میں آنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا، قرآن مجید کی بیشمار آیات اس پر شاہد ہیں۔

ارشادات اولیاء (وسیلہ کے متعلق)

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یا یھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔

(اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ پاک سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں تا کہ تمہارا بھلا ہو۔)

ای تقربوا الیہ بطاعۃ والعمل بما یرضیہ۔

یعنی اللہ کا قرب حاصل کرو اس کی فرماں برداری اور رضامندی کے ساتھ۔

آیت کریمہ میں مخاطب مومن ہے۔ پہلا حکم اس کو تقویٰ کا دیا جاتا ہے اس لیے کہ تقویٰ ملاک الحسنات

یعنی ساری نیکیوں کی جڑ اور اصل ہے خوف خدا ہی انسان کو برے کاموں سے باز رکھتا ہے۔

دوسرا حکم وسیلہ کا ہے جس کی تفسیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام نے اطاعت اور عمل صالح سے کی ہے تو جیسا کہ وسیلہ میں ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء وصلحاء کی صحبت و اطاعت بھی داخل ہے فرمان خداوندی ہے۔

یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصدقین۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔)

انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کی ذوات سے توسل کے متعلق فقہاء اسلام کی عبارات:

امام محمد بن جزریؒ آداب دعا میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیاء (علیہم السلام) اور صالحین کا وسیلہ پیش کرے۔ (۱)

ملا علی قاریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

مصنف نے کہا: دعا میں انبیاء اور صالحین کا وسیلہ پیش کرنا امور مستحبہ میں سے ہے کیونکہ "صحیح بخاری" کی کتاب الاستقاء میں ہے:

حضرت عمرؓ نے فرمایا: پہلے ہم اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرتے تھے تو (اے اللہ!) تو بارش نازل فرماتا تھا، اب ہم اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عم محترم کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں تو ہم پر بارش نازل فرما، پھر ان پر بارش ہو جاتی، اور جیسا کہ نابینا کی حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کا ذکر ہے جس کو امام حاکم نے اپنی "مستدرک" میں روایت کیا اور یہ

۱۔(حصن حصین مع تحفۃ الذاکرین ص ۳٤، مطبوعہ مطبع مصطفے البانی، مصر، ۱۳۵۰ھ)

کہا کہ یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے' اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح' غریب ہے اور اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم کبیر" اور "کتاب الدعاء" میں ذکر کیا ہے۔ (۱)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

سوال کرنے والوں کا اللہ پر اس لیے حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اپنے کرم سے) ان کی دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے: گویا کہ بندے نے اللہ تعالیٰ سے بندوں پر اس کے حق کے وسیلہ سے' اور سائلین کا اللہ پر جو حق ہے اس کے وسیلہ سے سوال کیا' اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں' اس کی حمد و ثناء کریں' اس کے احکام پر عمل کریں' اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے رکیں' اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے یہ حق ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق ان کو ثواب عطا کرے' کیونکہ اس کے وعدہ کا پورا ہونا واجب ہے' کہ اس کا وعدہ حق ہے اور اس کی خبر صادق ہے۔ (۲)

شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والا یہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے فلاں کے حق اور فلاں فرشتے اور انبیاء اور صالحین وغیرہ کے حق سے سوال کرتا ہوں یا فلاں کی حرمت اور فلاں کی وجاہت کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں، اس دعا کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک ان مقربین کی وجاہت ہو، اور یہ دعا صحیح ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان مقربین کی وجاہت اور حرمت ہے' جس کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ

۱۔(الحرز الثمین ص ۱۷۶' مطبوعہ مطبعہ امیریہ' مکہ مکرمہ' ۱۳۰٤ھ) امام جزری نے حضرت ابوامامہ کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: اسئلک بنور وجھک الذی اشرقت لہ السموات والارض وبکل حق ھو لک وبحق السائلین علیک: (امام محمد بن جزری متوفی ۸۳۳ھ' حصن حصین مع تحفۃ الذاکرین ص ٦٨' مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۰ھ)

۲۔(الحرز الثمین ص ۱۷٦' مطبوعہ امیریہ' مکہ مکرمہ' ۱۳۰٤ھ)

ان کے درجات بلند کرے اوران کی قدرافزائی کرے اور جب یہ شفاعت کریں تو ان کی شفاعت قبول کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کون اس سے شفاعت کرسکتا ہے۔ [۱]

غیر مقلد عالم قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:

یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سائلین کے حق میں مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو مسترد نہ کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا ہے: مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔ [۲]

نیز قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ انبیاء (علیہم السلام) کے وسیلہ کے جواز پر وہ حدیث دلیل ہے جس کو امام ترمذیؒ نے روایت کرکے کہا: یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے، امام نسائیؒ امام ابن ماجہؒ اور امام ابن خزیمہؒ نے اپنی صحیح میں اور امام حاکمؒ نے اس کو روایت کرکے کہا یہ حدیث امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی شرط پر صحیح ہے، حضرت عثمان بن حنیفؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا: آپ اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میری آنکھیں ٹھیک کردے آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اس کام کو موخر کردوں اور یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا اور اگر تم چاہو تو (ابھی) دعا کر دوں، اس نے کہا: آپ دعا کر دیجیے آپ نے فرمایا: تم اچھی طرح وضو کرو دو رکعت نماز پڑھو، اس کے بعد یہ دعا کرو: "اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کے وسیلہ سے اس حاجت میں اپنے

۱۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج۱ ص ۲۱۱، مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز)

۲۔ (تحفۃ الذاکرین ۶۹، مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ مصر، ۱۳۵۰ھ)

رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تا کہ میری یہ حاجت پوری ہو' اے اللہ! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو میرے لیے شفاعت کرنے والا بنادے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں صحابہؓ کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کی درخواست کرنا:

حضرت عثمان بن حنیفؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے کسی کام سے حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس جاتا تھا اور حضرت عثمانؓ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے' اور نہ اس کے کام کی طرف دھیان دیتے تھے' ایک دن اس شخص کی حضرت عثمان بن حنیفؓ سے ملاقات ہوئی' اس نے حضرت عثمان بن حنیفؓ سے اس بات کی شکایت کی' حضرت عثمانؓ نے اس سے کہا: تم وضوخانہ جا کر وضو کرو' پھر مسجد میں جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز پڑھو' پھر یہ کہو: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ہمارے نبی، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں' اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کے واسطے سے آپ کے رب عزوجل کی طرف متوجہ ہوا ہوں تا کہ وہ میری حاجت روائی کرے اور اپنی حاجت کا ذکر کرنا' پھر میرے پاس آنا حتی کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں' وہ شخص گیا اور اس نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا' پھر وہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس گیا' دربان نے ان کے لیے دروازہ کھولا اور ان کو حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس لے گیا، حضرت عثمانؓ نے اس کو اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا اور پوچھا' تمہارا کیا کام ہے؟ اس نے اپنا کام ذکر کیا' حضرت عثمانؓ نے اس کا کام کر دیا اور فرمایا: جب بھی تمہیں کوئی کام ہو تو تم میرے پاس آ جانا' پھر وہ شخص حضرت عثمانؓ کے پاس چلا گیا اور جب اس کی حضرت عثمان بن حنیفؓ سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ

کو جزاء خیر دے' حضرت عثمان ؓ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور میرے معاملہ میں غور نہیں کرتے تھے حتی کہ آپ نے ان سے میری سفارش کی' حضرت عثمان بن حنیف ؓ نے کہا: بخدا! میں نے حضرت عثمان ؓ سے کوئی بات نہیں کی، لیکن ایک مرتبہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں موجود تھا' آپ کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور اس نے اپنی نابینائی کی آپ سے شکایت کی' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم اس پر صبر کرو گے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے اور مجھے بڑی مشکل ہوتی ہے' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا: تم وضو خانے جاؤ اور وضو کرو' پھر دو رکعت نماز پڑھو' پھر ان کلمات سے دعا کرو' حضرت عثمان بن حنیف ؓ نے کہا: ابھی ہم الگ نہیں ہوئے تھے اور نہ ابھی زیادہ باتیں ہوئی تھیں کہ وہ نابینا شخص آیا در آں حالیکہ اس میں بالکل نابینائی نہیں تھی، یہ حدیث صحیح ہے۔ [۱]

میں (محمد طاہر) کہتا ہوں کہ افضل یہ ہے کہ سیدھی اللہ سے دعا مانگی جائے بغیر وسیلہ کہ لیکن اگر کوئی وسیلہ کے ساتھ مانگے تو بھی جائز ہے۔ وسیلہ سے مراد صرف وسیلہ ہو یہ نہ ہو کہ انہی (انبیاء اور صالحین) سے اپنی دعا مانگنی شروع کر دیں ورنہ شرک ہوگا۔

تیسرا حکم جہاد کا ہے جہاد دو قسم کا ہے ایک جہاد مع الکفار ہے اور دوسرا جہاد مع النفس ہے اور یہ آخری جہاد پہلے سے زیادہ ضروری ہے اور سخت بھی ہے چنانچہ جب ایک بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفار کے خلاف جہاد سے واپس ہوئے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ارشاد فرمایا۔

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاکبر۔

۱۔ حافظ زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی منذری متوفی ٦٥٦ ھ نے "الترغیب والترہیب" (ج ۱ ص ٤٧٦۔ ٤٧٤ 'مطبوعہ دار الحدیث' قاہرہ' ١٤٠٧ ھ) میں اور حافظ الہیثمیؒ نے مجمع الزوائد (ج ۲ ص ٢٧٩ 'مطبوعہ بیروت) میں اس حدیث کو بیان کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

"واپس ہوئے ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف"

ای الجهاد مع النفس یعنی نفس کے ساتھ جہاد کو بڑا فرمایا اور کفار کے ساتھ جہاد کو چھوٹا جہاد فرمایا۔

کافر ایسا دشمن ہے جس کا مقابلہ تیر و تفنگ سے ہوسکتا ہے قلعہ و حصار سے ہوسکتا ہے اور اگر یہ دونوں طریقے کامیاب نہ ہوسکیں تو انسان حفاظت جان کے لیے راہ فرار اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک سخت سے سخت دشمن اے انسان تیرا نفس ہے جو تیرے بدن میں ہے اس سے نہ تجھے قلعہ و حصار بچا سکتا ہے نہ تیر و تفنگ، نہ راہ فرار بلکہ اس سے نجات کا ہتھیار اگر ہے تو استغفار ہے۔

دیوی، دیوتا، مزار، قبر ولی، پیر، تعزیہ یا اور کسی چیز کو حاجت روا مشکل کشا سمجھنا، ان کی نذر نیاز دینا اور ان کے سامنے سجدہ کرنا شرک ہے۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝۵

ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

(اهدنا): تو ہمیں ہدایت دے، تو ہماری رہنمائی فرما، یہ ہدایۃ سے امر کا صیغہ ہے امام راغب اصفہانی نے ہدایت کی جو تشریح فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقصود کی طرف لطف و مہربانی کے ساتھ کسی شخص کی رہنمائی کرنے کو ہدایت کہتے ہیں۔ [۱]

صراط مستقیم کیا ہے؟

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم کتاب اللہ ہے۔ ابن ابی حاتمؒ اور ابن جریرؒ نے بھی روایت

۱۔ (المفردات: ۵۳۸)

کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی، حکمتوں والا ذکر اور سیدھی راہ یعنی صراط مستقیم یہی اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مسند احمد ترمذی میں حضرت علیؓ کا قول بھی یہی ہے اور مرفوع حدیث کا بھی موقوف ہونا ہی زیادہ مشابہ ہے واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہؓ سے بھی یہی روایت ہے ابن عباسؓ کا قول ہے کہ جبرائیل (علیہ السلام) نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آیت (اھدنا الصراط مستقیم) کہئے یعنی ہمیں ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین قیم کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔ آپ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو ہر اس چیز سے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے زیادہ وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہؒ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلمؒ کا قول ہے کہ صراط مستقیم اسلام ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ صراط مستقیم کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں، ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں، صراط مستقیم کے دروازے پر ایک پکارنے والا مقرر ہے، جو کہتا ہے کہ اے لوگو! تم سب کے سب اسی سیدھی راہ پر چلے جاؤ، ٹیڑھی ترچھی ادھر ادھر کی راہوں کو نہ دیکھو نہ ان پر جاؤ۔ اور اس راستے سے گزرنے والا کوئی شخص جب ان دروازوں میں سے کسی ایک کو کھولنا چاہتا ہے تو ایک پکارنے والا کہتا ہے خبردار اسے نہ کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ سے الگ ہو جاؤ گے اور صراط مستقیم سے ہٹ جاؤ گے۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور دروازے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور

راستے کے اوپر سے پکارنے والا زندہ ضمیر ہے جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے۔ یہ حدیث ابن ابی حاتمؒ ابن جریرؒ ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور اس کی اسناد حسن صحیح ہیں واللہ اعلم۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں اس سے مراد حق ہے۔ ان کا قول سب سے زیادہ مقبول ہے اور مذکورہ اقوال کا کوئی مخالف نہیں۔ ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں اس سے مراد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے بعد کے آپ کے دونوں خلیفہ ہیں۔ ابوالعالیہؒ اس قول کی تصدیق اور تحسین کرتے ہیں دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے دونوں خلفاء صدیق وفاروق کا تابعدار حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع ہے اور اسلام کا تابع قرآن کا مطیع ہے اور قرآن اللہ کی کتاب اس کی طرف کی مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے۔ لہٰذا صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ فالحمدللہ۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں۔ صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چھوڑا۔ امام ابوجعفر بن جریرؒ کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ ہم کو توفیق دی جائے اس کی جو اللہ کی مرضی کی ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو اور ان پر انعام کیا ہو، صراط مستقیم یہی ہے۔ [۱]

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے لیے ایک خط کھینچا، پھر فرمایا: "یہ اللہ کا راستہ ہے۔" پھر اس کے دائیں اور بائیں چند خطوط کھینچے اور فرمایا: "یہ (شیطان کے) راستے ہیں، ان میں سے ہر ایک راستے پر ایک شیطان ہے، جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔"

۱۔ تفسیر ابن کثیر سورہ فاتحہ آیت ۵

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾[الأنعام:۱۵۳]
"اور یہ کہ بیشک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمہیں دیا ہے، تاکہ تم بچ جاؤ۔"[۱]

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۝۶﴾

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔

ثعلبیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ لفظ آیت "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" چھٹی آیت ہے۔[۲]

انعام یافتہ لوگوں کا راستہ:

(صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) ان الفاظ میں صراط مستقیم کی تعیین کر دی گئی۔ صراط مستقیم (سیدھا راستہ) کیا ہے جتنی جماعتیں اور قومیں دنیا میں بستی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہدایت پر ہی سمجھتے ہیں، لیکن وہ کونسا راستہ ہے جسے سیدھا راستہ مانا جائے اور جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور آخرت میں نجات ہوگی۔ اس کے بتانے کے لیے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا راستہ صراط مستقیم ہے۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ یہ حضرات کون ہیں ان کا ذکر سورہ نساء کی اس آیت میں ہے۔

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ

۱۔[مستدرک حاکم:۲/۲۳۹، ح:۲۹۳۸۔ مسند أحمد:۱/۴۳۵، ح:۴۱۴۲]
۲۔تفسیر الدرمنثور السیوطی

الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓـئِكَ رَفِيْقًا) (اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے یہ اشخاص ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں) اس سے واضح ہو گیا کہ ان حضرات پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ سورہ فاتحہ میں انہی حضرات کے راستہ کو صراط مستقیم یعنی صحیح اور سیدھا راستہ بتایا ہے۔

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے وہ گزشتہ امتوں میں سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ امام ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے: ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے اپنی اطاعت اور عبادت کا انعام کیا ہے جو ملائکہ، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، جنہوں نے تیری اطاعت اور عبادت کی۔ [۱]

یہ سابق انعام یافتہ لوگوں کی سیرتوں کا اجمالی بیان ہے اور سب سے زیادہ انعام حضرت سید المرسلین و سیدنا محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کیا گیا ہے اور ان کی سیرت تمام انبیاء سابقین کی سیرتوں کی جامع، کامل، اتم اور اکمل ہے اور یہ سارا قرآن انہی کی سیرت کا بیان ہے اور اس کی تفصیل آپ کی احادیث اور سنت میں ہے، اس لیے قرآن اور سنت ہی دراصل صراط مستقیم ہے، اس لیے جو شخص انعام یافتہ نفوس قدسیہ کی صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہو وہ قرآن اور سنت کو دانتوں سے پکڑ لے اور اس پر پورا پورا عمل کرے۔

۱۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۵۹۔۵۸، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷ ﴾

نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔

مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں

(آیت) "مغضوب" کا معنی:

علامہ راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: غضب کا معنی ہے: انتقام کے ارادے سے دل کے خون کا کھولنا اور جوش میں آنا، اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: غضب سے بچو کیونکہ یہ ایک انگارہ ہے جو بنو آدم کے دلوں میں دہکتا ہے کیا تم غضبان شخص کی گردن کی پھولی ہوئی رگوں اور اس کی سرخ آنکھوں کو نہیں دیکھتے، اور جب اس لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے صرف انتقام مراد ہوتا ہے۔[۱]

امام ابن جریرؒ نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت عدی بن حاتمؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے روایت کیا ہے کہ (آیت) "المغضوب علیہم" سے مراد یہود ہیں۔[۲]

"ضالین" کے معنی:

علامہ راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: ضلال کے معنی ہیں: طریق مستقیم سے عدول اور اعراض کرنا، اس کی ضد ہدایت ہے۔[۳]

۱۔ (المفردات ص ۳۶۱، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ، ایران، ۱۳۴۲ھ)

۲۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۶۲۔۶۱، مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

۳۔ (المفردات ص ۱۹۸۔۱۹۷، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ، ایران)

امام ابن جریرؒ تے ہیں:

حضرت ابن مسعودؓ اور کئی اصحابؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
(آیت) ”الضالین“ سے مراد نصاری ہیں۔ [۱]

ہر وہ شخص جو سیدھے راستہ سے انحراف کرے اس کو عرب ضال کہتے ہیں' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو ضالین فرمایا' کیونکہ انہوں نے سیدھے راستہ سے انحراف کر کے غلط راستہ اختیار کر لیا۔

اس آیت میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم عمومی حیثیت سے تمام مغضوب اور گمراہ قوموں کے راستے سے بچنے کی دعا کریں، لیکن خصوصیت سے جن قوموں کی طرف اشارہ ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ ”مغضوب علیھم“ سے مراد خاص طور پر یہود ہیں۔ قرآن مجید میں بار باران پر غضب نازل ہونے کا ذکر ملتا ہے، مثلاً ارشاد فرمایا: (وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ)[البقرۃ:٦١] ”اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کی طرف سے بھاری غضب کے ساتھ لوٹے۔“ اور فرمایا: (فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ)[البقرۃ:٩٠] ”پس وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔“ اور فرمایا: (ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ)[آل عمران:١١٢] ”ان پر ذلت مسلط کر دی گئی جہاں کہیں وہ پائے جائیں مگر اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ کے ساتھ۔“

”ضآلّین“ سے بالخصوص عیسائی مراد ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا

۱۔(جامع البیان ج۱ص٦٤'مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت'١٤٠٩ھ)

عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ)[المائدة:۷۷] ”کہہ دے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھو اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔“

سیدنا عدی بن حاتمؓ بیان کرتے ہیں کہ میں عقرب میں مقیم تھا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکر نے میری پھوپھی اور چند لوگوں کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب یہ سب لوگ ایک قطار میں آپ کے سامنے کھڑے کر دیے گئے تو میری پھوپھی نے کہا، اے اللہ کے رسول! میری خبر گیری کرنے والا دور جا چکا ہے، اولاد جدا ہو چکی ہے اور میں عمر رسیدہ بڑھیا ہوں، میرا کوئی خدمت کرنے والا نہیں، آپ مجھ پر احسان کیجیے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا۔ آپ نے دریافت فرمایا: ” تیری خبر گیری کرنے والا کون ہے؟“ اس نے جواب دیا، عدی بن حاتم۔ فرمایا: ” وہی جو اللہ اور اس کے رسول سے بھاگتا پھرتا ہے؟“ اس خاتون کا بیان ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ پر احسان (فرماتے ہوئے مجھے آزاد) کر دیا۔ جب آپ لوٹ کر دوبارہ تشریف لائے تو آپ کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، ان کے خیال میں وہ سیدنا علیؓ تھے۔ آپ نے فرمایا: ”ان سے سواری طلب کر لو۔“ چنانچہ میری پھوپھی نے سواری طلب کر لی جو اسے دے دی گئی۔ (عدی بیان کرتے ہیں کہ) میری پھوپھی میرے پاس آئی تو اس نے کہا کہ تو نے ایسا کام کیا ہے جو تیرا باپ کبھی نہ کرتا، تو ان کے پاس خوف و رغبت رکھتے ہوئے جا، کیونکہ فلاں آدمی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا تو آپ نے اسے اس قدر عطا فرمایا اور فلاں آیا تو آپ نے اسے اس قدر نوازا۔ بہر حال یہ سن کر میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اس وقت آپ کی خدمت میں ایک عورت اور کچھ بچے بھی موجود تھے۔ سیدنا

عدی نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان کی قرابت داری بھی بیان کی۔ (عدی کہتے ہیں) آپ سے ملاقات کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ آپ قیصر و کسریٰ کی طرح کے بادشاہ نہیں (بلکہ اللہ کے نبی ہیں) ،آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: "اے عدی بن حاتم! کیا تو "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہنے سے بھاگ رہا ہے؟ کیا اللہ کے سوا بھی کوئی الٰہ ہے؟ کیا تو "اللہ اکبر" کہنے سے راہ فرار اختیار کر رہا ہے؟ کیا اللہ عزوجل سے بڑا بھی کوئی اور ہے؟" (آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہ ارشادات سن کر) میں مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کو اس قدر مسرت ہوئی کہ چہرہ انور گلنار ہو گیا، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بلاشبہ (الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ) یہود اور (وَلَا الضَّالِّينَ) نصاریٰ ہیں۔"[۱]

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طور طریقے اپنا لو گے بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے (یعنی ہر چیز میں ان کی پیروی کرو گے)، حتیٰ کہ اگر وہ کسی سانڈھے کے بل میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم اس میں بھی ان کی اتباع و پیروی کرو گے۔" ہم (صحابہ) نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کیا ان لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تو اور کون ہیں؟"[۲]

آمین کہنا

اس سورہ کے ختم پر آمین کہنا مسنون ہے، آمین کے معنی ہیں "اے اللہ ایسا ہی کر، اے اللہ تو قبول فرما"

۱۔[مسند أحمد: ٤/٣٧٨، ٣٧٩، ح: ١٩٤٠٠]

۲۔[بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لتتبعن سنن من کان قبلکم: ٧٣٢٠۔ مسلم، کتاب العلم، باب اتباع سنن الیھود والنصاریٰ: ٢٦٦٩]

پس سورہ فاتحہ کے خاتمہ پر آمین کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ جو ہم نے تجھ سے مانگا ہے وہی کر دے یعنی ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت فرما، اور اہل انعام کے راستہ پر چلا اور اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے الگ رکھ، لفظ آمین کے بارہ میں تمام مفسرین اور علمائے محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ لفظ نہ جزو قرآن ہے اور نہ جزو سورہ فاتحہ ہے اسی لیے قرآن شریف میں اس سورہ فاتحہ کے بعد آمین لکھی نہیں جاتی بلکہ تمام دعاؤں کے بعد آمین کہنا مسنون ہے اور اجابت دعاء کے لحاظ سے ضروری ہے۔

علامہ ابن منظور افریقی ؒ لکھتے ہیں:

یہ وہ کلمہ ہے جو دعا کے بعد کہا جاتا ہے' یہ اسم اور فعل سے مرکب ہے اور اس کا معنی ہے: "اللھم استجب لی "۔ اے اللہ! میری دعا کو قبول فرما" اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون اور اس کے حامیوں کے لیے دعاء ضرر کی اور فرمایا:

(آیت) " رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلَىٰٓ أَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ "۔ (یونس: ۸۸) اے ہمارے رب! ان کے اموال کو تباہ و برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔

جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ دعا کی تو حضرت ہارون (علیہ السلام) نے کہا: آمین۔

ایک قول یہ ہے کہ آمین کا معنی ہے: اسی طرح ہوگا۔ زجاج نے کہا ہے: اس میں دو لغتیں ہیں: امین اور آمین۔ ابو العباس نے کہا ہے کہ آمین عاصین کی طرح جمع کا صیغہ ہے' لیکن یہ صحیح نہیں ہے' کیونکہ حسن سے منقول ہے کہ آمین اللہ عزوجل کے اسماء میں سے ایک اسم ہے' مجاہد نے بھی کہا ہے کہ یہ اللہ کا ایک اسم ہے اور یہ یا اللہ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد "استجب" مقدر ہے' ازھری نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آمین رب العالمین کی اپنے بندوں پر مہر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کی آفات اور بلیات کو آمین سے دور کر دیتا ہے جیسے جب کسی لفافے پر مہر لگا دی جائے تو اس مہر کی وجہ سے اس میں فاسد اور ناپسندیدہ چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ امین جنت میں ایک درجہ ہے، ابوبکرؒ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ آمین کہنے والے کو جنت میں ایک درجہ ملے گا۔ (۱)

نماز میں آمین کہنے کے متعلق مذاہب اربعہ:

علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس الرملی الشافعیؒ لکھتے ہیں:

سورہ فاتحہ یا اس کے قائم مقام کسی دعا کے بعد کچھ وقفہ سے آمین کہنا سنت ہے، خواہ وہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں، لیکن نماز میں یہ بہت زیادہ مستحب ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سورہ فاتحہ کی قرات سے فارغ ہوتے تو بلند آواز کے ساتھ آمین کہتے اور الف کو کھینچ کر (دراز کر کے) آمین کہتے۔ (۲)

علامہ محمد بن عبداللہ خرچی مالکیؒ لکھتے ہیں:

"ولا الضالین" کے بعد آہستہ آواز کے ساتھ آمین کہنا مستحب ہے، سری نماز میں صرف امام آمین کہے اور جہری نماز میں امام اور مقتدی دونوں پست آواز کے ساتھ آمین کہیں کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا میں اصل

۱۔ (لسان العرب ج ۱۳ ص ۲۷۔۲۶ مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ، قم، ایران ۱٤۰۵ھ)

۲۔ (نہایۃ المحتاج ج ۱ ص ٤۸۹۔٤۸۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱٤۱٤ھ)

یہ ہے کہ پست آواز کے ساتھ کی جائے۔ [۱]

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

سنت یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام اور مقتدی جہراً آمین کہیں اور سری نمازوں میں دونوں سراً آمین کہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک آمین آہستہ کہیں' ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہ آواز بلند آمین کہی اور آپ نے امام کے آمین کہنے کے وقت آمین کہنے کا حکم دیا' اگر امام نے بلند آواز سے آمین نہ کہی تو امام کی آمین پر مقتدی کی آمین نہیں ہو سکے گی۔ [۲]

علامہ حصکفی حنفیؒ لکھتے ہیں:

امام اور مقتدی پست آواز سے آمین کہیں خواہ سراً ہو یا جہراً اور جس حدیث میں یہ ہے کہ جب امام آمین کہے تو آمین کہو یہ پست آواز سے آمین کہنے کے منافی نہیں ہے' کیونکہ یہ معلوم اور متعین ہے کہ "ولا الضالین" کے بعد آمین کہی جاتی ہے' اس لیے مقتدی کا آمین کہنا' امام سے سننے پر موقوف نہیں ہے' کیونکہ سورہ فاتحہ کے اخیر میں آمین کہی جاتی ہے' حدیث میں ہے: جب امام (آیت) "ولا الضالین" کہے تو آمین کہو۔ [۳]

آمین کہنے کی فضیلت میں احادیث:

امام بخاری روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ

۱۔ (الخرشی علی مختصر خلیل ج۱ ص ۲۸۲' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

۲۔ (المغنی ج۱ ص ۲۹۰' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

۳۔ (درمختار مع حاشیۃ الطحطاوی' ج۱ ص ۲۲۰۔۲۱۹' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

وسلم) نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص آمین کہتا ہے تو آسمان میں فرشتے (بھی) آمین کہتے ہیں، پس جب ایک فریق کی آمین دوسرے کے موافق ہو جائے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (۱)

امام ابن ماجہؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابو درداءؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے پس پست دعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے، جب بھی وہ اپنے بھائی کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے پاس کھڑا ہوا ایک فرشتہ آمین کہتا ہے اور وہ فرشتہ اس کے لیے بھی وہی دعا کرتا ہے۔ (۲)

امام ابن ماجہؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہود تم سے کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا وہ تم سے آمین پر حسد کرتے ہیں سو تم بہ کثرت آمین کہا کرو۔ (۳)

آمین بالجہر کے متعلق احادیث:

امام ابوداؤدؒ روایت کرتے ہیں: حضرت وائل بن حجرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ

۱۔ (صحیح بخاری ج۱ ص ۱۰۸، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ) اس حدیث کو امام مسلم (صحیح مسلم ج۱ ص ۱۷۶)، امام ابوداؤد (سنن ابوداؤد ج۱ ص ۱۳۰)، امام نسائی (سنن نسائی ج۱ ص ۱۴۷)، امام مالک (موطا امام مالک ص ۶۹)، اور امام احمد (مسند احمد ج۲ ص ۴۵۹) نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۰۸، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی) اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج۱ ص ۱۹۰، ج ۶ ص ۴۵۲ مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

۳۔ (سنن ابن ماجہ ص ۶۱، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

وآلہ وسلم)(آیت) "ولا الضالین" پڑھتے تو بہ آواز بلند فرماتے: آمین۔ (۱)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے' اس میں "رفع بھا صوتہ" کی بجائے "مد بھا صوتہ" (آمین کو مد کے ساتھ پڑھا) ہے۔ (۲)

نیز امام ابوداؤد رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اقتداء میں نماز پڑھی تو آپ نے بہ آواز بلند آمین کہی۔ (۳)

امام نسائی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اقتداء میں نماز پڑھی' آپ نے اللہ اکبر کہہ کر کانوں کے بالمقابل رفع یدین کیا' پھر آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی اور اس سے فارغ ہو کر بہ آواز بلند آمین کہی۔ (۴)

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے آمین کہنا ترک کر دیا ہے حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب (آیت) "ولا الضالین" پڑھتے تھے تو آمین کہتے تھے جس کو صف اول والے سنتے تھے' پھر آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔ (۵)

اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس میں یہ نہیں ہے کہ آمین سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔ (۶)

۱۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵۔۱۳٤ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)
۲۔ (جامع ترمذی ص ٦٣' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)
۳۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳٥ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)
۴۔ (سنن نسائی ج ۱ ص ۱٤٠ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)
۵۔ (سنن ابن ماجہ ص ٦١' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)
٦۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳٥ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱٤٠٦ھ)

فقہاء احناف اور فقہاء مالکیہ کے نزدیک یہ تمام احادیث ابتداء امر اور تعلیم پر محمول ہیں۔

آمین بالسر کے متعلق احادیث:

(1) اللہ تبارک و تعالیٰ کا اِرشاد ہے:﴿اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ ترجمہ: تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[١]

وضاحت: مذکورہ آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آہستہ دُعاء کرنے کا حکم دیا ہے

(1) حضرت عطاؒ فرماتے ہیں: آمین کہنا دُعاء ہے۔[٢]

(2) حضرت ہارونؑ نے حضرت موسیٰؑ کی دُعاء پر جو آمین کہا تھا اُس کو بھی قرآن کریم میں "دُعاء" قرار دیا گیا ہے۔[٣]

امام مسلمؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب قرآن پڑھنے والا (آیت) "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے اور اسکے پیچھے (نمازی) آمین کہے اور اس کا قول آسمان والوں کے موافق ہوجائے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔[٤]

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ فرشتوں کی موافقت جہر سے نہیں اخفاء سے حاصل ہوگی۔

١۔ (الأعراف:55، آسان ترجمہ قرآن)

٢۔ (بخاری:1/156)

٣۔ (یونس:89) (تفسیر بغوی)

٤۔ (صحیح مسلم ج١ ص١٧٦، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ١٣٧٥ھ)

امام ترمذیؒ روایت کرتے ہیں: حضرت وائل بن حجرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (آیت) "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" پڑھا پھر کہا: آمین اور پست آواز سے کہا۔ (١)

حافظ زیلعیؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ابوداؤدؒ، وطیالسی اور امام ابویعلی موصلیؒ نے اپنی مسانید میں، امام طبرانیؒ نے اپنی معجم میں اور امام دارقطنیؒ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ (٢)

امام بغویؒ روایت کرتے ہیں: شعبہ نے سلمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آمین کو آہستہ کہا۔ (٣)

ہر چند کہ امام بغویؒ نے اس کے مقابلہ میں سفیان کی روایت کو زیادہ صحیح کہا ہے جس میں "مد بھا صوتہ" ہے "آمین کو کھینچ کر پڑھا" لیکن مد کے ساتھ پڑھنا آہستہ پڑھنے کے خلاف نہیں ہے، نیز شعبہ کی روایت کو بھی انہوں نے صحیح کہا ہے۔

حضرت شُعبہؒ سے مروی ہے کہ سلمہ بن کُہیلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حُجر ابوالعنبَسؒ سے سنا ہے وہ فرما رہے تھے کہ میں نے علقمہ بن وائلؒ سے سنا، وہ (اپنے والد) حضرت وائل بن حُجرؓ سے نقل کرتے ہیں جبکہ (حضرت حُجر ابوالعنبَس کے قول کے مطابق) میں نے خود بھی حضرت وائل بن حُجرؓ سے سنا ہے کہ اُنہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نے (سورۃ الفاتحہ کے اختتام پر) ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّينَ﴾ پڑھا تو آہستہ آواز میں آمین کہا۔ (٤)

١۔ (جامع ترمذی ص ٦٣، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

٢۔ (نصب الرایہ ج١ ص ٣٦٩، مطبوعہ مجلس علمی، سورت ھند ١٣٥٧ھ)

٣۔ (شرح السنۃ ج٢ ص ٢٠٨، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت ١٤١٢ھ)

٤۔ (مسند ابوداؤد الطیالسی: 1117)

حافظ سیوطیؒ بیان کرتے ہیں: حضرت ابووائلؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ (نماز میں) "بسم اللہ الرحمن الرحیم' اعوذ باللہ من الشیطن الرحیم" اور آمین کو بلند آواز کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ ①

حضرت ابراہیم نخعیؒ حضرت عمرؓ کا یہ اِرشاد نقل فرماتے ہیں کہ چار چیزیں امام آہستہ کہے گا: تعوّذ، تسمیہ ،آمین اور اللّٰھم ربنا لک الحمد۔ ②

حضرت ابووائل فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تسمیہ تعوّذ اور آمین کو بلند آواز سے نہیں کہا کرتے تھے۔ ③

مشہور تابعی حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: پانچ چیزیں آہستہ آواز میں کہیں گے: ثناء، تعوذ، تسمیہ، آمین اور تحمید۔ ④

"آمین" قرآن مجید کا جز نہیں ہے:

علامہ آلوسی لکھتے ہیں: اس پر اجماع ہے کہ آمین قرآن مجید کا جز نہیں ہے' اسی وجہ سے سورہ فاتحہ اور آمین کے درمیان تھوڑا سا وقفہ کیا جاتا ہے' مجاہد سے یہ منقول ہے کہ آمین سورت کا جز ہے لیکن یہ قطعا باطل قول ہے' مصحف عثمان اور دیگر مصاحف میں آمین کو نہیں لکھا جاتا' اور متعدد علماء نے یہ کہا کہ آمین کو قرآن کا جز ماننا کفر ہے۔ ⑤

۱۔(جامع الاحادیث الکبیر ج ۱۷ ص ۴٦۷ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

۲۔(کنز العمال:22893)

۳۔"۔(طبرانی کبیر:9304)

۴۔۔(مصنف عبدالرزاق:2597)

۵۔(روح المعانی ج ۱ ص ۹۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ:

امام مسلمؒ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس شخص کی نماز (کامل) نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ کو نہ پڑھے۔ [١]

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

اس حدیث سے نماز میں سورہ فاتحہ کی قرات کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور اس سورت کا نماز میں پڑھنا متعین ہے' اس کے سوا کوئی دوسری سورت اس سے کفایت نہیں کرتی الا یہ کہ کوئی شخص اس کی قرات سے عاجز ہو' یہ امام مالکؒ' امام شافعیؒ، جمہور فقہاء صحابہ کرامؓ تابعین اور بعد کے علماء کا مذہب ہے' اور امام ابوحنیفہؒ اور ایک قلیل جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے' بلکہ قرآن مجید کی کسی ایک آیت کا پڑھنا واجب ہے' کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو وہ پڑھو۔ [٢]

جمہور کی دلیل ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: ام القرآن (سورہ فاتحہ) کے بغیر (کامل) نہیں ہوتی۔ اگر انہوں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کامل نہیں ہوتی تو یہ خلاف ظاہر ہے (بلکہ یہی ظاہر ہے کیونکہ حدیث میں ہے: جس نے سورہ فاتحہ کو نہیں پڑھا اس کی نماز ناقص ہے' یہ کلمہ

١۔(صحیح مسلم ج ١ ص ١٦٩' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٧٥ھ)

٢۔(علامہ نوویؒ نے یہ صحیح نہیں لکھا' امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض نہیں ہے کیونکہ فرضیت قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ دلیل سے حاصل ہوتی ہے اور اس حدیث کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہتے ہیں' امام اعظم کا مذہب ہم انشاءاللہ عنقریب بیان کریں گے۔)

آپ نے تین بار فرمایا اور ناقص کے مقابلہ میں کامل ہے' اگر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہوتا تو آپ فرماتے: جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز باطل ہے' اور اس کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے: وہ نماز کافی نہیں ہوتی جس میں سورہ فاتحہ کی قرات نہ کی جائے' اس حدیث کو امام ابن خزیمہؒ نے اپنی صحیح میں سند صحیح کے ساتھ بیان کیا ہے' اور ابو حاتم بن حبان نے بھی بیان کیا ہے' اور جس حدیث میں ہے: جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو وہ پڑھو' وہ سورہ فاتحہ پڑھنے پر محمول ہے کیونکہ اس کا پڑھنا آسان ہے۔ (یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں لفظ "ما" ہے جو عام ہے۔)

اس حدیث میں امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کے مذہب پر دلیل ہے' جو یہ کہتے ہیں کہ امام' مقتدی اور منفرد سب پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے' مقتدی پر سورہ فاتحہ پڑھنے کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے کسی نے کہا: ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو کیا کریں؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا: سورہ فاتحہ کو دل میں پڑھو' اس کا معنی ہے: اس کو چپکے چپکے پڑھو جس کو تم خود سنو اور بعض مالکیہ وغیر نے جو اس کا یہ محمل بیان کیا ہے کہ سورہ فاتحہ کے معانی میں تدبر کرو یہ غیر مقبول ہے' کیونکہ قرات کا اطلاق صرف زبان کی اس حرکت پر ہوتا ہے جو سنائی دے اسی وجہ سے اس پر اتفاق ہے کہ جنبی اور حائض اگر زبان کی حرکت کے بغیر قرآن مجید کے معانی میں تدبر کریں تو اس پر قرات کا اطلاق نہیں ہوگا۔ [1]

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ:

۱۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ) علامہ نووی کا یہ جواب بھی صحیح نہیں ہے، زبان کی جو حرکت سنائی دے خواہ آہستہ یا زور سے وہ قرات لفظی ہے قرات نفسی نہیں ہے' قرات نفسی کا معنی یہی ہے کہ الفاظ کے معانی میں تدبر کیا جائے، جیسا کہ علامہ نوویؒ نے بعض مالکیہ سے نقل کیا ہے اور اگر جنبی قرآن کے معنی میں تدبر کرے تو اس کو قرات نفسی کہہ سکتے ہیں۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے' یہ امام مالک' امام اوزاعی اور امام شافعی کا مذہب ہے' امام احمد سے ایک روایت ہے کہ نماز کی صرف دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے' نخعی' ثوری اور امام ابوحنیفہؒ سے بھی اسی طرح روایت ہے' کیونکہ حضرت علیؓ نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قرات کرو اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح کرو' نیز اگر باقی رکعات میں قرات واجب ہوتی تو جہری نمازوں میں ان میں جہر سے قرات واجب ہوتی' حسن بصری سے روایت ہے کہ اگر ایک رکعت میں قرات کرلی تو کافی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) فاقرء وا ما تیسر من القرآن" (المزمل: ۲۰) تو قرآن سے جتنا (تم پر) آسان ہو پڑھ لیا کرو۔

اور امام مالکؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر تین رکعات میں قرات کرلی تو کافی ہے کیونکہ وہ نماز کا اکثر حصہ ہیں، ہماری دلیل یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے: حضرت ابوقتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ظہر کی پہلی دو رکعات میں سورہ فاتحہ اور کوئی اور سورت پڑھتے تھے' پہلی رکعت میں زیادہ قرات کرتے اور دوسری میں کم' اور کبھی ہم کو قرات سناتے تھے' اور دوسری دو رکعت میں صرف سورہ فاتحہ پڑھتے تھے' نیز امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی روایت ہے: اس طرح نماز پڑھو' جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو' اور حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے' اس کی نماز (کامل) نہیں ہوتی' اور حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت عبادہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کو پڑھیں' نیز جس شخص نے اچھی طرح نماز

پڑھی تھی اس کو جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز کی پہلی رکعت سکھائی تو اس کو فرمایا: تمام رکعات اس طرح پڑھو اور یہ حکم تمام رکعات میں قرات کو بھی شامل ہے' حضرت جابرؓ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت نماز پڑھی اور اس میں قرات نہیں کی تو اس کی یہ نماز صرف امام کے پیچھے ہو سکتی ہے۔(اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے۔) اس حدیث کو امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے' اور اس سے پہلے جو حضرت علیؓ کا اثر بیان کیا گیا ہے اس کی سند میں حارث اعور ہے اور اس کو شعبی نے کذاب کہا ہے' نیز حضرت عمرؓ اور حضرت جابرؓ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ [1]

نیز علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

امام کے لیے مستحب یہ ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے اور آرام کرے تا کہ اس وقفہ میں مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ لیں تا کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھنے میں امام کے ساتھ کھینچا تانی نہ کریں' یہ امام اوزاعیؒ امام شافعیؒ اور اسحاق کا مذہب ہے' امام مالکؒ اور اصحاب رائے نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دو سکتے یاد رکھے ہیں' ایک سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد اور ایک سکتہ (آیت) "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کی قرات کے بعد' عمران نے اس کا انکار کیا اور ان دونوں نے حضرت ابی بن کعب کو خط لکھا' انہوں نے جواب دیا کہ سمرہ کو یہ حدیث محفوظ ہے' اور ابوسلمہ بن عبدالرحمن نے کہا: امام کے لیے دو سکتے ہیں' ان میں سورہ فاتحہ کی قرات کو غنیمت جانو' ایک سکتہ نماز کے شروع کے وقت ہے اور ایک سکتہ جب وہ (آیت) "ولا الضالین" کہتا ہے تو میں اس وقت سورہ

۱۔(المغنی ج۱ص ۲۸۸' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

فاتحہ پڑھ لیتا ہوں اور جب وہ سورت ختم کرتا ہے تو میں رکوع سے پہلے قرات کر لیتا ہوں‘ یہ روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا ان کے نزدیک معروف تھا۔ ۱

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ:

علامہ وشتانی ابی مالکیؒ لکھتے ہیں:

قاضی عیاض مالکیؒ نے بیان کیا ہے کہ اشہب مالکی‘ ابن وہب مالکیؒ اور کوفیوں کا قول یہ ہے کہ امام کے پیچھے کسی حال میں قرات نہ کی جائے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہے۔ ان سے کہا گیا کہ بعض اوقات ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا: اس وقت اپنے دل میں پڑھو۔ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب امام قرات کرے تو اس کے معانی میں تدبر کرو‘ تدبر کرو‘ تابعین کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ امام کے پیچھے کسی حال میں قرات نہ کی جائے‘ وہ کہتے ہیں کہ صرف ہونٹ ہلائے جائیں اور خود کو بھی آواز نہ آئے‘ اور جس نے خود کو سنایا اس نے اچھا کیا‘ امام مالکؒ اور ان کے عام اصحاب اور بہت سے متقدمین نے یہ کہا ہے: مقتدی امام کے ساتھ سری نمازوں میں پڑھے اور جہری نمازوں میں نہ پڑھے‘ امام احمدؒ نے یہ کہا ہے کہ امام کے پیچھے سری اور جہری دونوں نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھے‘ امام شافعی کے اس میں تین قول ہیں‘ ایک قول کوفیین کی طرح ہے، ایک قول امام احمدؒ کی مثل ہے اور ایک قول جمہور صحابہ اور تابعین کی مثل ہے‘ امام احمدؒ اور داؤد ظاہری کے نزدیک سورہ فاتحہ کا سری نمازوں میں پڑھنا فرض ہے‘ ہمارے نزدیک اس میں اختلاف ہے‘ ایک قول

۱۔ (المغنی ج۱ ص ۲۹۱‘ مطبوعہ دار الفکر‘ بیروت‘ ۱۴۰۵ھ)

سنت ہے اور ایک قول مستحب ہے۔ (۱)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء احناف کا نظریہ:

علامہ مرغینانی حنفیؒ لکھتے ہیں:

مقتدی امام کے پیچھے قرات نہ کرے‘ ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا امام ہو‘ تو امام کی قرات اس کی قرات ہے۔ (سنن ابن ماجہ وطحاوی) اور اس پر صحابہ کا اجماع ہے‘ یہ رکن امام اور مقتدی دونوں کے درمیان مشترک ہے‘ لیکن مقتدی کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش رہے اور سنے‘ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: جب امام قرات کرے تو خاموش رہو‘ امام محمد سے ایک روایت یہ ہے کہ احتیاط قرات کرنا مستحسن ہے اور امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک امام کے پیچھے قرات کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس پر وعید ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفیؒ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں تمام نمازیوں کو قرات کرنے کا حکم دیا گیا ہے (آیت) " فاقرءوا ما تیسر منہ " جس قدر قرآن مجید آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھو" اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھی حکم ہے کہ کوئی نماز قرآن مجید پڑھے بغیر نہیں ہوسکتی" لیکن جب حدیث صحیح میں وارد ہے: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے‘ تو اس آیت اور حدیث کے عموم کی تخصیص کرنا واجب ہے جیسا کہ ائمہ ثلاثہ کا قاعدہ ہے‘ اس لیے مقتدی اس حکم کے عموم سے خارج ہے‘ نیز اس پر اجماع ہے کہ رکوع میں نماز کو پانے والا نماز کی رکعت کو پالیتا ہے حالانکہ اس رکعت میں اس نے قرات نہیں کی ہے‘ اس سے معلوم ہوا

۱۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۲ ص ۱۵۰۔۱۴۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ‘ بیروت)

کہ مدرک رکوع بھی قرات کے عمومی حکم سے خارج ہے' اسی طرح جس حدیث میں ہے: اللہ اکبر کہو پھر تم کو جس قدر قرآن یاد ہے پڑھو' یہ بھی مقتدی کے غیر پر محمول ہے تا کہ دلائل میں تطبیق ہو' بلکہ یہ کہا جائے گا کہ مقتدی کے لیے بھی شرعاً قرات ثابت ہے' کیونکہ امام کی قرات مقتدی کی قرات ہے' اگر مقتدی نے قرات کی تو ایک نماز میں دو قراتیں ہو جائیں گی' یہ حدیث متعدد اسانید سے حضرت جابر بن عبداللہؓ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہے' امام دارقطنی' امام بیہقی اور امام ابن عدی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا ضعیف ہے' اور صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے' متعدد راویوں نے اس حدیث کو ارسال سے بیان کیا ہے' ایک سند سے امام ابو حنیفہؒ نے بھی اس کو مرسلاً روایت کیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اکثر اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے اور اس سے صرف نظر کر کے ہم یہ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے سند صحیح کے ساتھ اس حدیث کو مرفوعاً بھی روایت کیا ہے' امام محمد بن الحسن نے اپنی "موطا" میں روایت کیا ہے از ابو حنیفہؒ، از ابو الحسن موسیٰ بن ابی عائشہ از عبداللہ بن شداد از جابرؓ از نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے' اس حدیث کو سفیان' شریک جریر اور ابو الزہیر نے اپنی اپنی اسانید صحیحہ کے ساتھ اپنی اپنی مسانید میں مرفوعاً روایت کیا ہے اور سفیان کی سند امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے' اس لیے مخالفین کا اس حدیث کو مرسل قرار دینے پر اصرار کرنا باطل ہے' کیونکہ اگر ثقہ راوی کسی حدیث میں متفرد ہو تو اس کو قبول کرنا واجب ہے اور رفع ارسال پر زیادتی ہے اور ثقہ اگر متفرد ہو تب بھی اس کی زیادتی مقبول ہوتی ہے' چہ جائیکہ یہاں چار سے زائد ثقہ راوی اس حدیث کو مرفوعاً روایت کر رہے ہیں اور ثقہ راوی کبھی حدیث کی ایک سند کو ارسال سے بیان کرتا ہے اور کبھی اتصال سے' امام ابو عبداللہ حاکم نے اپنی سند کے

ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز پڑھائی' آپ کے پیچھے ایک شخص قرات کررہا تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک صحابی اس کو نماز میں قرات سے روکتے رہے' جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو اس نے صحابہ کرامؓ سے کہا: کیا تم مجھ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے نماز میں قرات کرنے سے منع کرتے ہو؟ وہ دونوں تکرار کرنے لگے' حتی کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا گیا' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرات اس شخص کی ہوتی ہے' امام ابوحنفیہؒ نے ایک روایت سے بیان کیا ہے کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے قرات کی تو اس کو ایک صحابیؓ نے منع کیا' الحدیث' اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کی اصل یہ واقعہ ہے اور حضرت جابرؓ نے کبھی پورا واقعہ بیان کیا اور کبھی صرف اس کا حکم بیان کردیا اور کبھی امام کے پیچھے قرات کی ممانعت کو بیان کردیا۔

اس حدیث کے معارض یہ روایت ہے: مجھ سے قرآن کیوں کھینچا جارہا تھا' اگر کسی مقتدی نے ضرور قرآن پڑھنا ہو تو وہ صرف سورہ فاتحہ پڑھے' اسی طرح امام داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن مجید پڑھا تو آپ پر قرآن پڑھنا دشوار ہوا' جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرآن پڑھ رہے تھے! ہم نے کہا: ہاں! یارسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سوائے سورہ فاتحہ کے اس طرح نہ کرو کیونکہ جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا ہے اس کی سند زیادہ قوی ہے اور اس میں ممانعت علی الاطلاق ہے' اس لیے

قوت سند اور عموم کی وجہ سے وہ حدیث ان احادیث پر مقدم ہے۔

حضرت جابرؓ کی حدیث دیگر احادیث سے موید ہے' ہرچند کہ ان کی اسانید ضعیف ہیں اور صحابہ کرامؓ کے مذاہب سے بھی موید ہے' حتیٰ کہ صاحب "ہدایہ" نے یہ کہا کہ امام کے پیچھے قرات نہ کرنے پر اجماع صحابہ ہے' وہ احادیث حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے ہمارے لئے سنّت کے اُمور کو واضح فرمایا اور ہمیں ہماری نماز (باجماعت) کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ: جب تم نماز پڑھنے لگو تو اپنی صفوں کو درست کرلو، پھر تم میں سے کوئی شخص تمہاری اِمامت کرے، اور جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تم "آمِینَ" کہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعاء قبول فرمائیں گے۔حضرت سلیمان التیمی ؒ حضرت قتادہ سے (مذکورہ حدیث میں) یہ زیادتی نقل کرتے ہیں کہ: جب اِمام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔[۱]

(۲) حضرت ابونُعیم وہب بن کیسانؒ فرماتے ہیں کہ اُنہوں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے سنا، وہ یہ فرمارہے تھے: جس نے نماز پڑھی اور اُس میں سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی تو گویا اُس نے نماز ہی نہیں پڑھی، ہاں! مگر یہ کہ وہ اِمام کے پیچھے ہو (تو نماز ہوجائے گی)۔یہ حدیث "حسن صحیح" ہے۔[۲]

(۳) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے جب امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اُس کے لئے امام کی قرأت ہی کافی ہے، اور جب اکیلے نماز پڑھے تو اُسے قرأت کرنی چاہیے۔حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ

۱۔(مسلم:404)

۲۔(ترمذی:313)

ابن عمرؓ اِمام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔ [۱]

(۴) حضرت عبداللہ بن بحینہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے (نماز کے بعد) اِرشاد فرمایا: کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ (میرے پیچھے) قراءت کی ہے؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: میں بھی کہوں کہ میرے ساتھ قرآن کریم میں جھگڑا کیا جارہا ہے، پس لوگ آپ ﷺ کے اِس فرمان بعد آپ ﷺ کے ساتھ قراءت کرنے سے رُک گئے۔ [۲]

(۵) امام دارقطنیؒ نے اس حدیث کو مرفوعا بیان کیا ہے اور یہ کہا کہ اس کا مرفوع ہونا راوی کا وہم ہے لیکن یہ حکم مرفوع ہے کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سماع پر محمول ہے۔

(۶) امام ابن عدیؒ نے "کامل" میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے' اس حدیث کی سند میں اسماعیل ضعیف راوی ہے' اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔

امام ابن عدیؒ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے' بلکہ اسماعیل کا متابع ہے نضر بن عبداللہؒ، امام طبرانیؒ نے "معجم اوسط" میں نضر بن عبداللہ از حسن اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حسن سے سنداً اور متناً یہی روایت ہے امام طبرانیؒ نے اس حدیث کو حضرت ابن عباسؓ سے بھی مرفوعاً روایت کیا ہے لیکن اس میں کلام ہے۔

(۷) امام طحاویؒ نے "شرح معانی الآثار" میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مقاسمؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ سے سوال کیا تو انھوں نے کہا:

۱۔ (مؤطاء مالک:251) اس کی سند گولڈن ہے

۲۔(مسند امام احمد:22922)

کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے قرات نہ کرو۔

(۸) امام محمد بن حسنؒ نے اپنی "موطا" میں اپنی سند کے ساتھ ابو وائل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا: خاموش رہو' نماز میں صرف ایک شغل ہے اور تمہارے لیے امام کافی ہے اور اسی کتاب میں حضرت سعدؓ کے بعض بیٹوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت سعدؓ نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرے اس کے منہ میں انگارے ڈال دوں، اس کو امام عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے مگر ان کی روایت میں ہے: میں اس کے منہ میں پتھر ڈال دوں۔

(۹) امام محمدؒ نے اپنی "موطا" میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کیا ہے' انہوں نے کہا: جو شخص امام کے پیچھے قرات کرتا ہے کاش! اس کے منہ میں پتھر ہوتے' اس اثر کو امام عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے۔

(۱۰) امام طحاویؒ نے اپنی سند کے ساتھ ابو جمرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا: کیا میں امام کے ہوتے ہوئے قرات کروں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔

"(۱۱) امام ابن ابی شیبہؒ نے اپنی "مصنف' میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا کہ امام کے پیچھے قرات نہ کرو خواہ جہری نماز ہو یا سری۔

(۱۲) امام عبدالرزاقؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرات کی اس نے فطرت میں خطا کی۔

(۱۳) امام نسائیؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال

کیا گیا: کیا ہر نماز میں قرات ہے؟ فرمایا: ہاں! انصار کے ایک شخص نے کہا: قرات واجب ہوگئی، حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں: میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا: جب امام کسی قوم کو نماز پڑھائے تو اس کی قرات قوم کے لیے کافی ہے۔ اگر موخر الذکر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام نہ ہو بلکہ حضرت ابودارداءؓ کا کلام ہو تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پہلے وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ روایت کریں کہ ہر نماز میں قرات ہے، پھر امام کی قرات کو مقتدی کی قرات قرار دیں، یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان کو یہ علم ہو کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقتدی کی قرات کو امام کی قرات قرار دیا ہے۔

اسی (۸۰) کبار صحابہؓ سے امام کے پیچھے قرات کی ممانعت منقول ہے، ان میں حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، کے اسماء شامل ہیں، اور محدثین نے ان تمام صحابہ کرام کے اسماء کو ضبط کیا ہے۔ امام شافعیؒ یہ کہتے ہیں کہ قرات نماز کا ایک رکن ہے اور اس میں امام اور مقتدی دونوں مشترک ہیں، ہم کہتے ہیں کہ دونوں مشترک ہیں لیکن مقتدی کا حصہ قرآن مجید سننا اور خاموش رہنا ہے، کیونکہ قرات سے مطلوب تدبر اور تفکر ہے اور اس پر عمل کرنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) ” كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ۔ (ص:۲۹) (ترجمہ) یہ (قرآن مجید) مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تاکہ وہ اس کی آیات میں غور کریں۔

اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوگا جب وہ قرآن مجید کو سنیں گے جیسے جمعہ کا خطبہ، وعظ اور تذکیر کے لیے مشروع کیا گیا ہے تو اس کا سننا واجب ہے تاکہ اس کا فائدہ حاصل ہو یہ نہیں کہ ہر شخص اپنے نفس کو خطبہ

دینے لگے،اس کے برخلاف باقی ارکان خشوع کے لیے مشروع کئے گئے ہیں اور خشوع رکوع اور سجود سے حاصل ہوتا ہے۔اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ وجہ تو صرف جہری نماز میں درست ہوسکتی ہے اور قرات خلاف الامام کا اختلاف تو سری نمازی میں بھی ہے اس میں یہ فائدہ کس طرح حاصل ہوگا؟اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے سننے کا اور خاموش رہنے کا:

(آیت)"وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ(الاعراف:۲۰۴)

(ترجمہ)اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے

امام مسلمؒ روایت کرتے ہیں:حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:امام قرات کرے تو تم خاموش رہو۔[۱]

امام دارقطنیؒ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:جس نے امام کی پشت سیدھی ہونے سے پہلے امام کو رکوع میں پالیا اس نے نماز(کی رکعت) کو پالیا۔[۲]

میں(محمد طاہر) کہتا ہوں کہ یہ سب جہری نماز کے دلائل ہیں۔اس میں ائمہ ثلاثہ کا موقف مضبوط ہے۔کہ جہری نماز میں بالکل خاموش رہا جائے اور سری نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی جائے۔یہی قرآن وحدیث وجمہور ائمہ کا مضبوط موقف ہے۔

سورۃ البقرۃ

۱۔امام مسلم(رح) نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔(صحیح مسلم ج۱ص۱۷٤،مطبوعہ نور محمد اصح المطابع،کراچی)

۲۔(سنن دارقطنی ج۱ص۳٤۷،مطبوعہ نشر السنۃ،ملتان)

اس میں ۲۸۶ آیات اور تین ہزار ایک سو (۳۱۰۰) کلمات اور پچیس ہزار پانچ (۲۵۵۰۰) حروف اور چار رکوع ہیں۔ (۱)

سورہ بقرہ کا شان نزول

سورہ بقرہ قرآن مجید کی سب سے طویل سورت ہے' اور یہ مدنی سورت ہے' علامہ واحدی نیشاپوریؒ نے لکھا ہے کہ عکرمہؓ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں جو سورت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ سورۃ البقرۃ ہے۔ (۲)

امام ابن الضریسؒ نے فضائل میں، ابوجعفر النحاسؒ نے الناسخ والمنسوخ میں، ابن مردویہ اور بیہقیؒ نے دلائل نبوۃ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ سورہ البقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ ابن مردویہؒ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت کیا ہے کہ سورہ البقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

سورہ بقرہ مدنی ہے، یہ کافی عرصہ تک نازل ہوتی رہی ہے، یہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت ہے اس کی ایک آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور وہ ہے:

(آیت) " وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (البقرہ:۲۸۱)

یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی۔ یہ حجۃ الوداع میں یوم نحر (عیدالاضحیٰ) کو منیٰ میں نازل ہوئی

۱۔ تفسیر ابن عباس

۲۔ (اسباب النزول ص ۱۱)

ہے اور سود کی حرمت کی آیات بھی قرآن مجید کی آخری آیتوں میں سے ہیں۔ [۱]

سورۃ بقرہ کا اجمالی تعارف

مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی نظام حیات' عبادات' سیاسیات' معاشیات' اقتصادیات' اور عمرانیات کے اصول اور احکام بیان کیے گئے ہیں' اس کے بخلاف مکی سورتوں میں اعتقادیات اور اخلاقیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے' کیونکہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی اپنی ریاست قائم ہو چکی تھی' اور نظام مملکت کو چلانے کے لیے جن اصول اور قواعد کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمانوں کی تمدنی زندگی کی فوز و فلاح اور عبادات کے اجتماعی نظام کے لیے جن ہدایات کی احتیاج ہو سکتی ہے وہ سب ان مدنی سورتوں میں نازل کی گئیں۔

اس سورت کا آغاز اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کے بیان سے ہوا ہے، اسی ضمن میں انسانوں کی تین قسمیں یعنی، مومن، کافر اور منافق بیان کی گئی ہیں، پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، تا کہ انسان کو اپنی پیدائش کا مقصد معلوم ہو، اس کے بعد آیات کے ایک طویل سلسلہ میں بنیادی طور پر خطاب یہودیوں سے ہے جو بڑی تعداد میں مدینہ منورہ کے آس پاس آباد تھے ان پر اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں نازل فرمائیں اور جس طرح انہوں نے ناشکری اور نافرمانی سے کام لیا اس کا مفصل بیان ہے، پہلے پارہ کے تقریباً آخر میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا تذکرہ ہے، اس لیے کہ انہیں نہ صرف یہودی اور عیسائی بلکہ عرب کے بت پرست بھی اپنا پیشوا مانتے تھے، ان سب کو یاد دلایا گیا کہ وہ خالص توحید کے قائل تھے اور انہوں نے کبھی کسی قسم کے شرک کو گوارہ

۱۔ (الجامع الاحکام القرآن ج۱ ص ۱۵۲ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

نہیں کیا، اسی ضمن میں بیت اللہ کی تعمیر اور اسے قبلہ بنانے کا موضوع زیر بحث آیا ہے، دوسرے پارہ کے شروع میں اس کے مفصل احکام بیان کرنے کے بعد اس سورت میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق بہت سے احکام بیان فرمائے گئے ہیں جن میں عبادت سے لے کر معاشرت، خاندانی امور اور حکمرانی سے متعلق بہت سے مسائل داخل ہیں۔

سورہ بقرہ کی وجہ تسمیہ:

سورہ بقرہ کا نام بقرہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں بقرہ (گائے) کا ذکر ہے' قرآن مجید کی تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں اور ادنیٰ مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ بعض احادیث سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سورت کو سورہ بقرہ کہنا منع ہے۔ حافظ سیوطیؒ بیان کرتے ہیں: امام بیہقیؒ نے "شعب الایمان" میں سند ضعیف کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سورہ بقرہ نہ کہو' نہ سورہ آل عمران اور نہ سورہ نساء' اسی طرح پورا قرآن' لیکن یوں کہو کہ یہ وہ سورت ہے جس میں بقرہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ وہ سورت ہے جس میں آل عمران کا ذکر کیا جاتا ہے' اسی طرح پورے قرآن کی سورتوں کے متعلق کہو' اور امام بیہقیؒ نے "شعب الایمان" میں سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ سورہ بقرہ نہ کہو لیکن یہ کہو کہ یہ وہ سورت ہے جس میں بقرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔[1]

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں اس طرح سورتوں کا نام رکھنے سے منع کیا گیا تھا' کیونکہ کفار ان سورتوں کا نام لے کر ان کا مذاق اڑاتے تھے' پھر جب اسلام کا غلبہ ہو گیا اور قرآن کریم کا نور ہر طرف پھیل گیا تو یہ ممانعت منسوخ ہو گئی کیونکہ بہ کثرت احادیث اور آثار میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ

۱۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۱۸، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی، ایران)

وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اس سورت پر سورہ بقرہ کا اطلاق کیا ہے۔

حافظ سیوطیؒ بیان کرتے ہیں:

امام ابن ابی شیبہؒ نے "مصنف" میں امام احمدؒ امام مسلمؒ ' امام ابوداؤدؒ ' امام ترمذیؒ ' امام نسائیؒ ، امام ابن ماجہؒ ، اور امام حاکمؒ ، نے تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقیؒ نے اپنی سنن میں اپنی اپنی اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے: حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رمضان کی ایک شب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھی' آپ نے بقرہ شروع کی' میں نے دل میں کہا: شاید آپ پوری سورت ایک رکعت میں پڑھیں گے' پھر آپ نے نساء شروع کی اور اس کو پڑھا' پھر آپ نے آل عمران شروع کی اور اس کو آہستہ آہستہ پڑھا' جب آپ ایسی آیت پڑھتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ سبحان اللہ پڑھتے اور جب آپ سوال کی آیت پڑھتے تو سوال کرتے اور جب تعوذ کی آیت پڑھتے تو اعوذ باللہ پڑھتے۔

امام احمدؒ، امام ابن الضریسؒ ، اور امام بیہقیؒ نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ام المومنین عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ میں ایک شب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھی آپ نے بقرہ' آل عمران' اور نساء کو پڑھا' جب آپ بشارت والی آیت کو پڑھتے تو دعا کرتے اور جب آپ ڈرانے والی آیت کو پڑھتے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے۔

امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، نے "شمائل" میں امام نسائیؒ ، اور امام بیہقیؒ ، نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک شب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے سورہ بقرہ پڑھی، آپ جب بھی کسی رحمت کی

آیت کو پڑھتے تو ٹھہر کر سوال کرتے اور جب بھی کسی عذاب کی آیت کو پڑھتے تو رک کر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے، پھر آپ نے جتنا قیام کیا تھا اتنا ہی رکوع کرتے اور رکوع میں یہ پڑھتے: "سُبۡحَانَ ذِی الۡجَبَرُوتِ وَالۡمَلَکُوتِ وَالۡکِبۡرِیَاءِ وَالۡعَظَمَةِ" پھر اتنا ہی لمبا سجدہ کرتے اور سجدہ میں یہی کلمات فرماتے، پھر کھڑے ہو کر آل عمران پڑھی، پھر ایک ایک سورت پڑھی۔

امام ابوعبیدہؒ، امام احمدؒ، امام حمید بن زنجویہؒ، نے "فضائل القرآن" میں امام ابن الضریسؒ، امام ابن حبانؒ، امام طبریؒ، امام بوذرھرویؒ، نے "فضائل قرآن" میں امام حاکمؒ، اور امام بیہقیؒ، نے اپنی سنن میں اپنی اپنی اسانید کے ساتھ حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قرآن پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے اصحاب کی شفاعت کرنے والا ہوگا، زہرا دین (یعنی) سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھا کرو، کیونکہ یہ قیامت کے دن بادلوں کی طرح آئیں گی، یا صف باندھے ہوئے پرندوں کی طرح آئیں گی، اور اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کریں گی، سورہ بقرہ پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے اور اس کا ترک کرنا حسرت ہے اور بدکار لوگ اس کو پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔[1]

ان احادیث اور آثار میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے سورہ بقرہ، سورہ آل عمران وغیرہ فرمایا ہے، اس سے واضح ہوا کہ سورہ بقرہ کہنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کے آداب میں سے یہ ہے کہ مثلاً رحمت کی طلب کی جائے اور رات کی نفل نمازوں میں اس طرح قرآن مجید پڑھنا جائز ہے اور آپ کی سنت ہے۔

۱۔(الدرالمنثور ج۱ ص۱۸، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی، ایران)

سورۃ بقرہ کے فضائل

(۱) سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، بیشک شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔"[۱]

(۲) سیدنا ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دو جگمگانے والی سورتیں یعنی بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو، کیونکہ وہ دونوں قیامت والے دن اس طرح آئیں گی گویا وہ دو بادل ہوں، یا دو سائبان، یا صف باندھے ہوئے پرندوں کی دو ٹکڑیاں ہوں، وہ اپنے اصحاب کی طرف سے حجت پیش کریں گی۔ سورہ بقرہ پڑھا کرو، اس لیے کہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے، اس کا چھوڑ دینا باعث حسرت ہے اور (یہ ایسی سورت ہے کہ) جادوگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"[۲]

(۳) سیدنا نواس بن سمعانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "قیامت والے دن قرآن اور اہل قرآن جو اس پر عمل کرتے تھے، انھیں لایا جائے گا اور سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران آگے آگے ہوں گی۔" پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دونوں سورتوں کی تین مثالیں دیں، میں ان مثالوں کو تب سے کبھی نہیں بھولا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "وہ دو بادل ہیں، یا دو سیاہ سائبان ہیں جن کے درمیان خوب روشنی ہو رہی ہے، یا قطار باندھے ہوئے پرندوں کی دو ٹکڑیاں ہوں۔ یہ دو سورتیں اپنے اصحاب کے لیے حجت پیش کریں گی (یعنی اپنے اصحاب

۱۔[مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلوٰۃ النافلۃ فی بیتہ۔۔۔الخ: ۷۸۰]

۲۔تفسیر ابن عباس

کے لیے اللہ سے بخشش طلب کریں گی)۔“[۱]

(۴) سیدنا سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”ہر چیز کی ایک کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورہ بقرہ ہے۔ شیطان جب سورہ بقرہ کی آواز سنتا ہے تو اس گھر سے نکل جاتا ہے جس گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت کی جارہی ہو۔[۲]

(۵) سیدنا اسید بن حضیرؓ سے روایت ہے کہ رات کو وہ سورہ بقرہ کی تلاوت کررہے تھے کہ ان کا گھوڑا جو پاس ہی بندھا ہوا تھا، اس نے بدکنا شروع کردیا۔ وہ خاموش ہوگئے تو گھوڑا بھی پرسکون ہوگیا، انھوں نے پھر تلاوت شروع کی تو گھوڑے نے پھر بدکنا شروع کردیا، تو انھوں نے تلاوت ختم کردی، کیونکہ ان کا بیٹا یحییٰ قریب ہی سو رہا تھا اور انھیں خدشہ لاحق ہوا کہ گھوڑا اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ جب بچے کو اٹھا لیا تو آسمان کی طرف دیکھا (فرماتے ہیں) میرے سر کے اوپر بادل سا تھا جس میں قندیلیں تھیں اور وہ فضا میں اوپر جارہا تھا، یہاں تک کہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ صبح ہوئی تو انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اے ابن حضیر! آپ پڑھتے رہتے، اے ابن حضیر! آپ پڑھتے رہتے (تو بہتر تھا)۔“ عرض کی، اے اللہ کے رسول! میں اس سے ڈر گیا کہ کہیں گھوڑا (میرے بیٹے) یحییٰ کو نقصان نہ پہنچا دے، جو قریب ہی لیٹا ہوا تھا، میں نے سر اوپر اٹھایا اور پھر بچے کے پاس آگیا، پھر میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائبان کی طرح ایک چیز ہے جس میں چراغوں کے مانند کوئی شے ہے۔ پھر جب میں دوبارہ باہر آیا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا: ”آپ جانتے ہیں یہ کیا چیز تھی؟“ عرض کی، جی نہیں! فرمایا: ”یہ تو فرشتے

۱۔[مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قراءۃ القرآن وسورۃ البقرۃ: ۸۰۵]

۲۔”[السلسلۃ الصحیحۃ: ۲/ ۱۳۵، ح: ۵۸۸] الترمذی فی السنن ص ۴۰۸ والحاکم وصححہ کما فی الدر المنثور ج ۱ ص ۲۰

تھے جو آپ کی تلاوت سننے کے لیے آئے تھے، اگر آپ پڑھتے رہتے تو لوگ بھی صبح کے وقت انھیں دیکھتے اور وہ لوگوں سے چھپتے نہیں۔“[۱]

(٦) عبدالرحمن بن یزیدؒ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ حج کیا، اس نے انھیں دیکھا کہ انھوں نے جمرہ کبریٰ کی سات کنکریوں کے ساتھ رمی کی تو بیت اللہ ان کے بائیں ہاتھ اور منیٰ دائیں ہاتھ تھا، پھر فرمایا، یہ اس شخص کے رمی کرنے کی جگہ ہے جس پر سورہ بقرہ نازل ہوئی (یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔[۲]

(۷) حضرت سیدنا عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ حنین کے دن جب صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) میں کچھ سستی دیکھی تو آپ نے مجھے حکم دیا: ”اے عباس! اعلان کرو، اے اصحاب سمرہ! (یعنی اے کیکر کے درخت کے نیچے بیعت رضوان کرنے والو!) اے اصحاب سورہ بقرہ!“۔[۳]

(۸) عروہؒ بیان کرتے ہیں کہ یمامہ کے دن جب مسیلمہ کذاب کے ساتھیوں سے جنگ ہوئی تو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ایک دوسرے کو ”یَا اَصۡحَابَ سُوۡرَةِ الۡبَقَرَةِ!“ کہہ کر پکارنے لگے۔[۴]

(۹) سیدہ عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں، سورہ بقرہ اور سورہ نساء اس زمانہ میں نازل ہوئیں جب میں

۱۔[بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب نزول السکینة والملائكة عند قراءة القرآن: ٥٠١٨۔ مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب نزول السكينة لقراءة القرآن: ٧٩٦]

۲۔[بخاری، کتاب الحج، باب من رمی جمرة العقبة... الخ: ١٧٤٩۔ مسلم، کتاب الحج، باب رمی جمرة العقبة من بطن الوادی: ١٢٩٦]

۳۔[مسند الحمیدی: ٢١٨/١، ح: ٤٥٩۔ مسند أحمد: ٢٠٧/١، ح: ١٧٨٠، ١٧٨٠]

۴۔[مصنف عبدالرزاق، باب الشعار: ٢٣٢/٥، ح: ٩٤٦٥۔ سنن سعید بن منصور: ٣٥٢/٣، ح: ٢٩٠٨۔ مصنف ابن أبی شیبة: ٥٣٣/٦، ح: ٣٣٥٦٠]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تھی۔ [۱]

(۱۰) حضرت ابی بن کعب ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے ابوالمنذر! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے میں نے عرض کیا: (آیت) ”اللہ لا الہ الا ھوالحی القیوم“ (آیت الکرسی) آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابوالمنذر! تمہیں یہ علم مبارک ہو۔ [۲]

(۱۱) حضرت حذیفہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہماری (دوسرے) لوگوں پر تین وجہ سے فضیلت ہے، تمام روئے زمین ہمارے لیے مسجد بنادی گئی ہے اور اس کی مٹی ہمارے لیے ذریعہ طہارت بنادی گئی ہے اور ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح ہیں اور ہم کو یہ آیات دی گئی ہیں' سورہ بقرہ کی آخری آیات جو عرش کے نیچے سے نازل ہوئی ہیں' جو مجھ سے پہلے کسی کو دی گئی ہیں اور نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔ [۳]

(۱۲) حافظ سیوطی ؒ لکھتے ہیں: امام دارمی ؒ کعب ؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے بقرہ اور آل عمران کو پڑھا' قیامت کے دن وہ سورتیں کہیں گی: اے ہمارے رب! اس سے مواخذہ نہ کر۔

(۱۳) امام وکیع ؒ' امام حارث بن ابی اسامہ ؒ، امام محمد بن نصر اور امام ابن الضریس ؒ نے سند صحیح کے ساتھ حسن بصری ؒ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قرآن مجید میں افضل سورہ بقرہ ہے اور اس میں ایک آیت سب سے عظیم ہے' وہ آیت الکرسی ہے اور جس گھر میں سورہ بقرہ

۱۔ [بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تألیف القرآن: ۴۹۹۳]

۲۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

۳۔ (السنن الکبری ج ۵ ص ۱۵۔۱۳' مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

پڑھی جائے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ [۱]

(۱۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے کہ جو شخص سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں اور آیت الکرسی اور دو آیتیں اس کے بعد کی اور تین آیتیں سب سے آخر کی، یہ سب دس آیتیں رات کے وقت پڑھ لے اس گھر میں شیطان اس رات نہیں جا سکتا اور اسے اور اس کے گھر والوں کو اس دن شیطان یا کوئی اور بری چیز ستا نہیں سکتی۔ یہ آیتیں مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کا دیوانہ پن بھی دور ہو جاتا ہے۔ [۲]

(۱۵) نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک چھوٹا سا لشکر ایک جگہ بھیجا اور اس کی سرداری آپ نے انہیں دی جنہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے سورہ بقرہ یاد ہے، اس وقت ایک شریف شخص نے کہا میں بھی اسے یاد کر لیتا لیکن ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس پر عمل نہ کر سکوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قرآن سیکھو، قرآن پڑھو جو شخص اسے سیکھتا ہے، پڑھتا ہے پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بھرا ہوا برتن جس کی خوشبو ہر طرف مہک رہی ہے۔ اسے سیکھ کر سو جانے والے کی مثال اس برتن کی سی ہے جس میں مشک تو بھرا ہوا ہے لیکن اوپر سے منہ بند کر دیا گیا ہے۔ (امام ترمذی اسے حسن کہتے ہیں اور مرسل روایت بھی ہے) واللہ اعلم۔ [۳]

(۱۶) حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کہ گزشتہ رات ہم نے دیکھا، ساری رات حضرت ثابت کا گھر نور کا بقعہ بنا رہا اور چمکدار روشن چراغوں سے جگمگاتا رہا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا شاید انہوں نے رات کو سورہ بقرہ

۱۔ (الدر المنثور ج۱ ص۲۰۔۱۹، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

۲۔ تفسیر ابن کثیر

۳۔ تفسیر ابن کثیر

پڑھی ہوگی۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا" سچ ہے رات کو میں سورہ بقرہ کی تلاوت میں مشغول تھا۔ (۱)

(۱۷) شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور دیگر بعض علماء کا فرمان ہے کہ اس میں ایک ہزار خبریں ہیں اور ایک ہزار حکم ہیں اور ایک ہزار کاموں سے ممانعت ہے۔ (۲)

(۱۸) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کے ان کے پاس سورہ بقرہ اور آل عمران پڑھی تو آپ نے فرمایا تم نے دو سورتیں ایسی پڑھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ یہ وہ اسم ہے جس کے ذریعہ جو دعا کی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ جب سوال کیا جائے تو (اس کا) سوال پورا کیا جاتا ہے۔ (۳)

(۱۹) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم میں کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ (تکبر سے) اپنا پاؤں ایک دوسرے پر رکھ کر استغناء کا اظہار کرے اور سورہ بقرہ کی قراءت ترک کردے۔ جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے شیطان اس سے بھاگ جاتا ہے خالی گھر وہ ہے جو کتاب اللہ سے خالی ہو۔ (۴)

(۲۰) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک صحابی باہر نکلا اس کو شیطان ملا اور اس نے اسے پکڑ لیا دونوں نے کشتی کی تو صحابی رسول نے اس کو گرا دیا۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر
۲۔ تفسیر ابن کثیر
۳۔ سیوطیؒ نے الدر 1/21 میں
۴۔ تفسیر ابن کثیر

شیطان کہنے لگا مجھے چھوڑ و میں تمہیں ایک بات بتلاتا ہوں اس نے چھوڑ دیا۔ اس نے کہ بات بیان کرو۔ اس نے کہا، نہیں۔ صحابی رسول نے اس کو گرا دیا۔ شیطان کہنے لگا مجھے چھوڑ و میں تمہیں ایک بات بتلاتا ہوں اس نے چھوڑ دیا۔ اس نے کہا بات بیان کرو۔ اس نے کہا نہیں۔ صحابی رسول نے اسے دوسری مرتبہ پکڑ کر پچھاڑ دیا۔ شیطان نے کہا مجھے چھوڑ دو میں تمہیں بات بتاتا ہوں۔ اس نے چھوڑ دیا۔ اس نے کہا وعدے کے مطابق حدیث سناؤ۔ اس نے کہا نہیں۔ اس نے تیسری مرتبہ پکڑا اور شیطان کو صحابی نے پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گئے۔ اور اپنے انگوٹھے سے اس کے گلے کو دبانے لگے اس نے کہا مجھے چھوڑ دو۔ اس نے کہا میں تجھے اس وقت تک نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ تو مجھے حدیث نہ بیان کرلے اس نے کہا۔ سورہ بقرہ کی کوئی سی آیت شیاطین کے درمیان پڑھی جائے وہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ اور جس گھر میں یہ پڑھی جائے وہاں شیاطین کا داخلہ نہیں۔ [۱]

(۲۱) حضرت عمر فاروقؓ نے سورت بقرہ کی تفسیر بارہ سال میں پڑھی اور جس دن ختم کی اس دن خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی دعوت کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی۔ [۲]

(۲۲) جس نے سورہ بقرہ پڑھی اسے جنت کا تاج پہنایا جائے گا۔ [۳]

(۲۳) سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کو سیکھو اور اپنے بیوی بچوں کو سکھاؤ کیونکہ یہ دونوں آیتیں نماز، قرآن

۱۔ علامہ سیوطی نے 1/20 میں الدر منثور

۲۔ تفسیر قرطبی: جزاء اول: ص 40

۳۔ بیہقی: شعب الایمان: 2384: باب فی تعظیم القرآن

اور دعا کا درجہ رکھتی ہیں۔ [۱]

(۲۴) میت کو دفن کرکے اس کی قبر کے سرہانے سورہ بقرہ کی پہلی پانچ آیات اور قبر کی پائینتی کی طرف کھڑے ہو کر آخری دو آیات پڑھی جائیں۔ [۲]

(۲۵) سورہ بقرہ پڑھا کرو، اس کے پڑھنے میں برکت اور چھوڑنے میں حسرت ہے۔ نیز اس کی برکت سے مکار لوگوں کا مکر و فریب اور جادو اثر نہیں کرتا۔ [۳]

(۲۶) امام ابوداؤد اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک آدمی سے فرمایا کہ قرآن مجید میں سے کیا حفظ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا سورہ بقرہ اور جو اس سے ملی ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کھڑا ہو جا اور اس عورت کو بیس آیتیں سکھا دے اور یہ تیری بیوی ہے۔ مکحول کہا کرتے تھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی عورت کا نکاح قرآن کی کسی سورت کے بدلے میں کر دے۔

(۲۷) امام احمدؒ نے الزہد میں حکیم ترمذیؒ نے نوادر الاصول میں سلیمان بن یسارؒ سے روایت کیا کہ ایک رات حضرت ابواسید انصاریؓ جاگے اور یہ کہہ رہے تھے لفظ آیت "انا للہ وانا الیہ راجعون" مجھ سے میرا رات کا وظیفہ چھوٹ گیا اور میرا وظیفہ چھوٹ گیا اور میرا وظیفہ سورہ البقرہ تھی اور میں نے نیند میں دیکھا کہ گویا گائے مجھے سینگ مار رہی ہے۔

۱۔ بیہقی: شعب الایمان: 2403: باب فی تعظیم القرآن

۲۔ مشکوٰۃ: 1817: باب دفن المیت

۳۔ مسلم: 1874: صلاۃ المسافرین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾

الف، لام، میم۔

قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ہیں پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آیات کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب اور مراد بھی معلوم ہے۔ گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں۔ قرآن پاک کی اکثر آیتیں محکمات ہیں۔

آیات کی دوسری قسم متشابہات ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا معنی تو معلوم ہے۔ مگر ان کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ مثلاً آیت کریمہ "الرحمن علی العرش استوی" میں رحمن، عرش اور استویٰ کے معانی معلوم ہیں۔ مگر اس کی حقیقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ غامض اور دقیق ہے۔ گویا معنی تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ مگر جلوہ گر ہونے کی کیفیت ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی آیات متشابہات کہلاتی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات کہلاتی ہیں۔ یہ مفرد حروف ہیں جو قرآن پاک کی انتیس سورتوں کے ابتداء میں آتے ہیں سورہ بقرہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جو الم سے شروع ہوتی ہے۔ حروف مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کا معنی واضح ہے۔ اور نہ ان کی مراد معلوم ہے۔

الم: یہ حروف مقطعات میں سے ہے اور حروف مقطعات انتیس سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور وہ یہ

ہیں: الٓمٓ۔ الٓر۔ الٓمٓصٓ۔ الٓمٓر۔ حٰمٓ۔ حٰمٓعٓسٓقٓ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ۔ طٰسٓ۔ طٰسٓمٓ۔ طٰہٰ۔ یٰسٓ۔ صٓ۔ قٓ۔ نٓ۔

ان میں الٓمٓر چھ جگہ ہے۔اور الٓر پانچ جگہ ہےاور حٰمٓ چھ جگہ ہےاور طٰسٓمٓ دو جگہ ہے۔اوران کے علاوہ باقی سب ایک ایک جگہ ہیں۔کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہیں۔اس لیے مفسرین ان کے سامنے یوں لکھ دیتے ہیں۔اللہ اعلم بمرادہ بذلك۔(اللہ کو اس کا معنی معلوم ہے)

حروف مقطعات علم کی تحقیق

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا "الم" اور اس کی مثل دیگر حروف مقطعات کا معنی کسی کو معلوم ہے یا نہیں! ایک قول یہ ہے کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' خلفاء راشدین اور دیگر صحابہؓ سے اس قسم کی روایات منقول ہیں۔

علامہ بیضاویؒ لکھتے ہیں: حضرات خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی مراد یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان اسرار اور رموز ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علاوہ کسی اور کو ان حروف مقطعات پر مطلع کرنے کا قصد نہیں کیا گیا' اور یہ نہیں ہوسکتا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی ان حروف کے معانی کا علم نہ ہو ورنہ لازم آئے گا کہ غیر مفید کلام کے ساتھ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطاب کیا گیا اور یہ بہت بعید ہے۔[۱]

قرطبیؒ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود (رضی اللہ عنہم)

۱۔(انوارالتنزیل مع الخفاجی' ج۱' ص ۱۷۸ مطبوعہ دارصادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

سے نقل کیا ہے کہ ان کے معنی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں اور کسی کو معلوم نہیں۔ اس لیے وہ ان حروف کی کوئی تفسیر نہیں کرتے۔ عامر، شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خیثم رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں ابو حاتم بن حبان ؒ کو بھی اسی سے اتفاق ہے۔ ۱

حضرت علی المرتضیٰ ؓ سے منقول ہے کہ ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی چھانٹی ہوئی یا منتخب بات ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم میں ایسی بات حروف مقطعات الم وغیرہ ہیں جنہیں ہر آدمی کا سمجھنا ضروری نہیں۔ ۲

حضرت امام عامر بن شرجیل المعروف شعبیؒ نے پانچ سو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی زیارت کی ہے۔ اور ان سے علم حاصل کیا ہے۔ آپ امام ابو حنیفہؒ کے استاذ ہیں جب آپ سے حروف مقطعات کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا یہ اللہ کے راز ہیں ان کے پیچھے مت پڑو۔ ہوسکتا ہے تم انہیں سمجھنے میں ناکام رہو اور کسی غلط چیز میں مبتلا ہو جاؤ۔ لہٰذا تم انہیں صرف پڑھ لیا کرو۔ ۳

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کے ہر حروف کی تلاوت پر دس نیکیاں عطا فرماتے ہیں جو مومن ان حروف کو پڑھے گا اسے تیس نیکیاں حاصل ہوں گی یہی بہت بڑی غنیمت ہے۔ لہٰذا ان کے معانی تلاش کرنے میں کوشش نہ کرو۔ ۴

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: ظن غالب یہ ہے کہ حروف مقطعات کا علم مخفی ہے، علماء اس کی تاویل سے عاجز ہیں، حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے اور حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا: ہر کتاب کے اسرار ہوتے

۱۔ تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی

۲۔ (2۔ تفسیر کبیر ج2، ص3، تفسیر عزیزی پ1، ص74)

۳۔ (3۔ تفسیر عزیزی پ1 ص75، تفسیر کبیر ج2 ص3)

۴۔ (4۔ تفسیر کبیر ج2 ص2)

ہیں اور قرآن مجید کے اسرار اوائل حروف مقطعات ہیں' امام شعبیؒ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اسرار کا کھوج نہ لگاؤ۔ بعض علماء نے کہا: اگر ان حروف کا کوئی معنی نہ ہو تو یہ مہمل ہوں گے' یہ قول صحیح نہیں ہے' کیونکہ اگر یہ مراد ہو کہ تمام لوگوں کو ان حروف کا معنی معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں اور اگر یہ مراد ہو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کا معنی معلوم ہو تو کوئی مومن اس میں شک نہیں کر سکتا اور ہر صاحب ایمان کا یہ ایمان ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان حروف کے معنی معلوم ہیں۔ ۱

حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور فقہاء شافعیہ اور حنفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا میں متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا۔

ملا جیونؒ لکھتے ہیں: متشابہ کا حکم یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس کی مراد حق ہے' اگرچہ قیامت سے پہلے ہم کو وہ مراد معلوم نہیں ہے اور قیامت کے بعد متشابہ ہر ایک پر منکشف ہو جائے گا اور یہ امت کے حق میں ہے اور بہر حال نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو متشابہات کا قطعی طور پر علم ہے' ورنہ آپ کو ان سے خطاب کرنے کا فائدہ باطل ہو جائے گا اور یہ مہمل کلام سے خطاب کرنے کی طرح ہوگا جیسے حبشی کے ساتھ عربی میں گفتگو کی جائے اور یہ تقریر ہمارے نزدیک ہے اور امام شافعی کے نزدیک تمام "راسخین فی العلم" کو متشابہات کا علم ہے۔ ۲

قاضی ثناء اللہ مظہر نقشبندیؒ لکھتے ہیں: میرے نزدیک حق یہ ہے حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان اسرار ہیں' ان حروف سے عام لوگوں کو سمجھانے کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان حروف سے افہام

۱۔(روح المعانی ج۱ ص ۱۰۱۔۱۰۰' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

۲۔(نور الانوار ص ۹۳' مطبوعہ ایچ۔ایم سعید اینڈ کمپنی' کراچی)

مقصود تھا۔علامہ سجاوندیؒ نے کہا ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان اسرار ہیں اور کبھی محبین کے درمیان کچھ کلمات بہ طور معمہ ہوتے ہیں، ان میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ ان کلمات کو محرمان راز کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک قول یہ ہے کہ حروف مقطعات اور متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ساتھ مخصوص کرلیا ہے' ان کا علم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا کیا ہے اور نہ آپ کے متبعین کو' یہ قول بہت بعید ہے' کیونکہ خطاب افہام کے لیے ہوتا ہے اگر ان حروف سے افہام نہ ہو تو ان سے خطاب کرنا مہمل کلمات سے خطاب کرنے کی طرح ہوگا' یا جیسے عربی کے ساتھ ہندی میں خطاب کیا جائے' نیز پورا قرآن بیان اور ہدایت نہیں رہے گا (کیونکہ جب ان الفاظ کا کوئی مفہوم حاصل نہ ہو تو ان سے ہدایت کیسے حاصل ہوگی) اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ وعدہ فرمایا ہے: (آیت) " ثم ان علینا بیانہ (القیامہ: ۱۹) (ترجمہ) پھر اس قرآن کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔اس وعدہ کا خلاف لازم آئے گا' (اسی طرح " الرحمن علم القرآن" کا بھی خلاف لازم آئے گا' کیونکہ حروف مقطعات بھی قرآن ہیں اور رحمان نے ان کو نہیں سکھایا)' اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن خواہ محکم ہو یا متشابہ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بیان واجب اور ضروری ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں" راسخین فی العلم " سے ہوں اور میں ان علماء سے ہوں جن کو ان کی تاویل کا علم ہے' اسی طرح مجاہدؒ سے بھی مروی ہے۔حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ دعوی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر حروف مقطعات کی تاویل کو ظاہر فرما دیا ہے اور ان کے اسرار کو بیان کر دیا ہے لیکن عام لوگوں کے لیے ان کا بیان ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا بیان کرنا ان کے اسرار الہیہ ہونے کے

منافی ہے۔①

شیخ محمود الحسنؒ لکھتے ہیں: ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں ان کے اصلی معنی تک اوروں کی رسائی نہیں بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان جو بہ وجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا۔②

میں (محمد طاہر) کہتا ہوں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا ٹھیک ٹھیک مطلب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ایک راز ہے جس کی تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور عقیدے یا عمل کا کوئی مسئلہ ان کے سمجھنے پر موقوف نہیں۔

﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ ﴾

یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے۔

امام الفریابی، عبد بن حمید، ابن الضریس، ابن جریر اور ابن المنذرؒ نے مجاہدؒ سے روایت کیا کہ سورہ بقرہ کی پہلی چار آیات مومنین کی تعریف ہے اور دو آیتیں کافروں کی (بری) صفات کے بارے میں ہیں اور تیرہ آیتیں منافقین کی (بری) صفات کے بارے میں ہیں اور چالیس آیت سے ایک سو بیس آیات تک بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں۔

وکیعؒ نے مجاہدؒ سے روایت کیا ہے کہ سورت بقرہ کی یہ پہلی چار آیات لفظ آیت "المفلحون" تک مومنین کی اچھی صفات کے بارے میں نازل ہوئیں اور اس کے بعد دو آیتیں لفظ آیت "عظیما" تک

۱۔(تفسیر مظہری ج۱ص۱۵۔۱۴، مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ)
۲۔(حاشیۃ القرآن ص۳ مطبوعہ کمپنی لمیٹڈ کراچی)

کافروں کی بری صفات کے بارے میں نازل ہوئیں۔ اور دس آیات تک منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں۔ [1]

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہاں ذالک معنی میں" ھذا" کے ہیں۔ مجاہد، عکرمہ، سعید، جبیہ سدی، مقاتل بن حباب، زید بن اسلم اور ابن جریج (رحمہ اللہ علیہم) کا بھی یہی قول ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے قائم مقام عربی زبان میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ حضرت امام بخاریؒ نے ابوعبیدہؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذالک اصل میں ہے تو دور کے اشارے کے لیے جس کے معنی ہیں" وہ" لیکن کبھی نزدیک کے لیے بھی لاتے ہیں اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں" یہ" یہاں بھی اس معنی میں ہے۔ زمخشریؒ کہتے ہیں اس سے اشارہ الم کی طرف ہے۔ [2]

ذالِک اسم اشارہ بعید کے لیے ہے۔ قرآن کریم اگرچہ ہمارے ہاتھوں میں ہے، لیکن اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہاں علو مرتبت کی وجہ سے اسم اشارہ بعید کا استعمال کیا گیا۔ [3]

شان نزول

مالک بن صیف یہودی مسلمانوں کے دلوں میں یہ کہہ کر شکوک وشبہات پیدا کرتا تھا کہ یہ قرآن وہ کتاب نہیں جس کی پہلی کتابوں میں خبر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شک وشبہ کو دور کرنے کے لیے مسلمانوں کی تعریف اور کافروں کی مذمت میں یہ آیتیں نازل فرمائیں، پہلی چار آیتیں" ذلک الکتب"

١۔ الدرمنثور امام سیوطیؒ
٢۔ تفسیر ابن کثیر
٣۔ تفسیر محمود

سے "مفلحون"۔تک مسلمانوں کی تعریف میں دو آیتیں کافروں کی مذمت میں اور پھر ۱۳ آیتیں منافقوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ [۱]

قرآن میں کچھ شک نہیں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ الکتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ [۲]

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ "الکتب"۔سے مراد قرآن کریم ہے۔ [۳]

ریب کے معنی ہیں شک وشبہ۔حضرت ابن عباسؓ ،حضرت ابن مسعودؓ اور کئی ایک صحابہؓ سے یہی معنی مروی ہیں۔ابودرداءؓ ،ابن عباسؓ ،مجاہدؒ،سعید بن جبیرؒ،ابو مالک نافعؒ جو ابن عمرؓ کے مولا ہیں،عطاؒ،ابو العالیہ،ربیع بن انسؒ،مقاتل بن حیانؒ،سدیؒ،قتادہؒ،اسماعیل بن ابو خالدؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ابن ابی حاتمؒ فرماتے ہیں مفسرین میں اس میں اختلاف نہیں۔ [۴]

یعنی اس کتاب کی ہر بات کسی شک وشبہ کے بغیر درست ہے،انسان کی لکھی ہوئی کسی کتاب کو سو فیصد شک سے بالاتر نہیں سمجھا جاسکتا،کیونکہ انسان کتنا ہی بڑا عالم ہو اس کا علم محدود ہوتا ہے اور اکثر اس کی کتاب اس کے ذاتی گمان پر مبنی ہوتی ہے؛لیکن چونکہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی ہے جس کا علم لامحدود بھی ہے اور سو فیصد یقینی بھی،اس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں،کسی کو شک ہو تو یہ اس کی ناسمجھی کی وجہ

۱۔تفسیر جلالین صفحہ ۳

۲۔حاکم نے مستدرک 2/260 میں نقل کیا ہے کہ

۳۔(ابن کثیر:ج:۱:ص:۶۳:معالم التنزیل:ص:۱۷:ج:۱)

۴۔تفسیر ابن کثیر

سے ہوگا کتاب کی کوئی بات شبہ والی نہیں۔ ①

یہاں ایک شبہ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کئی دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب (قرآن) بلا تخصیص تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۔مگر اس آیت میں قرآن کے ہدایت ہونے کو متقی لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن تا قیامت تمام بنی آدم کے لیے ہدایت ہے۔ مگر چونکہ اس کی ہدایت سے فائدہ صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں خوف خدا ہو۔ اس لیے یہاں صرف متقین کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ ②

متقین کی تعریف

ھدی: (ہدایت راستہ کا علم، راستہ پر چلنے کا ساز و سامان اور توفیق نیز منزل پر پہنچنے کی قوت۔ یہ تمام باتیں ہدایت کے معنوں میں شامل ہیں۔

متقین: (پرہیز گار) یہ متقی کی جمع ہے۔ اور لفظ تقویٰ سے بنا ہے۔ متقی وہ ہے جس میں تقویٰ ہو۔ تقویٰ احتیاط اور نگہداشت کو کہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے متقی کے معنی ہوئے پرہیز گاری کے ساتھ بسر کرنے والا ۔ جو ہر کام سوچ سمجھ کر احتیاط سے کرتا ہو۔

حضرت ابن عباس حضرت ابن مسعود اور دیگر کئی صحابہ (رضی اللہ عنہم) اجمعین سے نقل کیا ہے کہ یہ

۱۔ مفتی تقی عثمانی آسان ترجمہ قرآن

۲۔ (تفسیر کبیر 344 ج 11۔ روح المعانی ص 110 جلد 1)

حضرات ھدی للمتقین کا ترجمہ یہ کرتے تھے" یہ اہل تقویٰ کے لیے روشنی ہے"۔ [۱]

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مبارک دور میں حضرت ابی بن کعبؓ بڑے قاری تھے سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا تقویٰ کا کیا معنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا آپ کو کبھی ایسے راستہ پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں؟ تو انہوں نے جواب دیا ہاں! بہت دفعہ ایسے راستہ پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے، تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا" شمرت واجتھدت"۔ میں نے دامن سمیٹ لیا اور پوری کوشش کی کہ کانٹے میرے جسم کے کپڑوں میں نہ الجھنے پائیں، اور میں سلامتی سے ایسے راستہ سے نکل گیا، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا" فذلک التقویٰ" تقویٰ اسی کو کہتے ہیں کہ دنیا میں پھیلے ہوئے کفر و شرک، گمراہی و بدعت، اور دیگر خرابیوں سے انسان بچ کر نکل جائے، بس جو شخص ان چیزوں سے دامن بچا کر نکل گیا وہی متقی ہے۔ [۲]

متقی وہ ہیں جو ایمان لا کر شرک سے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام بجالائیں۔ ایک اور روایت میں ہے متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے ڈر کر ہدایت کو نہیں چھوڑتے اور اس کی رحمت کی امید رکھ کر اس کی طرف سے جو نازل ہوا اسے سچا جانتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں "متقی وہ ہے جو حرام سے بچے اور فرائض بجالائے۔" حضرت اعمشؒ حضرت ابوبکر بن عیاشؒ سے سوال کرتے ہیں۔ "متقی کون ہے؟" آپ یہی جواب دیتے ہیں پھر میں نے کہا" ذرا حضرت کلبیؒ سے بھی تو دریافت کرلو!" وہ کہتے ہیں متقی وہ ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچیں۔ اس پر دونوں کا اتفاق ہوتا ہے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں متقی وہ ہے جس کا

۱۔ تفسیر طبری نے 1/230 میں

۲۔ (ابن کثیر: ص: ٦٥: ج: ١: ومعالم التنزیل: ص: ١٨: ج: ١)

وصف اللہ تعالیٰ نے خود اس آیت کے بعد بیان فرمایا کہ آیت (الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ) 2۔البقرۃ:3) امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب اوصاف متقیوں میں جمع ہوتے ہیں۔ [۱]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم ہو وہ اللہ سے ڈرے اور حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا: معصیت پر اصرار نہ کرنا، اور عبادت پر مغرور نہ ہونا، تقوی ہے، ابراہیم بن ادھمؒ نے کہا: تقوی یہ ہے کہ تمہاری زبان پر مخلوق کا عیب نہ ہو، فرشتے تمہارے افعال میں عیب نہ پائیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں کوئی عیب نہ دیکھے، علامہ واقدیؒ نے کہا: تقوی یہ ہے کہ جس طرح تم اپنے ظاہر کو مخلوق کیلیے مزین کرتے ہو، اس طرح اپنے باطن کو اللہ کے لیے مزین کرو، ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو وہاں نہ دیکھے جہاں اس نے منع کیا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت کو اپنائے اور دنیا کو پس پشت ڈال دے، اپنے نفس کو اخلاص اور وفا کا پابند کرے اور حرام اور جفا سے اجتناب کرے وہی متقی ہے۔ [۲]

تقوی اور متقین کے متعلق احادیث:

امام ترمذیؒ روایت کرتے ہیں: حضرت عطیہ سعدیؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک متقین میں سے شمار نہیں ہوگا جب تک کہ وہ بے ضرر چیز کو اس

۱۔تفسیر ابن کثیر

۲۔(تفسیر کبیر ج۱ ص ۱۶۲۔۱۶۱ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ)

خوف سے نہ چھوڑ دے کہ شاید اس میں ضرر ہو۔[۱]

امام مسلمؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' تناجش (کسی کو پھنسانے کے لیے زیادہ قیمت لگانا) نہ کرو' ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' ایک دوسرے سے روگردانی نہ کرو' کسی کی بیع پر بیع نہ کرو' اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ' مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے' اس پر ظلم نہ کرے' اس کو رسوا نہ کرے' اس کو حقیر نہ جانے' حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے تین بار فرمایا: تقوی یہاں ہے' کسی شخص کے برے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو برا جانے' ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر مکمل حرام ہے' اس کا خون اس کا مال اور اس کی عزت۔[۲]

امام دارمیؒ روایت کرتے ہیں: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تمہارا رب یہ فرماتا ہے کہ میں ہی اس بات کا مستحق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے سو جو شخص مجھ سے ڈرے گا تو میری شان یہ ہے کہ میں اس کو بخش دوں۔[۳]

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے ایک ایسی آیت کا علم ہے کہ اگر لوگ صرف اسی آیت پر عمل کر لیں تو وہ ان کے لیے کافی ہوگی' جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔[۴]

۱۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۰٤' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

۲۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

۳۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۲۱۲' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

۴۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۲۱۳' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام احمدؒ روایت کرتے ہیں: ابونضرہؒ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے ایام تشریق کے وسط میں رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطبہ سنا اس نے یہ حدیث بیان کی' آپ نے فرمایا: اے لوگو! سنو تمہارا رب ایک ہے' تمہارا باپ ایک ہے' سنو! کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے' نہ عجمی کو عربی پر فضیلت ہے' نہ گورے کو کالے پر فضیلت ہے' نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے' مگر فضیلت صرف تقویٰ سے ہے۔ ۱

حضرت معاذؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: شاید اس سال کے بعد تم مجھ سے ملاقات نہیں کرو گے' حضرت معاذؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فراق کے صدمہ میں رونے لگے' پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میرے سب سے زیادہ قریب متقی ہوں گے خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں۔ ۲

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ ﴾

جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز اور اس میں سے جو رزق ہم نے انہیں دیا وہ خرچ کرتے ہیں۔

۱۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۴۱۱ مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت)

۲۔ (مسند احمد ج ۵ ص' ۲۳۵ مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت)

غیب پر ایمان سے مراد

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ: قرآن سے مستفید ہونے کی یہ دوسری شرط ہے اس آیت میں متقین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں (۱) ایمان بالغیب (۲) اقامت صلوٰۃ (۳) اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ [۱]

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں۔ ایمان کسی چیز کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت زہریؒ فرماتے ہیں" ایمان کہتے ہیں عمل کو" ربیع بن انسؒ کہتے ہیں۔ یہاں ایمان لانے سے مراد ڈرنا ہے۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔ یہ سب اقوال مل جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ زبان سے، دل سے، عمل سے، غیب پر ایمان لانا اور اللہ سے ڈرنا۔ ایمان کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے اصولوں پر، ایمان لانا شامل ہے اور اس اقرار کی تصدیق عمل کے ساتھ بھی کرنا لازم ہے۔ [۲]

یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ) 'الغیب" سے مراد وہ حقائق ہیں جو انسان کے حواس اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ حدیث جبرائیل، جس کے راوی امیر المومنین عمرؓ ہیں، اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایمان کی تعریف یہ بیان فرمائی کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت اور اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لائے۔ [۳]

اس کے معنی میں بھی مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں اور وہ سب صحیح ہیں اور جمع ہو سکتے ہیں۔ ابوالعالیہؒ

۱۔ تفسیر جلالین

۲۔ تفسیر ابن کثیر

۳۔ [مسلم: ۸]

ؒ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر، قیامت پر، جنت دوزخ پر، ملاقات اللہ پر، مرنے کے بعد جی اٹھنے پر، ایمان لانا ہے۔ قتادہ ابن دعامہ ؒ کا یہی قول ہے۔ ابن عباس ؓ، ابن مسعود ؓ اور بعض دیگر اصحاب ؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ پوشیدہ چیزیں ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں جیسے جنت، دوزخ وغیرہ۔ وہ امور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ابن عباس ؓ فرماتے ہیں اللہ کی طرف سے جو کچھ آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے۔ حضرت ابوذر ؓ فرماتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے۔ عطا بن ابی رباح ؒ فرماتے ہیں اللہ پر ایمان لانے والا، غیب پر ایمان لانے والا ہے۔ اسماعیل بن ابو خالد ؒ فرماتے ہیں اسلام کی تمام پوشیدہ چیزیں مراد ہیں۔ زید بن اسلم ؒ کہتے ہیں مراد تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ پس یہ تمام اقوال معنیٰ کی رو سے ایک ہی ہیں اس لیے کہ سب چیزیں پوشیدہ ہیں اور غیب کی تفسیر ان سب پر مشتمل ہے اور ان سب پر ایمان لانا واجب ہے۔ [۱]

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا، یا جو کچھ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اس سب پر ایمان لاتے ہیں۔

کون سا ایمان معتبر ہے؟ الذین یومنون بالغیب، سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک الموت کو دیکھ کر ایمان لانا مفید نہیں کیونکہ وہ ایمان بالغیب نہیں۔ فرعون نے بھی بوقت غرق ایمان ظاہر کیا تھا مگر اس کا ایمان قبول نہیں کیا گیا۔ کیونکہ بوقت موت انسان پر عالم آخرت ظاہر ہو جاتا ہے اور فرتے اور جنت و نارا سے سب کچھ نظر آ جاتا ہے جبکہ اللہ کے ہاں بن دیکھے غیب پر ایمان لانا معتبر ہے جو دیکھ کر ماننے اس نے اللہ اور اس کے رسول پر اعتبار نہیں کیا بلکہ اپنی آنکھوں پر اعتبار کیا۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مجلس میں ایک مرتبہ صحابہؓ کے فضائل بیان ہو رہے تھے۔تو آپ فرمانے لگے،حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دیکھنے والوں کوتو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانا ہی تھا لیکن اللہ کی قسم ایمانی حیثیت سے وہ لوگ افضل ہیں جو بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ پھر آپ نے الم سے لے کر مفلحون تک آیتیں پڑھیں۔ (۱)

مسند احمد میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث ہے۔ ابو جمعہؓ صحابی سے ابن محریزؒ نے کہا کہ کوئی ایسی حدیث سناؤ جو تم نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنی ہو۔فرمایا میں تمہیں ایک بہت ہی عمدہ حدیث سناتا ہوں، ہم نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک مرتبہ ناشتہ کیا، ہمارے ساتھ ابوعبیدہ بن جراحؓ بھی تھے،انہوں نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا ہم سے بہتر بھی کوئی اور ہے؟ ہم آپ پر اسلام لائے، آپ کے ساتھ جہاد کیا، آپ نے فرمایا ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے، مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا بھی نہ ہوگا۔

صالح بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ ابو جمعہ انصاریؓ ہمارے پاس بیت المقدس میں آئے۔ رجاء بن حیوۃؒ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے، جب وہ واپس جانے لگے تو ہم انہیں چھوڑنے کو ساتھ چلے، جب الگ ہونے لگے تو فرمایا تمہاری ان مہربانیوں کا بدلہ اور حق مجھے ادا کرنا چاہیے۔ سنو! میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنی ہے ہم نے کہا اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے ضرور سناؤ۔ کہا سنو! ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے، ہم دس آدمی تھے، حضرت معاذ بن جبلؓ بھی ان میں تھے، ہم نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا ہم سے بڑے اجر کا مستحق

۱۔(ابن ابی حاتم۔ابن مردویہ۔مستدرک۔حاکم) امام حاکم اس روایت کو صحیح بتاتے ہیں۔

بھی کوئی ہوگا؟ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ کی تابعداری کی۔آپ نے فرمایا تم ایسا کیوں نہ کرتے؟ اللہ کا رسول تم میں موجود ہے، وحی الٰہی آسمان سے تمہارے سامنے نازل ہو رہی ہے۔ایمان تو ان لوگوں کا افضل ہوگا جو تمہارے بعد آئیں گے دو گتوں کے درمیان یہ کتاب پائیں گے، اس پر ایمان لائیں گے اور اس پر عمل کریں گے، یہ لوگ اجر میں تم سے گنے ہونگے۔ [۱]

ان احادیث سے کوئی شخص یہ دلیل نہ پکڑے کہ پھر صحابہ کے بعد والے مومنین صحابہ سے افضل ٹھہرے اس لیے کہ پچھلے لوگوں کو صرف ایک فضیلت حاصل ہے یعنی حضور صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم کو دیکھے بغیر آپ پر ایمان لانا اور اس فضیلت کا ثواب بھی ہم نفس وشیطان کی شرارتوں سے برباد کر لیتے ہیں ۔نفاق، عدم اخلاص، اور اخلاص ذمیمہ سے ہم اپنا ایمان اس قدر کمزور کر لیتے ہیں ہم سب کا ایمان ایک صحابی کے ایمان کے ہم وزن نہیں ہوسکتا۔ پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے لیے قرآن نے وعدہ جنت فرمایا جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اخلاص وللّٰہیت کے سبب ان کی نیکیوں کا اجر اس قدر زیادہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو وہ میرے ایک صحابی کے ایک مد یا آدھا جو کے خرچ کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ [۲]

اقامت الصلوۃ کے معنی

اقامت الصلوۃ سے مراد یہ ہے کہ پوری شرائط اور پابندی کے ساتھ نماز باقاعدگی سے ادا کرنا۔صلوۃ۔ کے لفظی معنی دعا کے ہیں۔

۱۔تفسیر ابن مردویہ میں ہے۔

۲۔(مسلم کتاب الایمان)

وَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ: **متقین یعنی اللہ سے ڈرنے والوں کی دوسری نشانی نماز قائم کرنا ہے، نماز قائم کرنے سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح نماز ادا کرنا ہے، یعنی متقی لوگ جب نماز ادا کرتے ہیں تو اس کے تمام ارکان وشروط کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے اسے خشوع وخضوع اور حضور قلب کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ یہ دراصل اللہ سے محبت اور اس پر سچے ایمان کا امتحان ہے، اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتا ہے کہ کون بن دیکھے اسے مانتا ہے اور کون نہیں۔ خشوع وخضوع کے ساتھ ساتھ نماز پر دوام بھی نہایت لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کامیابی والا انسان وہی ہے جو نماز پر ہیشگی اختیار کرتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: (قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۔ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِيۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ) [المؤمنون: ۱،۲] "یقیناً کامیاب ہوگئے مومن۔ وہی جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔" اور فرمایا (وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَاتِهِمۡ يُحَافِظُوۡنَ) [المعارج: ۳۴] "جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔" اور فرمایا: (فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ) [التوبۃ: ۱۱] "پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔" (آیت) "مَا سَلَكَكُمۡ فِىۡ سَقَرَ ﴿42﴾ قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ ﴿43﴾ "۔ (المدثر: ۴۲۔۴۳) ترجمہ: (جنتی مجرموں سے سوال کریں گے) تم کو کس چیز نے دوزخ میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔**

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں فرائض نماز بجالانا۔ رکوع سجدہ تلاوت خشوع اور توجہ کو قائم رکھنا نماز کو قائم رکھنا ہے۔ قتادہؒ کہتے ہیں وقتوں کا خیال رکھنا، وضو اچھی طرح کرنا، رکوع سجدہ پوری طرح کرنا، اقامت صلوٰۃ ہے۔ مقاتلؒ کہتے ہیں وقت کی نگہبانی کرنا۔ مکمل طہارت کرنا، رکوع، سجدہ پورا کرنا،

تلاوت اچھی طرح کرنا۔ التحیات اور درود پڑھنا اقامت صلوٰۃ ہے۔[۱]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: 1 اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ 2 نماز قائم کرنا۔ 3 زکوۃ ادا کرنا۔ 4 بیت اللہ کا حج کرنا۔ 5 اور رمضان کے روزے رکھنا۔"[۲]

حضرت عثمان غنیؓ فرماتے ہیں: سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا پھر اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ ان میں خیالات نہ آنے دے تو اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔[۳]

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو بھی مسلمان اچھے طریقے سے وضو کرتا ہے، پھر کھڑے ہو کر اس طرح دو رکعت نماز پڑھتا ہے کہ اپنے دل اور چہرے سے متوجہ ہو کر یہ دو رکعتیں ادا کرتا ہے تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔[۴]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے نماز پر مداومت کی تو قیامت کے دن وہ نماز اس کے لیے نور، برہان اور نجات ہوگی، اور جس نے نماز کی محافظت نہ کی تو اس کے لیے نہ نور ہے، نہ برہان، نہ نجات اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون،

۱۔ تفسیر ابن کثیر

۲۔ [بخاری، کتاب ال إیمان، باب دعاءکم إیمانکم۔۔ الخ: ۸۔ مسلم، کتاب ال إیمان، باب بیان أرکان ال إسلام۔۔ الخ: ۱۶]

۳۔ (بخاری، کتاب الوضوء، باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً، ۱: ۷۸، الحدیث: ۱۵۹)

۴۔ (مسلم، کتاب الطہارۃ، باب الذکر المستحب عقب الوضوء، ص ۱٤٤، الحدیث: ۱۷ (۲۳٤)۔

ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ ①

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی شخص اور اس کے کفر اور شرک کے درمیان (فرق) نماز کو ترک کرنا ہے۔ ②

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بندہ سے قیامت کے دن سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے' اگر وہ مکمل ہوئی تو مکمل لکھی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کمی ہوئی تو کہا جائے گا: دیکھو کیا اس کی کچھ نفلی نمازیں ہیں جن سے اس کے فرض کی کمی کو پورا کر دیا جائے' پھر باقی اعمال کا اسی طرح حساب لیا جائے گا۔ ③

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی تو جہنم کے اس دروازے پر اس کا نام لکھ دیا جاتا ہے جس سے وہ داخل ہوگا"۔ ④

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں۔ ⑤

عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے داداؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ

۱۔(مسند امام احمد، مسند عبداللہ بن عمرو بن العاص، ۲:۵۷۴، الحدیث:۶۵۸۷)

۲۔(صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

۳۔(سنن نسائی ج ۱ ص ۸۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

۴۔(حلیۃ الاولیاء ۷:۲۹۹، الحدیث:۱۰۵۹)

۵۔(مسند احمد ج ۴ ص ۲۱۸' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

وسلم) نے فرمایا: سات سال کی عمر میں اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور دس سال کی عمر میں ان کو مار مار کر ان سے نماز پڑھواؤ، اور ان کے بستر الگ الگ کر دو۔ (۱)

حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ جس مرض میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات ہوء اس میں آپ بار بار فرماتے تھے: نماز اور غلام۔ (۲)

علامہ حصکفی حنفیؒ لکھتے ہیں: بعثت سے پہلے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی مخصوص نبی کی شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے، بلکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) یا کسی اور نبی کی شریعت پر عمل کرتے تھے اور حدیث صحیح میں ہے کہ آپ غار حرا میں عبادت کرتے تھے۔ (۳)

علامہ سہیلیؒ لکھتے ہیں: معراج ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے ہوئی، حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ پہلے نماز دو دو رکعت فرض ہوئی تھی، پھر سفر میں یہ تعداد برقرار رہی اور حضر میں رکعات کی تعداد بڑھا دی گئی، ہجرت کے ایک سال بعد یہ تعداد بڑھائی گئی تھی۔ (۴)

ابو وائلؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا: جب بندہ نماز پڑھتا ہے تو اس کے سر کے اوپر اس کے گناہ جمع ہو جاتے ہیں اور جب وہ سجدہ کرتا ہے تو گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جس طرح درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ (۵)

۱۔ (سنن ابوداؤد ج۱ ص ۱۷، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور ۱۴۰۵ھ)

۲۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۱۷، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

۳۔ (بخاری) (الدر المختار علی رد المختار ج۱ ص ۲۳۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

۴۔ (الروض الانف ج۱ ص ۱۶۳۔۱۶۲، مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ ملتان)

۵۔ اس حدیث کو امام ابن زنجویہ نے روایت کیا ہے۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج۱۹ ص ۵۱۸۔۵۱۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۴ھ)

امام ابن عساکرؒ حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص وضو کرے اور تین بار اپنے ہاتھوں کو دھوئے اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں کے ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے' اور جو کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان اور ہونٹوں کے ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے' اور جو اچھی طرح وضو کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھے وہ گناہوں سے اس طرح صاف ہو جاتا ہے جس طرح اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہو' راوی نے پوچھا: آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خود سنا ہے؟ فرمایا: ایک دو' تین' چار' پانچ' چھ بار نہیں' بیشمار مرتبہ سنا ہے۔ (۱)

تارک نماز کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

قاضی ابن رشد مالکیؒ لکھتے ہیں:

جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار نہ کرتا ہو' لیکن نماز کا تارک ہو اور کہنے کے باوجود بھی نماز نہ پڑھتا ہو' اس کے متعلق امام احمدؒ اسحاقؒ' اور ابن المبارکؒ نے یہ کہا ہے کہ وہ کافر ہو گیا اور اس کو قتل کرنا واجب ہے' اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس شخص کو حداً قتل کر دیا جائے اور امام ابوحنیفہ اور اہل ظاہرؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے اور اس پر تعزیر لگائی جائے حتیٰ کہ وہ نماز پڑھنے لگے۔

اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں احادیث مختلف ہیں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی مسلمان کو تین وجوہ کے سوا اور کسی وجہ سے قتل کرنا جائز نہیں ہے' ایمان کے بعد کفر کرے یا شادی شدہ شخص زنا کرے یا کسی شخص کو بغیر بدلہ کے قتل کرے۔ (۲)

۱۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ٤ ص ٤٠۔ مطبوعہ دار الفکر' دمشق' ١٤٠٤ھ)
۲۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

یہ حدیث امام ابوحنفیہ ؒ کی دلیل ہے۔

حضرت بریدہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہمارے اوران کے درمیان (سلامتی کا) عہد نماز ہے' سوجس شخص نے نماز کوترک کیا اس نے کفر کیا۔

اور حضرت جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بندہ اور کفر اور شرک کے درمیان (فرق) نماز کا ترک کرنا ہے۔ [۱]

یہ حدیثیں امام احمد ؒ اسحاق ؒ اور ابن المبارک ؒ کی دلیل ہیں جو تارک نماز کو کافر قرار دیتے ہیں اور اس کے کفر کی وجہ سے اس کے قتل کو واجب قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنفیہ ؒ اس حدیث کو تغلیظ اور زجر و توبیخ پر محمول کرتے ہیں اور یہ تاویل کرتے ہیں کہ نماز کو ترک کرنا' کافروں کا فعل ہے اور یہ صورۃ کفر ہے حقیقۃ کفر نہیں ہے۔ [۲]

تارک نماز کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ مرداوی حنبلی ؒ لکھتے ہیں:

اگر کسی شخص نے نماز کی فرضیت کا انکار کیے بغیر سستی سے نماز کو ترک کیا تو اس کو نماز پڑھنے کی دعوت دی جائے' اگر وہ نماز کا وقت تنگ ہونے تک نہ پڑھے تو اس کو قتل کرنا واجب ہے' یہی مذہب ہے اور اسی پر جمہور اصحاب کا عمل ہے' ابو اسحاق بن شاقلا نے کہا: اگر اس نے ایک نماز نہیں پڑھی حتی کہ دوسری نماز کا وقت بھی نکل گیا تو اس کو قتل کرنا واجب ہے' یہ قول حسن ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ وہ تین نمازیں ترک

۱۔ (ترمذی ونسائی) (صحیح مسلم)

۲۔ (بدایۃ المجتہد ج۱ ص ۶۶-۶۵' مخلصا مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

کرے اور چوتھی کا وقت تنگ ہو جائے تو اس کو قتل کرنا واجب ہے اور ایک روایت میں تین دن کی نمازوں کا ذکر ہے۔ [۱]

نماز پڑھنے کی دعوت امام یا اس کے نائب کی طرف سے دی جائے گی اگر دعوت سے پہلے اس نے کثیر نمازیں بھی ترک کی ہوں تو اس کو قتل کرنا واجب نہیں ہے' اس کی توبہ نماز پڑھنا ہے۔ [۲]

آیا اس کو قتل حدا کیا جائے گا یا کفرا؟ اس میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کو کفر کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور یہی مذہب ہے اور اکثر فقہاء کا مختار ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ اس کو حدا قتل کیا جائے گا اور یہ بعض فقہاء کا مختار ہے' اور مذہب حنبلیہ کے مطابق اس کا حکم کفار کا حکم ہے اس کو غسل دیا جائے گا نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا' وہ کسی کا وارث ہوگا نہ اس کا کوئی وارث ہوگا' اور وہ مرتد کی مثل ہے۔ نماز کے علاوہ اور کسی عبادت کو سستی سے ترک کیا تو یہ کفر نہیں ہے۔ [۳]

تارک نماز کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں:

جس شخص نے نماز کی فرضیت کا انکار کیا وہ مرتد ہے اور اس پر مرتدین کے احکام جاری ہونگے۔ جس شخص نے کسی عذر کی وجہ سے نماز کو ترک کیا مثلاً نیند یا نسیان کی وجہ سے تو اس پر فقط قضا ہے اور اس کے لیے

۱۔ (الانصاف ج۱ ص۴۰۱' مخلصا مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۲ھ)

۲۔ (الانصاف ج۱ ص۴۰۲' مخلصا مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۲ھ)

۳۔ (الانصاف ج۱ ص۴۰۵۔۴۰۴' مخلصا مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۲ھ)

وقت میں وسعت ہے۔ جس شخص نے بغیر کسی عذر کے سستی کی وجہ سے نماز کو ترک کیا تو صحیح قول یہ ہے کہ اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی اور شاذ قول یہ ہے کہ وہ منکر نماز کی طرح مرتد ہے۔ صحیح قول کی بناء پر نماز کے تارک کو حداً قتل کیا جائے گا' اس کو کب قتل کیا جائے؟ صحیح قول یہ ہے کہ جب وہ ایک نماز کو ترک کر دے اور اس کا وقت تنگ ہو جائے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا' دوسرا قول یہ ہے کہ جب دوسری نماز کا وقت تنگ ہو جائے' تیسرا قول یہ ہے کہ جب چوتھی نماز کا وقت تنگ ہو جائے' چوتھا قول یہ ہے کہ جب وہ چار نمازیں ترک کر دے' پانچواں قول یہ ہے کہ جب وہ سستی کی وجہ سے نمازیں ترک کرنے کا عادی ہو جائے لیکن مذہب پہلا قول ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کو مرتد کی طرح تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ (۱)

جب تارک نماز کو قتل کیا جائے تو اس کو غسل دیا جائے گا' کفن پہنایا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور مسلمانوں کی طرح اس کی قبر بنائی جائے گی جیسا کہ باقی مرتکبین کبیرہ کے لیے کیا جاتا ہے' اور ایک قول یہ ہے کہ اس کو نہ غسل دیا جائے گا نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ اس کو کفن پہنایا جائے گا اور اس کی قبر مٹا دی جائے گی۔ (۲)

علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس رملی ؒ نے بھی تارک نماز کے متعلق یہی تفصیل لکھی ہے۔ (۳)

تارک نماز کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ حطاب مالکی ؒ لکھتے ہیں:

۱۔ (روضۃ الطالبین ج۱ ص ٦٦٨۔٦٦٦ ملخصا' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ١١٠٥ھ)

۲۔ (روضۃ الطالبین ج۱ ص ٦٣٤ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ١١٠٥ھ)

۳۔ (نہایۃ المحتاج ج۲ ص ٤٢٨' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ١٤١٤ھ)

جس شخص نے کئی نمازیں عمداً ترک کیں حتیٰ کہ ان کا وقت نکل گیا' اگر وہ ان کے متعلق سوال کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ استغفار کرے اور جس شخص کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ سستی اور لاپرواہی کی وجہ سے نمازوں کو ترک کرتا ہے' اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر اس نے نماز نہیں پڑھی تو اس کو دھمکایا جائے گا اور مارا پیٹا جائے گا' اگر اس کے بعد بھی اس نے نماز نہیں پڑھی تو اس کو حداً قتل کر دیا جائے گا نہ کہ کفراً بشرطیکہ وہ نماز کی فرضیت کا اقرار کرتا ہو اور منکر نہ ہو' ابن التلمسانی نے اپنی شرح میں ابن العربی سے نقل کیا ہے کہ روزہ بھی نماز کی طرح ہے' اس کے تارک کو بھی قتل کیا جائے گا" ذخیرہ" میں لکھا ہے کہ امام مالک کے نزدیک روزہ اور نماز کا تارک قتل کیا جائے گا اور امام شافعیؒ اور عراقیین کے نزدیک تارک زکوۃ کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ زکوۃ جبراً لی جاسکتی ہے۔ (۱)

علامہ خرشی مالکیؒ لکھتے ہیں:

اگرچہ تارک نماز یہ کہے کہ میں نماز پڑھوں گا اور بدستور ترک کرتا رہے اور نماز شروع نہ کرے' پھر بھی اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ مذہب کے نزدیک قولاً اور فعلاً امتناع اور صرف فعلاً امتناع میں کوئی فرق نہیں ہے' اس کو نماز کے ترک کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور نماز کا ترک محقق ہے۔ (۲)

علامہ دردیر مالکیؒ لکھتے ہیں:

تارک نماز کو تلوار سے حداً قتل کیا جائے گا' اس کی نماز جنازہ کوئی فاضل عالم نہیں پڑھائے گا اور اس کی قبر قائم رکھی جائے گی اس کو ہموار نہیں کیا جائے گا۔ (۳)

۱۔(مواہب الجلیل ج ۱ ص ۴۲۱۔۴۲۰' مکتبۃ النجاح' لیبیا)

۲۔(الخرشی علی مختصر خلیل ج ۱ ص ۲۲۷' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

۳۔(الشرح الکبیر علی حاشیۃ الدسوقی ج ۱ ص ۱۹۱۔۱۹۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

تارک نماز کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفیؒ لکھتے ہیں: جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہے' اور جو شخص نماز کو عمداً سستی سے ترک کرے وہ فاسق ہے' اس کو قید کیا جائے گا حتی کہ وہ نماز پڑھنے لگے' کیونکہ بندہ کو بندوں کے حق کے بدلہ میں قید کیا جاتا ہے تو اللہ کے حق کے بدلہ میں بندہ کو قید کرنے کا زیادہ حق ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس کو اس حد تک مارا جائے کہ اس کا خون بہنے لگے۔ [۱]

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: امام محبوبیؒ نے کہا ہے کہ تارک نماز کو مارا جائے' اور "حلیہ" میں لکھا ہے کہ یہی مذہب ہے اور کہا: بشمول زہریؒ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ تارک نماز کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر تعزیر لگائی جائے گی اور اس کو قید میں رکھا جائے گا حتی کہ وہ مر جائے یا توبہ کرے۔ [۲]

خرچ کرنے سے کیا مراد ہے

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں آیت (وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ) 8۔الانفال:3) کے معنی زکوۃ ادا کرنے کے ہیں۔ابن عباسؓ بن مسعودؓ اور بعض صحابہؓ نے کہا ہے اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا ہے۔خرچ میں قربانی دینا قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔اپنی استعداد کے مطابق بھی شامل ہے جو زکوۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے۔حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ زکوۃ کی سات آیتیں جو سورہ برات میں ہیں ان کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق تھوڑا بہت جو میسر ہو دیتے رہیں۔قتادہؒ فرماتے ہیں یہ مال تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے عنقریب تم

۱۔(الدرالمختار علی ردالمختار ج۱ ص ۲۳۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱٤۰۷ھ)

۲۔(الدرالمختار علی ردالمختار ج۱ ص ۲۳۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱٤۰۷ھ)

سے جدا ہو جائے گا۔ اپنی زندگی میں اسے اللہ کی راہ میں لگا دو۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے زکوۃ میں اہل وعیال کا خرچ اور جن لوگوں کو دینا ضروری ہے ان سب کو دینا بھی شامل ہے اس لیے کہ پروردگار نے ایک عام وصف بیان فرمایا اور عام تعریف کی ہے۔ لہٰذا ہر طرح کا خرچ شامل ہوگا۔ (۱)

احادیث میں انفاق فی سبیل اللہ پر بہت زور دیا گیا ہے جیسا کہ سیدہ اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں فرمایا: "خرچ کرتی رہو، گن گن کر نہ دو، ورنہ اللہ بھی گن گن کر دے گا، ہاتھ نہ روکو، ورنہ اللہ بھی تم سے ہاتھ روک لے گا۔" (۲)

انفاق فی سبیل اللہ ایسی پر عظمت صفت ہے کہ اس پر رشک کیا جانا چاہیے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دو آدمیوں کے علاوہ کسی پر رشک نہیں کرنا چاہیے، ایک تو وہ جس کو اللہ نے مال دیا اور پھر اسے حق (کے کام) میں خرچ کرنے کی توفیق بخشی اور ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے حکمت دی، پھر وہ اس حکمت کے ذریعے فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔" (۳)

فی سبیل اللہ خرچ کرنے والوں کے لیے فرشتوں کی دعا، سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "انسانوں پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں دو فرشتے نہ اترتے ہوں، ان میں سے ایک فرشتہ یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! جس نے تیری راہ میں خرچ کیا اسے بہترین نعم

۱۔ تفسیر ابن کثیر

۲۔ [بخاری، کتاب الھبة، باب ھبة المرأة لغیر زوجھا۔۔ الخ: ۲۵۹۱۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی ال إنفاق وکراھة ال إحصاء: ۱۰۲۹]

۳۔ [بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمة: ۷۳۔ مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه۔۔ الخ: ۸۱٦]

البدل عطا کر اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! ہاتھ روک لینے والے کا مال تلف فرما دے۔“[۱]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم! خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔“[۲]

رب کی راہ میں تھوڑا خرچ بھی نار جہنم سے آزادی کا باعث بن جاتا ہے، سیدنا عدی بن حاتم ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”آگ سے بچو! اگرچہ آدھی کھجور ہی کا صدقہ میسر ہو۔“[۳]

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ ﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان

اس آیت میں متقی لوگوں کی چوتھی صفت بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگ تمام آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

۱۔[بخاری، کتاب الزکوۃ، باب قول اللہ تعالیٰ (وأ ما من أعطی واتقی): ۱٤٤۲۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فی المنفق والممسک: ۱۰۱۰]

۲۔[مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی النفقة وتبشیر المنفق بالخلف: ۹۹۳]

۳۔[بخاری، کتاب الزکوۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة ۔۔ الخ: ۱٤۱۷۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقة ۔۔ الخ: ۱۰۱٦]

وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ: متقین کی چوتھی صفت یہ بتائی کہ وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں۔ البتہ اب عمل صرف اسی پر ہوگا جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لے کر آئے، باقی سب منسوخ ہو چکیں اور پھر قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے، سو یہ ہمیشہ باحفاظت رہا ہے اور رہے گا، جبکہ دیگر کتب آج اصلی حالت میں موجود ہی نہیں، ارشاد فرمایا: (وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ كَفَّرَ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَاَصۡلَحَ بَالَهُمۡ) [محمد:۲] ”اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اس نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔“

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے تم پر نازل ہوا اور تجھ سے پہلے کے انبیاء پر نازل ہوا وہ ان سب کی تصدیق کرتے ہیں ایسا نہیں کہ وہ کسی کو مانیں اور کسی سے انکار کریں بلکہ اپنے رب کی سب باتوں کو مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں یعنی بعث وقیامت، جنت و دوزخ، حساب و میزان سب کو مانتے ہیں۔ قیامت چونکہ دنیا کے فنا ہونے کے بعد آئے گی اس لیے اسے آخرت کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جن کی پہلے ایمان بالغیب وغیرہ کے ساتھ صفت بیان کی گئی تھی انہی کی دوبارہ یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ یعنی ایماندار خواہ عرب مومن ہوں خواہ اہل کتاب وغیرہ۔ مجاہدؒ ابو العالیہؒ، ربیع بن انسؒ اور قتادہؒ کا یہی قول ہے۔ [1]

۱۔ تفسیر ابن کثیر

سیدنا ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب اہل کتاب تم سے کوئی چیز بیان کریں تو نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب، بلکہ کہو کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو تمہاری طرف نازل کیا گیا۔“ [۱]

حضرت ابوذر ؓ کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کتنی کتب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک سو چار کتب نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیث (علیہ السلام) پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور اخنوخ (حضرت ادریس (علیہ السلام) پر تیس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت ابراہیم پر دس صحائف نازل فرمائے، تورات سے پہلے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر دس صحیفے نازل فرمائے۔ تورات، انجیل۔ زبور اور فرقان نازل فرمائیں۔ [۲]

آخرت پر ایمان

یہ متقین کی پانچویں صفت ہے۔ یہاں آخرت سے مراد دارآخرت یعنی قیامت ہے نہ کہ نبوت جیسا کہ منکرین ختم نبوت کا خیال ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ (عنکبوت رکوع 7)۔ قیامت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ حشر ونشر، حساب وکتاب، جنت ودوزخ اور یوم قیامت کو جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب کچھ مانتے اور اس کے وقوع پر یقین رکھتے

۱۔[بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لاتسئلوا أہل الکتاب عن شيءٍ: ۷۳۶۲۔ مسند أحمد: ۱۳۶/۴، ح: ۱۷۲۳۰۔ أبوداؤد، کتاب العلم، باب روایۃ حدیث أہل الکتاب: ۳٦٤٤]

۲۔اس حدیث کو حسین آجری اور ابوحاتم البستی نے نقل کیا۔ تفسیر قرطبی

ہیں۔ (۱)

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد سیدنا عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس میں حاضر تھے کہ نہایت سفید کپڑوں میں ملبوس، نہایت سیاہ بالوں والا ایک شخص حاضر ہوا، اس پر سفر کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور ہم میں سے کوئی اسے جانتا بھی نہ تھا، وہ اپنے زانو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زانو سے ملا کر بیٹھ گیا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے زانوؤں پر رکھ لیے اور پوچھنے لگا: "اے محمد!۔۔ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے (کہ ایمان کیا ہے؟)" آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "یہ کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لائے۔" (۲)

﴿ أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٥ ﴾

یہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

ہدایت یافتہ لوگ

یعنی وہ لوگ جن کے اوصاف پہلے بیان ہوئے مثلاً غیب پر ایمان لانا، نماز قائم رکھنا، اللہ کے دیئے

۱۔ تفسیر جواہر القرآن

۲۔ [مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔۔ الخ: ۸]

ہوئے سے دینا۔حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو اترا اس پر ایمان لانا، آپ سے پہلے جو کتابیں اتریں ان کو ماننا، دار آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے کے لیے نیک اعمال کرنا۔ برائیوں اور حرام کاریوں سے بچنا۔ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے نور ملا، اور بیان وبصیرت حاصل ہوا اور انہی لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح ونجات ہے۔ ابن عباسؓ نے ہدایت کی تفسیر نور اور استقامت سے کی ہے اور فلاح کی تفسیر اپنی چاہت کو پالینے اور برائیوں سے بچ جانے کی ہے۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے نور، دلیل، ثابت قدمی، سچائی اور توفیق میں حق پر ہیں اور یہی لوگ اپنے ان پاکیزہ اعمال کی وجہ سے نجات، ثواب اور دائمی جنت پانے کے مستحق ہیں اور عذاب سے محفوظ ہیں۔ [۱]

یعنی وہی لوگ متقی ہیں جن میں یہ اوصاف ہونگے۔ وہی رب تعالیٰ کی طرف سے سیدھے راستے پر قائم رہیں گے اور مکمل کامیابی سے سرفراز ہونگے۔ قرآن مجید نے خوب وضاحت فرمائی ہے کہ کامیابی کا مدار صرف اور صرف 'تقویٰ' پر ہے، ارشاد فرمایا: (وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ) [البقرۃ:۱۸۹] "اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔" اور فرمایا: (فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ) [المائدۃ:۱۰۰] "پس اللہ سے ڈرو اے عقلوں والو! تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٦﴾

۱۔ تفسیر ابن کثیر

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، ان پر برابر ہے، خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

قرآن مجید میں پہلے مومنین اور متقین کی پانچ صفات بیان کیں' متقین کا حال بیان کیا کہ جو اس چشمہ ہدایت سے سیراب ہوتے ہیں اور اس کتاب سے ہدایت حاصل کرتے ہیں وہی متقی ہیں۔ دوسرے نمبر پر ان کے مقابل وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جب وہ ہدایت کو قبول نہیں کریں گے تو وہ نہ متقی بن سکتے ہیں، نہ مفلح رہ سکتے ہیں بلکہ وہ مومن کہلانے کے بھی حق دار نہیں تو یہ لوگ آگے پھر دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے بعض ان میں سے وہ تھے کہ جنہوں نے دل سے بھی قبول نہیں کیا اور اوپر سے بھی انکاری رہے جن کو شریعت کے عرف میں کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض لوگ ایسے تھے کہ جنہوں نے دل سے تو قبول نہیں کیا بلکہ اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے زبانی طور پر اقرار کر لیا اور ظاہری طور پر وہ مومنوں کی فہرست میں داخل ہو گئے جن کو شریعت کی اصطلاح میں منافقین کہا جاتا ہے، غیر مومن ہونے میں یہ دونوں شریک ہیں اس لیے اصل کے اعتبار سے تو طبقے دو ہی بنے کہ بعض مومن اور بعض کافر اس لیے انسانوں میں یہ تقسیم ثنائی ہے۔

لوگوں کی تقسیم شریعت کی نظر میں

شریعت جن طبقات کا اعتبار کرتی ہے وہ طبقے دو ہیں، ایک مومنوں کا طبقہ دوسرا کافروں کا طبقہ، اور جتنے احکام دیئے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے اسی طرح سے دو طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں باقی دنیا کے اندر جو تقسیمیں ہیں، وطنیت کے اعتبار سے تقسیم ہے، کوئی ہندوستانی ہے، کوئی پاکستانی ہے، کوئی افریقی

ہے، کوئی امریکی ہے، یا قبیلوں اور قوموں کے اعتبار سے تقسیمیں ہیں، یا رنگت کے اعتبار سے تقسیم ہے کوئی کالا ہے، کوئی گورا ہے، یا زبانوں کے اعتبار سے تقسیم ہے کوئی سندھی ہے، کوئی بلوچی ہے، یہ تقسیمیں جتنیں بھی ہیں، یہ سب انسان کی خودساختہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان تقسیموں کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے اللہ کے دین میں سب کا درجہ برابر ہے کوئی امریکی ہو، کوئی افریقی ہو، کوئی کالا ہو، کوئی گورا ہو، کوئی ہندی ہو، کوئی سندھی ہو، کوئی بھی ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کے سب انسان برابر ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر طبقات ہیں تو وہ دو ہی ہیں۔

کفر کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: لغت میں کفر کا معنی ہے: کسی شے کو چھپانا' رات کو کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کو چھپا لیتی ہے' کسان کا کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے' جو شخص نعمت کو چھپائے اور اس کا شکرادا نہ کرے اس کے فعل کو کفر اور کفران کہتے ہیں' سب سے بڑا کفر وحدانیت یا شریعت یا نبوت کا انکار کرنا ہے' قرآن مجید میں کفر کا لفظ کفران نعمت اور کفر باللہ دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں کفر' کفر بالقرآن کے معنی میں ہے' جب کافر کا لفظ مطلقا بولا جائے تو اس سے متعارف وہ شخص ہے' جو وحدانیت یا شریعت یا نبوت یا ان تینوں کا انکار کرے۔

"انذار" کا معنی ہے: کسی خطرہ سے خبردار کرنا۔ (۱)

اِنذار کے معنیٰ

۱۔ (المفردات ص ٤٣٤۔٤٣٣' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ١٣٤٢ھ)

لفظ انداز ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو جیسا کہ ابشار ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہو، اردو زبان میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے مگر درحقیقت مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے بلکہ ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بناء پر ہو جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے اسی لیے جو ڈاکو، چور ظالم، کسی انسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا، انبیاء کو خصوصیت سے نذیر کا لقب دیا جاتا ہے کہ وہ ازراہ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں انبیاء کے لیے اس لفظ کو اختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح مبلغ کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیر خواہی کے ساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے محض ایک کلمہ پہنچا دینا مقصد نہ ہو۔ [۱]

شان نزول

امام ابن جریر طبری ؒ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس ؓ کی رائے یہ ہے کہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں مدینہ میں ایک محلہ بنالیا تھا' یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور کفر پر مر گئے۔ ان کی مذمت میں یہ آیات نازل ہوئیں' حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس پر حریص تھے کہ سب لوگ ایمان لے آئیں' اور ہدایت میں آپ کی اتباع کریں' تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ وہی لوگ ایمان لائیں گے جن کے لیے ازل میں ایمان لانا مقدر ہو چکا ہے اور وہی لوگ گمراہ رہیں گے جن کے لیے ازل میں شقاوت لکھی جا چکی ہے اور حضرت انس ؓ

۱۔ تفسیر معارف القرآن

سے روایت ہے‘اس سے وہ کفار مراد ہیں جو بدر میں قتل کئے گئے۔ (۱)

علامہ بیضاوی ؒ لکھتے ہیں: اس آیت سے معین کافر مراد ہیں مثلاً ابولہب‘ ابوجہل‘ ولید بن مغیرہ اور علماء یہود ہیں۔ (۲)

حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابوجہل اور اس گھر میں سے پانچ افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور امام کلبیؒ اس سے یہود مراد لیتے ہیں۔ (۳)

اگر اس آیت سے معین کفار مراد ہوں جیسا کہ حضرت انس ؓ کی روایت ہے یا جس طرح علامہ بیضاویؒ نے نقل کیا ہے۔۱ (امام ابونعیمؒ نے دلائل النبوۃ میں اسی طرح روایت کیا ہے۔منہ) کہ اس سے ابولہب‘ ابوجہل‘ وغیرہ مراد ہیں تو یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ ہے کہ جن کے ایمان نہ لانے کی آپ نے پہلے خبر دے دی ہے وہ بہر حال ایمان نہ لا سکے اور کفر پر ہی مرے۔

اس آیت میں کَفَرُوْا سے مراد مطلق کافر مراد نہیں ہیں کیونکہ نبی کریم (علیہ السلام) کی تبلیغ پر ہزاروں کافر ایمان لائے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے بلکہ اس سے مراد خاص قسم کے کافر ہیں۔جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔یعنی وہ لوگ جو حق کو اچھی طرح سمجھ چکے اور پہچان چکے ہوں مگر محض ضد اور عناد کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہوں۔ضد و انکار کی وجہ سے ان کے ضمیر مردہ اور دل سیاہ ہو چکے ہیں اس لیے وعظ ونصیحت اور تبلیغ و انذار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ (۴)

۱۔(جامع البیان ج۱ ص۸٤‘ مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت‘۱٤۰۹ھ)

۲۔(انوار التنزیل ص ۲۳ (درسی) مطبوعہ مطبع سعیدی‘ کراچی)

۳۔(ابن کثیر 1/45)

۴۔تفسیر مدارک

بدقسمت لوگ

یعنی جولوگ حق کو پوشیدہ کرنے یا چھپا لینے کے عادی ہیں اور ان کی قسمت میں یہی ہے کہ انہیں آپ کا ڈرانا سودمند ہے اور نہ ہی نہ ڈرانا۔ یہ کبھی اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی تصدیق نہیں کریں گے جو آپ پر نازل ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس بات کی بڑی ہی حرص تھی کہ تمام لوگ ایمان دار ہوجائیں اور ہدایت قبول کرلیں لیکن پروردگار نے فرمایا کہ یہ سعادت ہر ایک کے حصہ نہیں۔ یہ نعمت بٹ چکی ہے جس کے حصے میں آئی ہے وہ آپ کی مانے گا اور جو بدقسمت ہیں وہ ہرگز ہرگز اطاعت کی طرف نہیں جھکیں گے۔ پس مطلب یہ ہے کہ جو قرآن کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم اگلی کتابوں کو مانتے ہیں انہیں ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو خود اپنی کتاب کو بھی حقیقتاً نہیں مانتے کیونکہ اس میں تیرے ماننے کا عہد موجود ہے تو جب وہ اس کتاب کو اور اس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نصیحت کو نہیں مانتے جس کے ماننے کا اقرار کرچکے تو بھلا وہ تمہاری باتوں کو کیا مانیں گے۔ واللہ اعلم۔ [1]

اس کی وجہ اگلی آیت میں یہ بتلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے سوچنے سمجھنے کے جتنے راستے تھے وہ سب بند ہیں اس لیے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا بے فائدہ ہے۔

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ

۱۔ تفسیر ابن کثیر

غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

گناہوں کی دنیوی سزا سلب توفیق

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفر اور ہر گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملے گی مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی مل جاتی ہے پھر دنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاح حال کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے فکر ہو کر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی برائی کا احساس بھی اس کے دل سے جاتا رہتا ہے ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا ارشاد ہے ان من جزاء السیۃ السیۃ بعدھا وان من جزاء الحسنۃ الحسنۃ بعدھا یعنی گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے جس طرح نیکی کا نقد بدلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے۔ [۱]

حضرت سدیؒ فرماتے ہیں ختم سے مراد طبع ہے یعنی مہر لگا دی حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں یعنی ان پر شیطان غالب آ گیا وہ اسی کی ماتحتی میں لگ گئے یہاں تک کہ مہر الٰہی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر لگ گئی اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ہدایت کو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ گناہ لوگوں کے دلوں میں بستے جاتے ہیں اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ بس یہی

۱۔ تفسیر معارف القرآن

طبع اور ختم یعنی مہر ہے۔دل اور کان کے لیے محاورہ میں مہر آتی ہے۔مجاہدؒ فرماتے ہیں قرآن میں ران کا لفظ ہے طبع کا لفظ ہے اور اقفال کا لفظ ہے۔ران طبع سے کم ہے اور طبع اقفال سے کم ہے، اقفال سب سے زیادہ ہے۔حضرت مجاہدؒ نے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے اور بندے کے گناہ کی وجہ سے وہ سمٹ جاتا ہے اور بند ہو جاتا ہے۔اس طرح کہ ایک گناہ کیا تو گویا چھنگلیا بند ہو گئی پھر دوسرا گناہ کیا دوسری انگلی بند ہو گئی یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو گئیں اور اب مٹھی بالکل بند ہو گئی جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔اسی طرح گناہوں سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں مہر لگ جاتی ہے پھر اس پر کسی طرح حق اثر نہیں کرتا۔اسے زین بھی کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ تکبر کی وجہ ان کا حق سے منہ پھیر لینا بیان کیا جا رہا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس بات کے سننے سے بہرا بن گیا۔مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکبر اور بے پرواہی کر کے اس نے اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں یہ مطلب ٹھیک نہیں اس لیے کہ یہاں تو خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ [1]

یہ مہر کیسے لگتی ہے؟ اس کی وضاحت حدیث میں ہے، سیدنا ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بیشک بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے، پھر جب وہ اس گناہ سے دور ہو جاتا ہے، معافی مانگ لیتا اور توبہ کر لیتا ہے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ اس گناہ کو دوبارہ کرتا ہے تو اس نقطے کو بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ سیاہی پورے دل پر چھا جاتی ہے اور یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ نے (اس آیت میں) کیا ہے: (كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ) [المطففين: ١٤] "ہرگز نہیں،

۱۔ تفسیر ابن کثیر

بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے۔“ [۱]

سیدنا حذیفہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”دلوں پر فتنے اس طرح وارد ہوں گے (ایک کے بعد ایک) جیسے چٹائی کے تنکے ایک کے بعد ایک ہوتے ہیں۔ جو دل انھیں قبول کرلے گا اس میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوجائے گا اور جو دل انھیں قبول کرنے سے انکار کردے گا اس میں ایک سفید نقطہ پیدا ہوجائے گا، حتیٰ کہ دل دو طرح کے ہوجائیں گے، یا تو دل چٹان کی طرح سفید ہوگا کہ جب تک آسمان وزمین باقی رہیں گے کوئی فتنہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا، یا دل سیاہ ہوکر الٹے کوزے کی طرح ہوجائے گا کہ وہ نیکی کو نیکی اور برائی کو برائی نہیں سمجھے گا۔“ [۲]

حضرت سیدنا نواس بن سمعان ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا کیا کرتے تھے: (يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ! ثَبِّتْ قُلُوبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ) ”اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔“ [۳]

حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: روز قیامت دنیا میں سب سے زیادہ ناز ونعمت میں پلنے والے جہنمی کو لاکر آگ میں غوطہ دیا جائے گا پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا تو نے کبھی کوئی بہتری دیکھی؟ کیا تجھے کوئی نعمت ملی؟ تو وہ کہے گا: اللہ کی قسم! اے میرے رب میں نے کوئی نعمت نہیں دیکھی۔ پھر ایک جنتی کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ

۱۔[ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورہ ویل للمطففین: ۳۳۳٤۔ ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر الذنوب: ٤۲٤٤۔ کتاب التوبۃ لابن أبی دنیا: ۱۹۱]

۲۔[مسلم، کتاب الإیمان، باب رفع الأمانۃ والإیمان ۔۔ الخ: ۱٤٤]

۳۔[ابن حبان: ۹٤۳۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء أن القلوب بین أصبعی الرحمن: ۲۱٤۰]

تکلیفوں میں رہا اسے جنت میں داخل کر کے پوچھا جائے گا اے ابن آدم! کیا تو نے کبھی کوئی تکلیف اور سختی دیکھی؟ وہ عرض کرے گا نہیں اللہ کی قسم! مجھے کبھی کوئی تکلیف اور مصیبت نہیں آئی۔" [۱]

اگر سوال کیا جائے جب ان کے دلوں پر اللہ ہی نے مہر لگا دی تو پھر ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی طرف مہر لگانے کی نسبت بیان نتیجہ کے طور پر ہے ورنہ اس مہر کے لگنے کا سبب خود وہ کفار ہیں جیسے اللہ نے فرمایا: بل طبع اللہ علیھا بکفرھم، یعنی اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگائی۔ (سورہ نساء) یعنی ان کا کفر اور ہٹ دھرمی ہی ان کے دلوں پر مہر لگنے کا سبب ہوئی۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۸ ﴾

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ہرگز مومن نہیں۔

ابن جریج ؒ نے مجاہدؒ سے روایت کیا ہے، فرمایا: سورہ بقرہ میں مومنین کے بارے چار آیات نازل ہوئیں، دو آیات کافروں کے بارے نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے بارے نازل ہوئیں۔

اسباط نے سدیؒ سے ومن الناس کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ [۲]

۱۔(رواہ مسلم: کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب صبغ أنعم أهل الدنيا في النار۔۔۔)

۲۔تفسیر قرطبی

(آیت) ”الیوم الاخر“ سے مراد حشر سے لے کر غیر متناہی مدت ہے یا روز حشر سے لے کر جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا زمانہ مراد ہے۔

شان نزول

یہ لوگ یہود میں سے کعب بن اشرف، حیی بن اخطب اور جدی بن اخطب ہیں ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مکہ مکرمہ کے مشرکین عتبہ، شیبہ، اور ولید مراد ہیں، یہ لوگ علانیہ اور ظاہری طور پر ایمان لاتے ہیں اور ہمارے ایمان باللہ اور بعث بعد الموت (مرنے کے بعد اٹھائے جانے) جس میں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا تصدیق کرتے ہیں، مگر قلبی طور پر وہ مومن نہیں اور اپنے ایمان لانے کے دعوے میں سچے نہیں ہیں۔[۱]

نفاق کا آغاز

امام ابن جریجؒ فرماتے ہیں ”منافق کا قول اس کے فعل کے خلاف، اس کا باطن ظاہر کے خلاف اس کا آنا جانے کے خلاف اور اس کی موجودگی عدم موجودگی ہوا کرتی ہے۔ نفاق مکہ شریف میں تو تھا ہی نہیں بلکہ اس کے الٹ تھا یعنی بعض لوگ ایسے تھے جو زبردستی بظاہر کافروں کا ساتھ دیتے تھے مگر دل میں مسلمان ہوتے تھے۔ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہجرت کر کے مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے اور یہاں پر اوس اور خزرج کے قبائل نے انصار بن کر آپ کا ساتھ دیا اور جاہلیت کے زمانہ کی مشرکانہ بت پرستی ترک کردی اور دونوں قبیلوں میں سے خوش نصیب لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے لیکن یہودی اب

۱۔ تفسیر ابن عباس

تک اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم تھے۔ ان میں سے صرف حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس سچے دین کو قبول کیا تب تک بھی منافقوں کا خبیث گروہ قائم نہ ہوا تھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان یہودیوں اور عرب کے بعض قبائل سے صلح کر لی تھی۔ غرض اس جماعت کے قیام کی ابتدا یوں ہوئی کہ مدینہ شریف کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، بنو قینقاع تو خزرج کے حلیف اور بھائی بند بنے ہوئے تھے اور باقی دو قبیلوں کا بھائی چارہ اوس سے تھا۔ جب جنگ بدر ہوئی اور اس میں پروردگار نے اپنے دین والوں کو غالب کیا۔ شوکت و شان اسلام ظاہر ہوئی، مسلمانوں کا سکہ جم گیا اور کفر کا زور ٹوٹ گیا تب یہ ناپاک گروہ قائم ہوا چنانچہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا تو خزرج کے قبیلے سے لیکن اوس اور خزرج دونوں اسے اپنا بڑا مانتے تھے بلکہ اس کی باقاعدہ سرداری اور بادشاہت کے اعلان کا پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ ان دونوں قبیلوں کا رخ اسلام کی طرف پھر گیا اور اس کی سرداری یونہی رہ گئی۔ یہ خار تو اس کے دل میں تھا ہی، اسلام کی روز افزوں ترقی میں لڑائی اور کامیابی نے اسے مخبوط الحواس بنا دیا۔ اب اس نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلے گا اس نے بظاہر اسلام قبول کر لینے اور باطن میں کافر رہنے کی ٹھانی اور جس قدر جماعت اس کے زیر اثر تھی سب کو یہی ہدایت کی، اس طرح منافقین کی ایک جمعیت مدینہ کے آس پاس قائم ہو گئی۔ ان منافقین میں بحمد للہ مکی مہاجر ایک بھی نہ تھا بلکہ یہ بزرگ تو اپنے اہل و عیال، مال و متاع کو نام حق پر قربان کر کے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ساتھ دے کر آئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں" یہ منافق اوس اور خزرج کے قبیلوں میں سے تھے اور یہودی بھی جو ان کے طریقے پر تھے۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے نفاق کا ان آیتوں میں بیان ہے۔" ابو العالیہؒ، حضرت حسنؒ، قتادہؒ، سدیؒ نے یہی بیان کیا ہے۔ پروردگار عالم نے منافقوں کی بہت سی

بدخصلتوں کا یہاں بیان فرمایا۔ تاکہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آجائیں اور انہیں مسلمان خیال کر کے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں۔ جس کی وجہ سے کوئی بڑا فساد پھیل جائے۔ یہ یاد رہے کہ بدکاروں کو نیک سمجھنا بھی بجائے خود بہت برا اور نہایت خوفناک امر ہے جس طرح اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ زبانی اقرار تو ضرور کرتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں ہوتا۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ، دل میں کچھ، عمل کچھ، عقیدہ کچھ، صبح کچھ اور شام کچھ کشتی کی طرح جو ہوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی ادھر۔ (۱)

سیدنا عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ ہوں وہ خالص منافق ہوتا ہے اور جس شخص میں ان خصلتوں میں سے کوئی ایک ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ (وہ خصلتیں یہ ہیں) جب اسے امانتدار سمجھا جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ کہے، جب عہد کرے تو اسے توڑ ڈالے اور جب جھگڑے تو بدزبانی کرے۔" (۲)

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "منافق کی مثال اس بکری کی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان ماری ماری پھرتی ہو، کبھی اس ریوڑ میں آتی ہو اور کبھی اس میں۔" (۳)

۱۔ تفسیر ابن کثیر

۲۔ [بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳٤۔ مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۵۸]

۳۔ [مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صفات المنافقین واُحکامھم: ۲۷۸٤]

﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ ﴾

وہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو حالانکہ وہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے آپ کو اور وہ نہیں سمجھتے۔

(یخدعون): وہ دھوکہ دیتے ہیں، وہ دل میں بری بات چھپاتے ہیں، یہ خدع سے بنا ہے جس کے معنی پوشیدہ کرنے کے ہیں، خدع اسے کہتے ہیں کہ کسی کو اس مکروہ اور ناپسندیدہ بات کے بارے میں دھوکہ میں رکھنا جیسے وہ دل میں چھپائے ہوئے ہو۔ [۱]

(یشعرون): وہ شعور رکھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں، یہ شعور سے بنا ہے جس کے معنی بوجھنے کے ہیں، یہاں اس سے اندرونی احساس مراد ہے مطلب یہ ہے کہ منافقین خود ہی فریب میں مبتلا ہیں اور انہیں اپنی اس حماقت کی خبر نہیں۔

منافقین کا اللہ اور رسول کو دھوکہ دینے کی کوشش کرنا

ہمارے علماء نے فرمایا: یخدعون اللہ کا معنی ہے: وہ اپنے گمان اور خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لیے فرمایا کیونکہ ان کا عمل، ایک دھوکا دینے والے کے عمل جیسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے۔ اصل میں ہے یخادعون رسول اللہ (صلی اللہ علیہ

۱۔ (تفسیر مظہری ۲۰۔۱)

وآلہ وسلم)۔ وہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ حسنؒ وغیرہ سے مروی ہے، ان کے رسول اللہ کو دھوکا دینے کو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے مترادف فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کے ساتھ بلایا۔ اسی طرح جب انہوں نے مومنین کو دھوکا دیا تو یقیناً انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیا۔ ان کا دھوکا یہ تھا کہ وہ ایمان ظاہر کرتے تھے جبکہ ان کے دلوں میں کفر تھا۔ یہ وہ اس لیے کرتے تھے تاکہ اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں اور وہ گمان کرتے تھے کہ وہ نجات پا گئے اور انہوں نے دھوکا دے دیا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ [۱]

منافقین کا دھوکہ یہ تھا کہ ان کے دل میں کفر تھا اور زبان سے "امنا" (ہم ایمان لائے) کہہ کر جھوٹ بولتے تھے، جو خبر واقع کے مطابق نہ ہو وہ جھوٹ ہے، جھوٹ بولنا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنے پر دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

امام ابوداؤدؒ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ، کیونکہ جھوٹ فجور (گناہ) تک پہنچاتا ہے اور فجور دوزخ تک پہنچاتا ہے، ایک شخص جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ کے مواقع تلاش کرتا ہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کو کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔ [۲]

امام مسلمؒ روایت کرتے ہیں: حضرت حفص بن عاصمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ سنی سنائی بات کو بیان کردے۔ [۳]

۱۔ تفسیر قرطبی احکام القرآن

۲۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۲۵، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور ۱۴۰۵ھ)

۳۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۸، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: آخر زمانہ میں ایسے دجال اور کذاب ہوں گے جو تم سے ایسی احادیث بیان کریں گے جو تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے، تم ان سے دور رہو وہ تم سے دور رہیں' کہیں وہ تم گمراہ نہ کر دیں اور فتنے میں مبتلا نہ کر دیں۔ (۱)

امام احمدؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس وقت تک بندہ کا ایمان مکمل نہیں ہوگا' جب تک کہ وہ جھوٹ کو ترک نہ کر دے حتی کہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے اور ریا کو ترک کر دے خواہ وہ اس میں صادق ہو۔ (۲)

امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں: حضرت سمرہ بن جندبؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمایا: میں نے رات کو خواب میں دیکھا ہے کہ جبرائیل (علیہ السلام) اور میکائیل (علیہ السلام) میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ارض مقدسہ میں لے گئے میں نے دیکھا وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا آدمی اس کے پاس کھڑا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں لوہے کا آنکڑا تھا' اس نے وہ آنکڑا اس کی باچھ میں داخل کیا اور آنکڑے سے اس کی باچھ کو کھینچ کر گدی تک پہنچا دیا' پھر وہ آنکڑا دوسری باچھ میں داخل کیا اور اس باچھ کو گدی تک پہنچا دیا' اتنے میں پہلی باچھ مل گئی اور اس نے پھر اس میں آنکڑا ڈال دیا' (الی قولہ) جبرائیل (علیہ السلام) نے کہا: جس شخص کی باچھ پھاڑ کر گدی تک پہنچائی جا رہی تھی یہ وہ شخص ہے جو جھوٹ بولتا تھا' پھر اس سے وہ جھوٹ نقل ہو کے ساری دنیا میں پھیل جاتا تھا' اس کو قیامت تک اسی طرح عذاب دیا جاتا رہے گا۔ (۳)

۱۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

۲۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۴۔۳۵۲' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

۳۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ ﴾

ان کے دلوں میں بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بسبب جو وہ جھوٹ بولتے تھے۔

امام ابن اسحاق ؒ، ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم ؒ نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے کہ مرض سے مراد شک ہے اور لفظ آیت "فزادھم اللہ مرضا" یعنی زیادہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو شک میں۔ (۱)

امام ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتم ؒ نے حضرت ابن عباس ؓ لفظ آیت "فی قلوبھم" سے مراد ہے نفاق اور "ولھم عذاب الیم" سے مراد ہے عبرت ناک اور دردناک (عذاب) اور لفظ آیت "بما کانوا یکذبون" سے مراد ہے وہ بدلتے ہیں اور تحریف کرتے ہیں۔ (۲)

شک وشبہ بیماری ہے

بیماری سے مراد یہاں شک وشبہ ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ حضرت ابن مسعود ؓ اور چند صحابہ سے یہی مروی ہے۔ حضرت مجاہدؒ، عکرمہؒ، حسن بصریؒ، ابوالعالیہؒ، ربیع بن انسؒ، قتادہؒ، کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عکرمہ ؒ اور طاؤسؒ نے اس کی تفسیر سے ریا اور ابن عباس ؓ سے اس کی تفسیر نفاق بھی مروی ہے۔ زید بن اسلم ؒ فرماتے ہیں یہاں دینی بیماری مراد ہے نہ کہ جسمانی۔ انہیں اسلام میں شک کی بیماری تھی اور ان کی

۱۔ تفسیر الدر منشور

۲۔ تفسیر الدر منشور

ناپاکی میں اللہ تعالیٰ نے اور اضافہ کردیا۔ جیسے قرآن میں اس کا ذکر ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ ہے۔ آیت (فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○) 9۔ التوبہ :125-124) یعنی ایمان والوں کے ایمان کو تقویت پہنچاتی اور وہ خوشیاں مناتے ہیں لیکن بیماری والوں کی ناپاکی اور پلیدی کو اور زیادہ کردیتی ہے یعنی اس کی ابدی اور گمراہی بڑھ جاتی ہے، یہ بدلہ بالکل ان کے عمل کے مطابق ہے۔ یہ تفسیر ہی درست ہے، ٹھیک اسی کے مثل یہ فرمان بھی ہے آیت (وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ)47۔محمد:17) یعنی ہدایت والوں کو ہدایت میں بڑھا دیتا ہے اور ان کو تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ دونوں خصلتیں ان میں تھیں جھٹلاتے بھی تھے اور جھوٹے بھی تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض منافقوں کو اچھی طرح جاننے کے باوجود بھی قتل نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمرؓ سے فرمایا میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں یہ چرچے ہوں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کرڈالتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو اعرابی آس پاس ہیں انہیں یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ ان منافقوں کے پوشیدہ کفر کی بنا پر انہیں قتل کیا گیا ہے ان کی نظریں تو صرف ظاہر داری پر ہوں گی جب ان میں یہ بات مشہور ہوجائے گی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں تو خوف ہے کہ کہیں وہ اسلام کے قبول کرنے سے رک نہ جائیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں ہمارے علماء وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ ٹھیک اسی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آیت (مولفتہ القلوب) کو جن کے دل اسلام کی جانب مائل کئے جاتے تھے۔ مال عطا فرمایا کرتے تھے حالانکہ آپ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے تھے کہ ان کے اعتقاد بد ہیں۔ حضرت امام مالکؒ بھی منافقوں کو قتل نہ کرنے کی یہی وجہ بیان فرماتے ہیں جیسے محمد بن جہمؒ، قاضی اسماعیلؒ اور ابہریؒ نے نقل کیا ہے۔ حضرت امام مالکؒ سے بقول ابن ماجشونؒ ایک وجہ یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ یہ اس لیے تھا کہ آپ کی امت کو معلوم ہو جائے کہ حاکم صرف اپنے علم کی بناء پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں گو علماء کا تمام مسائل میں اختلاف ہو لیکن اس مسئلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ قاضی صرف اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ حضرت امام شافعیؒ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا منافقین کو قتل کرنے سے رکنے کا سبب ان کا اپنی زبان سے اسلام کو ظاہر کرنا تھا گو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کا علم تھا کہ ان کے دل اس کے الٹ ہے لیکن ظاہری کلمہ اس پہلی بات کی تردید کرتا تھا جس کی تائید میں بخاری مسلم وغیرہ کی یہ حدیث بھی پیش کی جا سکتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں جب وہ اسے کہہ دیں تو وہ مجھ سے اپنی جان اور مال کی امان پالیں گے اور ان کا حساب اللہ عزوجل پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ شریف کے کہتے ہی ظاہری احکام اسلام ان پر جاری ہو جائیں گے۔ اب اگر ان کا عقیدہ بھی اس کے مطابق ہے تو آخرت والے دن نجات کا سبب ہوگا ورنہ وہاں کچھ بھی نفع نہ ہوگا لیکن دنیا میں تو مسلمانوں کے احرام ان پر جاری رہیں گے گو یہ لوگ یہاں مسلمانوں کی صفوں میں اور ان کی فہرست میں نظر آئیں گے لیکن آخرت میں عین پل صراط پر ان سے دور کر دیئے جائیں گے اور اندھیروں میں حیران و پریشان ہوتے ہوئے با آواز بلند مسلمانوں کو پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ لیکن انہیں جواب ملے گا کہ تھے تو سہی مگر تم فتنوں میں پڑ گئے اور انتظار میں ہی رہ گئے اور اپنی من مانی

خواہشوں کے چکر میں پڑ گئے یہاں تک کہ حکم الٰہی آ پہنچا۔ غرض دارِ آخرت میں بھی مسلمانوں کے پیچھے پڑے لپٹے رہیں گے لیکن بالآخران سے الگ کر دیئے جائیں گے اور ان کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا وہ چاہیں گے کہ مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑیں لیکن سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ جیسے کہ احادیث میں مفصل بیان آ چکا ہے۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ ان کے قتل نہ کئے جانے کی یہ وجہ تھی کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی موجودگی میں ان کی شرارتیں چل نہیں سکتی تھیں۔ مسلمانوں کو باری تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ ان کی برائیوں سے محفوظ کر لیتا تھا لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد اگر اللہ نہ کرے ایسے لوگ ہوں گے ان کا نفاق کھل جائے اور مسلمان بخوبی معلوم کر لیں تو وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ حضرت امام مالک ؒ کا فتویٰ ہے کہ نفاق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں تھا لیکن آج کل وہ بے دینی اور زندیقیت ہے یہ بھی یاد رہے کہ زندیق جو لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو اور وہ زندیق جو معلم نہ ہو ان دونوں میں فرق کیا جائے گا یا نہیں؟ اور یہ ارتداد کئی مرتبہ ہوا تب یہ حکم ہے یا صرف ایک مرتبہ ہونے پر ہی؟ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اسلام لانا اور رجوع کرنا خود اس کی اپنی طرف سے ہو یا اس پر غلبہ پا لینے کے بعد بھی یہی حکم ہے؟ غرض اس باتوں میں اختلاف ہے لیکن اس کے بیان کی جگہ احکام کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیریں۔ چودہ شخصوں کے نفاق کا تو آپ کو قطعی علم تھا، یہ وہ بد باطن لوگ تھے جنہوں نے غزوہ تبوک میں مشورہ کر کے یہ امر طے کر لیا تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ دغا بازی کریں اور آپ کے قتل کی پوری سازش کر چکے تھے طے ہوا تھا کہ رات کے اندھیرے میں جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فلاں گھاٹی کے قریب پہنچیں تو آپ کی اونٹنی کو بدکا دیں اور بھڑک کر بھاگے گی تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھاٹی میں گر پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے

اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف اسی وقت وحی بھیج کران کی اس ناپاک سازش کا علم عطا کر دیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حذیفہؓ کو بلا کراس واقعہ کی خبر دی اوران غداروں کے نام بھی بتلا دیئے پھر بھی آپ نے ان کے قتل کے احکام صادر نہ فرمائے۔ ان کے سوا اور منافقوں کے ناموں کا آپ کو علم نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے آیت (وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ) 9۔التوبہ:101) یعنی تمہارے آس پاس کے بعض اعرابی منافق ہیں اور بعض سرکش منافق مدینہ میں بھی ہیں تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا آیت (لَّئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا) 33۔الاحزاب:60) اگرچہ منافق گندے دل والے اور فساد وتکبر والے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی انہیں نہ چھوڑیں گے اور مدینہ میں بہت کم باقی رہ سکیں گے بلکہ ان پر لعنت کی جائے گی جہاں پائے جائیں گے، پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان منافقوں کا علم نہ تھا کہ کون کون ہے؟ ہاں ان کی مذموم خصلتیں جو بیان ہوئی تھیں یہ جس میں پائی جاتی تھیں اس پر نفاق صادق آتا تھا۔ جیسے اور جگہ ارشاد فرمایا آیت (وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ) 47۔محمد:30) یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم تمہیں ان کو دکھا دیں لیکن تم ان کی نشانیوں اور ان کی دبی بچی زبان سے ہی انہیں پہچان لو گے ان منافقوں میں سب سے زیادہ مشہور عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ حضرت زید بن ارقمؓ نے اس کی منافقانہ خصلتوں پر

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے گواہی بھی دی تھی باوجود اس کے جب وہ مر گیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے جنازے کی نماز پڑھائی اور اس کے دفن میں شرکت کی۔ٹھیک اسی طرح اور مسلمان صحابیوں کے ساتھ بلکہ حضرت عمر بن خطابؓ نے جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ذرا زور سے یاد دلایا تو آپ نے فرمایا میں نہیں چاہتا کہ لوگ چہ میگوئیاں کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابیوں کو مار ڈالا کرتے ہیں اور ایک صحیح روایت میں ہے استغفار کرنے یا نہ کرنے کا مجھے اختیار دیا گیا۔تو میں نے استغفار کو پسند کیا۔ایک اور روایت میں ہے" اگر ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے میں بھی اس کی بخشش جانتا تو یقیناً اس سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔" [۱]

سیدنا جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں تھے، اتفاق سے وہاں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو لات ماردی۔ انصاری پکار اٹھا، اے انصاریو! دوڑو۔ مہاجر پکارنے لگا، اے مہاجرو! ادھر آؤ۔ دونوں کی یہ بات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سن لی، آپ نے پوچھا: "یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟" لوگوں نے کہا، یا رسول اللہ! ایک مہاجر نے ایک انصاری کو لات ماردی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایسی باتیں (جن سے باہمی فساد اور خانہ جنگی ہو) چھوڑ دو، یہ ناپاک باتیں ہیں۔" عبداللہ بن ابی منافق نے اس تکرار کی خبر سنی (جو مہاجر اور انصاری میں ہوگئی تھی) تو کہنے لگا، مہاجرین اپنی حکومت جتانے لگے ہیں، اللہ کی قسم! اگر ہم واپس مدینہ پہنچے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔ یہ بات جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک پہنچی تو سیدنا عمر بن خطابؓ نے کہا، یا رسول اللہ! حکم دیجیے! میں اس منافق کی گردن اتار دوں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ

۱۔تفسیر ابن کثیر سورہ بقرہ آیت ۱۰

وسلم) نے فرمایا: "اسے چھوڑیے! لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود ہی اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔" جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ تشریف لائے تھے اس وقت انصار مہاجرین سے زیادہ تھے، پھر اس کے بعد مہاجرین زیادہ ہو گئے۔ [۱]

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۙ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت مچاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔

منافقین کا فساد کو اصلاح قرار دینا

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے کہ یہ بیان بھی منافقوں سے ہی متعلق ہے ان کا فساد، کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تھی مطلب یہ ہے کہ زمین میں اللہ کی نافرمانی کرنا یا نافرمانی کا حکم دینا زمین میں فساد کرنا ہے اور زمین و آسمان میں اصلاح سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ انہیں جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روکا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو ہدایت و اصلاح پر ہیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں اس خصلت کے لوگ اب تک نہیں آئے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۱۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ (سوآء علیہم أستغفرت لہم):٤٩٠٥]

کے زمانہ میں یہ بدخصلت لوگ تھے تو سہی لیکن اب جو آئیں گے وہ ان سے بھی بدتر ہوں گے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس وصف کا کوئی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں تھا ہی نہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ان منافقوں کا فساد برپا کرنا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے تھے جس کام سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا تھا، اسے کرتے تھے۔ فرائض ربانی ضائع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سچے دین میں شک وشبہ کرتے تھے۔ اس کی حقیقت اور صداقت پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے۔ مومنوں کے پاس آ کر اپنی ایمانداری کی ڈینگیں مارتے تھے حالانکہ دل میں طرح طرح کے وسوسے ہوتے تھے موقع پا کر اللہ کے دشمنوں کی امداد واعانت کرتے تھے اور اللہ کے نیک بندوں کے مقابلہ میں ان کی پاسداری کرتے تھے اور باوجود اس مکاری اور مفسدانہ چلن کے اپنے آپ کو مصلح اور صلح کل کے حامی جانتے تھے۔ قرن کریم نے کفار سے موالات اور دوستی رکھنے کو بھی زمین میں فساد ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے آیت (وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ) 8۔ الانفال:73) یعنی کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم ایسا نہ کرو گے یعنی آپس میں دوستی نہ کرو گے تو اس زمین میں بھاری فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ اس آیت نے مسلمان اور کفار کے دوستانہ تعلقات منقطع کر دیئے اور جگہ فرمایا اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی تم پر کھلی حجت ہو جائے یعنی تمہاری دلیل نجات کٹ جائے۔ پھر فرمایا منافق لوگ تو جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے اور ہرگز تم ان کے لیے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ چونکہ منافقوں کا ظاہر اچھا ہوتا ہے، اس لیے مسلمانوں سے حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے وہ ایمانداروں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دے دیتے ہیں اور ان کے بے حقیقت کلمات اور

کفار سے پوشیدہ دوستیوں سے مسلمانوں کو خطرناک مصائب جھیلنے پڑتے ہیں پس بانی فساد یہ منافقین ہوئے۔ اگر یہ اپنے کفر پر ہی رہتے تو ان کی خوفناک سازشوں اور گہری چالوں سے مسلمانوں کو اتنا نقصان ہرگز نہ پہنچتا اور اگر پورے مسلمان ہوجاتے اور ظاہر باطن یکساں کر لیتے تب تو دنیا کے امن وامان کے ساتھ آخرت کی نجات وفلاح بھی پا لیتے باوجود اس خطرناک پالیسی کے جب انہیں یک سوئیکی نصیحت کی جاتی تو جھٹ کہہ اٹھتے کہ ہم تو صلح کل ہیں ہم کسی سے بگاڑنا نہیں چاہتے، ہم فریقین کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے" ہم ان دونوں جماعتوں یعنی مومنوں اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے والے ہیں۔"لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ان کی نری جہالت ہے جسے یہ صلح سمجھتے ہیں وہ عین فساد ہے لیکن انہیں شعور ہی نہیں۔ [1]

سیدنا زید بن ارقمؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک غزوہ میں شریک تھا، میں نے عبداللہ بن ابی کو یہ کہتے ہوئے سنا، لوگو! تم ایسا کرو کہ جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہیں انھیں کچھ نہ دو، تو وہ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چھوڑ کر اس کے پاس سے الگ ہوجائیں گے اور اگر ہم اس لڑائی سے لوٹ کر مدینہ پہنچے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔ میں نے عبداللہ بن ابی کی یہ بات اپنے چچا (سعد بن عبادہؓ یا سیدنا عمرؓ سے بیان کی۔ انھوں نے یہ بات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بلایا اور میں نے یہ واقعہ بیان کردیا۔ آپ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلوایا مگر وہ مکر گئے اور قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے ہرگز ایسا نہیں کہا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے جھوٹا اور عبداللہ بن ابی کو سچا جانا،

۱۔ تفسیر ابن کثیر

مجھے اتنا رنج ہوا کہ کبھی ویسا رنج نہیں ہوا تھا۔ پھر میں گھر میں بیٹھ گیا، میرے چچا نے کہا، میرا خیال نہیں تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہاری تکذیب کریں گے اور تم پر ناراض ہونگے۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورہ منافقون نازل کی۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بلایا اور سورہ منافقون پڑھ کر سنائی۔ فرمایا: ”زید! اللہ نے تجھ کو سچا کیا۔“ [1]

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾

خبردار بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے۔

اَلَا: کلمہ تنبیہ ہے جس طرح اردو میں ”خبردار ہو جاؤ“ ”آگاہ رہو“ ”یاد رکھو“ کے الفاظ بولے جاتے ہیں اس طرح اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی میں الا، کا استعمال ہوتا ہے۔ لفظ ”اجی“ بھی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں۔ الانھم ھم المفسد ون۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یقیناً یہی لوگ مفسد ہیں۔ کہ کفر اور ایمان اور شرک اور توحید کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور جس کفر وشرک کے فتنہ اور فساد کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا ہے یہ فتنہ پرداز۔ پھر اسی فساد کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانا چاہتے ہیں لیکن قلبی مرض کی وجہ سے ان کا باطنی احساس اس درجہ مختل ہو گیا ہے کہ اصلاح اور فساد کے فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ دین حق فتنہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہی فتنہ اور فساد ہے۔ اسی کے مٹانے اور اسی کی اصلاح کے لیے حضرات انبیاء مبعوث ہوئے اور کفر اور شرک ہی

۱۔ [بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ (إذا جاءک المنافقون قالوا نشهد إنک لرسول اللہ): ۴۹۰۰۔ مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صفات المنافقین وأحکامهم: ۲۷۷۲]

کے فتنہ کے استیصال کے لیے جہاد و قتال کرنا عین اصلاح ہے۔ جہاد کو فساد بتانا یہی فتنہ اور فساد ہے۔ ۱

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ ﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لے آؤ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے ہیں تو کہتے ہیں، کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں سن لو! بیشک وہ خود ہی بیوقوف ہیں اور لیکن وہ نہیں جانتے۔

امام ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ لفظ آیت "واذا قیل لہم امنوا کما امن الناس" سے مراد ہے یعنی اے منافقوں تم بھی ایسی ہی تصدیق کرو جیسی اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کی کہ وہ نبی ہیں اور رسول ہیں۔ اور جو ان پر اتارا گیا وہ حق ہے لفظ آیت " قالوا انؤمن کما امن السفہاء" (یعنی کہنے لگے کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بیوقوف ایمان لائیں ہیں۔ لفظ آیت" کما امن السفھاء" السفھاء سے اصحاب محمد مراد لیتے ہیں" الا انھم ہم السفھاء" یہاں "السفھاء" سے جہال مراد ہیں" ولکن لا یعلمون" یعنی وہ نہیں جانتے۔ ۲

۱۔ تفسیر معارف القرآن ادریس کاندھلوی
۲۔ تفسیر الدر منثور

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام پر صدق و اخلاص کے ساتھ ایمان لے آؤ، جیسا کہ اصحاب رسول ایمان لائے، بعض روایتوں میں، الناس سے مراد عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ حق شناس یہود کے نام آئے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی صداقت کو قبول کر لیا تھا، اس کے جواب میں منافقین نے صحابہؓ کو بیوقوف کہا، گویا کہ یہ طنز ہے، اس وقت کے پکے اور سچے مسلمانوں یعنی صحابہؓ پر جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، منافق اپنے نزدیک ان صحابہؓ کو بیوقوف سمجھتے تھے، ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق و راستی کی خاطر تمام ملک سے دشمنی مول لے لی جائے، ان کے خیال میں عقلمندی یہ تھی کہ آدمی حق و باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملہ میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ (الآیۃ) یہ ان کی عقلمندی کے زعم باطل کا جواب ہے، چار تاکیدوں کے ساتھ منافقوں کی سفاہت اور حماقت پر زور دے کر بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس درجہ بیوقوف ہیں کہ اپنے نفع و نقصان میں بھی تمیز نہیں کرتے۔ [1]

خود فریبی کے شکار لوگ

مطلب یہ ہے کہ جب ان منافقوں کو صحابہ کی طرح اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے، موت کے بعد جی اٹھنے، جنت دوزخ کی حقانیت کے تسلیم کرنے، اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تابعداری کر کے نیک اعمال بجالانے اور برائیوں سے رکے رہنے کو کہا جاتا ہے تو یہ فرقہ ایسے ایمان والوں کو بیوقوف قرار دیتا ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ

۱۔ تفسیر جلالین امام سیوطیؒ

اور بعض دیگر صحابہؓ، ربیعؒ، انسؓ، عبدالرحمن بن زید بن اسلمؒ وغیرہ نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ سفہاء سفیہ کی جمع ہے جیسے حکماء حکیم کی اور حلماء حلیم کی۔ جاہل، کم عقل اور نفع نقصان کے پوری طرح نہ جاننے والے کو سفیہ کہتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ ہے آیت (وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا) 4۔ النسآء :5) بیوقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دے بیٹھو جو تمہارے قیام کا سبب ہیں۔ عام مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں سفہاء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ ان منافقین کے جواب میں یہاں بھی خود پروردگار عالم نے جواب دیا اور تاکیداً حصر کے ساتھ فرمایا کہ بیوقوف تو یہی ہیں لیکن ساتھ ہی جاہل بھی ایسے ہیں کہ اپنی بیوقوفی کو جان بھی نہیں سکتے۔ نہ اپنی جہالت وضلالت کو سمجھ سکتے ہیں، اس سے زیادہ ان کی برائی اور کمال اندھاپن اور ہدایت سے دوری اور کیا ہوگی؟۔ [۱]

صحابہ معیار حق ہیں

صحابہ معیار حق ہیں: آیت نمبر ۱۳ ”آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ“ میں صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا ہے یعنی صحابہ (رضی اللہ عنہم) جیسا ایمان لاؤ، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا ایمان ایک معیار ہے صحیح اور غلط ایمان کو پرکھنے کی کسوٹی ہے آج کے منافق یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) دولت ایمان سے محروم تھے، جیسا کہ اہل تشیع کا یہی خیال ہے اللہ تعالیٰ نے جدید وقدیم منافقوں کی تردید فرمائی۔ فرمایا کہ کسی اعلیٰ ترین مقصد کے لیے دنیاوی مفادات کو قربان کر دینا بے وقوفی نہیں، عین عقلمندی اور سعادت ہے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اس سعادت مندی کا

۱۔ تفسیر ابن کثیر امام حافظ کثیر

ثبوت مہیا فرمادیا، اس لیے وہ صرف پکے مومن ہی نہیں بلکہ ایمان کے لیے ایک معیار اور کسوٹی ہیں اب ایمان انہی کا معتبر ہوگا، جو صحابہ (رضی اللہ عنہم) ہی کی طرح ایمان لائیں گے، دوسری آیت میں فرمایا" فَاِنۡ آمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ آمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا" (البقرہ:۱۳۷)۔ [1]

یہاں اس آیت کے ذیل میں چند باتیں یادرکھنا ضروری ہیں:

(۱) صحابی کی تعریف: صحابی اسے کہتے ہیں جس نے بحالت ایمان حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی ہو یا سید دو عالم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے بحالت ایمان دیکھا ہو، اور ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا ہو۔

(۲) انبیاء کے بعد افضل ترین لوگ: انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے بعد انسانوں میں سب افضل صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ہیں۔

(۳) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) میں ترتیب فضیلت: صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) میں سب سے افضل سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر سیدنا حضرت عمر فاروقؓ پھر سیدنا حضرت عثمان غنی ذوالنورینؓ پھر سیدنا حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہہؓ پھر عشرہ مبشرہ میں سے باقی چھ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) دوسرے تمام صحابہ سے افضل ہیں، ان چھ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے نام یہ ہیں: حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ۔ پھر اصحاب بدر، پھر اصحاب احد، پھر اصحاب بیعت رضوان، پھر فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے اور غزوات میں شریک ہونے والے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)، فتح مکہ کے بعد اسلام لانے

۱۔(روح المعانی:ص:۲۰۸:ج:۱:ابن کثیر:ص:۸۱:ج:۱:مظہری:ص:۲۷:ج:۱:معالم التنزیل:ص:۲۳:ج:۱:کشاف ص:۶۴:ج:۱:خازن ص:۲۹:ج:۱:مدارک:ص:۲۹:ج:۱:بحرالمحیط:ص:۶۶:ج:۱:جلالین:ص:۵:ج۱)

والے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے افضل ہیں۔

(۴) تمام صحابہ (رضی اللہ عنہم) عادل اور متقی تھے: تمام صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) عادل، مومن کامل اور جنتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (آیت) "وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ"۔ (الانفال:۷٤)

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، اور وہ جنہوں نے انہیں آباد کیا اور ان کی مدد کی سب صحیح معنی میں مومن ہیں ایسے لوگ مغفرت اور باعزت رزق کے مستحق ہیں۔

(آیت) " وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ"۔ (التوبۃ:۱۰۰)

ترجمہ: مہاجرین اور انصار میں سے وہ لوگ جو پہلے ایمان لائے اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سب سے راضی ہو گیا ہے اور وہ اس سے راضی ہیں، اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہی زبردست کامیابی ہے۔ اس آیت کی روشنی میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ، سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ، سیدنا حضرت عثمان غنی ذوالنورین ؓ، کے مہاجر ہونے کا کوئی شک ہے؟ یقیناً نہیں ہے۔ شک کرنے والے کافر اور منافق تو ہو سکتے ہیں مسلمان نہیں"۔ والصحابۃ کلھم عدول مطلقا لظواھر الکتاب

والسنة واجماع من یعتد به۔[1]

ترجمہ: اور تمام کے تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین عادل ہیں مطلقا کتاب وسنت کی ظاہری نصوص اور قابل اعتماد علماء کے اجماع کی وجہ ہے۔ لیس فی الصحابة من یکذب وغیر ثقة۔[2]

ترجمہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ جو جھوٹ بولتا ہو اور غیر معتمد ہو۔

(۶) کوئی ولی کسی صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ قیامت تک کوئی بڑے سے بڑا ولی کسی ادنی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا، جس طرح کوئی ولی یا صحابی کسی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا،۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

(آیت) " وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى "۔ (الحدید: ۱۰)

ترجمہ: تمام (صحابہ) سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں فرمایا: کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہیں۔ (القرآن)

سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! میرے صحابہ کو گالی مت دو، میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو پس اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر (اللہ کی راہ میں) سونا خرچ کر دے تو ان میں سے کسی ایک کے مٹھی برابر یا اس کے نصف کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

(۷) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے باہمی اختلافات: صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے باہمی اختلافات ومشاجرات امانت، دیانت تقوی، خشیت الٰہی اور اختلاف اجتہادی پر مبنی ہیں ان میں سے جن سے

۱۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۵۵۱۷)

۲۔ (عمدۃ القاری: ۱۰۵۲)

خطاءاجتہادی ہوئی وہ بھی اجر کے مستحق ہیں، اس لیے کہ مجتہد مخطی کو بھی ایک اجر ملتا ہے اور نہ اس سے خطاءاجتہادی پر دنیا میں مواخذہ ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

کسی شخص کو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی خطائے اجتہادی پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، میرے بعد ان کو (تنقید کا) نشانہ نہ بنانا۔ (۱)

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسل کے علاوہ تمام عالمین پر میرے صحابہ کو فوقیت دی ہے۔ (۲)

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ ﴾

اور جب یہ لوگ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔

امام ابن جریرؒ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ بعض یہودی

۱۔(جامع ترمذی:۳۸۶۲۰۶)

۲۔(مجمع الزوائد:۱۰۰۰۲)

(یعنی منافق) جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب سے ملاقات کرتے تو کہتے: ہم تمہارے دین پر ہیں' اور جب اپنے اصحاب سے ملتے جو کافروں کے سردار تھے' تو کہتے یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تو صرف مذاق کرتے ہیں۔ ۱

شان نزول

ہمیں احمد بن محمد بن ابراہیم نے اسے شیبہ بن محمد نے اسے علی بن محمد قرہ نے اسے احمد بن محمد بن نضر نے اسے یوسف بن بلال نے اسے مروان الکلبی نے بحوالہ الکلبی اس نے اسے بحوالہ صالح حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہوا یہ کہ یہ لوگ ایک دن گھر سے نکلے تو راستے میں ان کی ملاقات بعض صحابہؓ سے ہوئی تو عبداللہ بن ابی نے کہا کہ دیکھو میں ان احمقوں کو کس طرح تم سے موڑتا ہو یہ کہہ کر وہ چلا اور اس نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ مرحبا بالصدیق سید بنی تمیم وشیخ الاسلام، وثانی رسول اللہ فی الغا، الباذل نفسہ ومالہ۔ یعنی خوش آمدید اے صدیق قبیلہ بنو تمیم کے سردار، شیخ الاسلام اور غار میں نبی کے ساتھی اور اپنی جان ومال قربان کرنے والے۔ اس کے بعد اس نے حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ مرحبا سید بنی عدی بن کعب الفاروق القوی فی دین اللہ الباذل نفسہ ومالہ لرسول اللہ۔ یعنی خوش آمدید اے بنو عدی بن کعب کے سردا کفر واسلام میں فرق کرنے والے اللہ کے دین میں قوی مضبوط شخص رسول اللہ پر جان ومال قربان کرنے والے۔ اس کے بعد اس نے حضرت علیؓ کا ہاتھ تھام کر کہا مرحبا بابن عم رسول اللہ وختنہ سید بنی ہاشم ماخلا رسول اللہ۔ یعنی خوش آمدید اے پیغمبر خدا کے عم زاد اور داماد، باستثناء رسول اللہ بنو ہاشم کے سردار۔ اس

۱۔ (جامع البیان ج۱ ص۱۰۱ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

کے بعد یہ لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔ عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم نے دیکھا کہ میں نے کیسا کام کیا تم بھی جب ان صحابہ سے ملو تو جو کچھ میں نے کیا تم بھی اسی طرح کروان کی تعریف وتوصیف کرو۔ صحابہ واپس رسول اللہ کے پاس چلے گئے اور انہیں اس واقعے کی اطلاع دیدی اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (۱)

علامہ خفاجیؒ نے اس روایت پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے: اس حدیث کو واحدی نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی سند بیان کر کے کہا کہ یہ حدیث منکر ہے اور کہا: یہ سلسلۃ الذھب نہیں ہے بلکہ سلسلۃ الکذب ہے (یعنی جھوٹی سند ہے) اور اس حدیث کے موضوع ہونے آثار ظاہر ہیں، کیونکہ محدثین کی تصحیح کے مطابق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ آتے ہی شروع میں سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی اور ہجرت کے دوسرے سال میں حضرت علیؑ کی حضرت سیدہ فاطمہؑ سے شادی ہوئی تھی، اور اس حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن ابی نے حضرت علیؑ کو رسول اللہ کا داماد کہا۔ (۲)

علامہ ابواللیث سمرقندیؒ نے لکھا ہے کہ شیاطین سے مراد یہود کے پانچ قبیلے ہیں: کعب بن اشرف مدینہ میں، ابو بردہ اسلمی بنو اسلم میں، ابوالسوداء شام میں، عبدالدار جہینہ میں سے اور عوف بن مالک بنو اسد سے، ابوعبیدہ نے کہا: ہر وہ شخص جو گمراہ اور سرکش ہو وہ شیطان ہے۔

فریب زدہ لوگ

مطلب یہ ہے کہ یہ بدباطن مسلمانوں کے پاس آکر اپنی ایمان دوستی اور خیر خواہی ظاہر کر کے انہیں

۱۔ تفسیر خازن ج۱ ص۔ ۳۰۔ ۲۹، مطبوعہ دارالکتب العربیہ، پشاور)، تفسیر اسباب نزول

۲۔ (عنایۃ القاضی ج۱ ص ۳۳۹، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۳۸۳ھ)

دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں تا کہ مال وجان کا بچاؤ بھی ہو جائے، بھلائی اور غنیمت کے مال میں حصہ بھی قائم ہو جائے۔اور جب اپنے ہم مشربوں میں ہوتے ہیں تو ان ہی کی سی کہنے لگتے ہیں۔ابن جریرؒ کے کلام کا خلاصہ بھی یہ ہے کہ شیاطین سے مراد رؤسا بڑے اور سردار ہیں جیسے یہود علماء اور سرداران کفار قریش و منافقین۔حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ کا قول ہے کہ یہ شیاطین ان کے امیر امراء اور سرداران کفر تھے اور ان کے ہم عقیدہ لوگ بھی۔شیاطین یہود بھی انہیں پیغمبری کے جھٹلانے اور قرآن کی تکذیب کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔مجاہدؒ کہتے ہیں شیاطین سے مراد ان کے وہ ساتھی ہیں جو یا تو مشرک تھے یا منافق۔قتادہؒ فرماتے ہیں۔اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو برائیوں میں اور شرک میں ان کے سردار تھے۔ابوالعالیہؒ، سدیؒ، ربیع بن انسؒ بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں" ہر بہکانے اور سرکشی کرنے والے کو شیطان کہتے ہیں۔جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے" قرآن میں بھی آیت (شیاطین الانس والجن) آیا ہے حدیث شریف میں ہے کہ" ہم جنوں اور انسانوں کے شیطانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔" ابو ذرؓ نے پوچھا یارسول اللہ کیا انسان کے شیطان بھی ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں جب یہ منافق مسلمان سے ملتے تو کہتے ہیں" ہم تمہارے ساتھ ہیں" یعنی جیسے تم ہو ویسے ہی ہم ہیں۔اور اپنوں سے کہتے ہیں کہ ہم تو ان کے ساتھ ہنسی کھیل کرتے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ ربیع بن انسؒ اور قتادہؒ کی یہی تفسیر ہے۔ [1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بدتر اس شخص کو پاؤ گے جو دورخا ہوگا، ان کے پاس آیا تو ان کا سا بن گیا اور ان

۱۔تفسیر ابن کثیر امام ابن کثیرؒ

کے پاس گیا تو ان کا سا بن گیا۔“ [۱]

﴿ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَ یَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۵﴾ ﴾

اللہ ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کے استہزاء کی توجیہ

اللہ یستھزی بھم ۔الخ جواب استہزاء۔ یہاں پر سوال ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی کرنا تو ناجائز ہے تو یہاں ہنسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے کی گئی ہے اور ہنسی کرنا تو عیب ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو تمام عیوب سے پاک ہیں؟ جواب بعض مفسرین فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ”اللہ یجازیھم“ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے مذاق کا بدلہ دے گا اس کو مشاکلت کہتے ہیں کہ جیسا سلوک منافقین نے مسلمانوں سے کیا ویسا سلوک ہم ان کے ساتھ کریں گے اس کی مثال جیسے قرآن کریم میں ہے ”وجزؤا سیئۃ سیئۃ مثلھا“ برائی کی جزاء اس جیسی برائی ہے۔ [۲]

دوسرے مطلب بعض مفسرین نے یوں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ حقیقی طور پر استہزاء فرمائیں گے، سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن منافقین دوزخ کے گڑھے میں پہنچ جائیں گے تو جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا گویا کہ انہیں جنت میں جانے کی اجازت مل گئی جنتی ان منافقوں کی طرف دیکھیں گے تو کہیں گے کہ واقعی انہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی

۱۔[بخاری، کتاب الأدب، باب ما قیل فی ذی الوجھین:۶۰۵۸۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب خیار الناس:۲۵۲۶]

۲۔(کمالین حاشیہ جلالین:ص:۵:ج:۱:معالم التنزیل:ص:۲۴:ج:۱:مظہری:ص:۲۸:ج:۱:ابن کثیر:ص:۸۲:ج:۱)

ہے چنانچہ وہ دوڑ کر دروازے پر پہنچیں گے مگر اتنے میں دروازے بند ہوجائیں گے یہ حقیقی طور پر ان سے استہزاء ہوگا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہوئے ان کے اس مکروہ فعل کے مقابلہ میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے ٹھٹھا کرے گا اور انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے دے گا جیسے دوسری جگہ ہے، کہ قیامت کے روز منافق مرد و عورت ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ٹھہر جاؤ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں۔ کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور کی تلاش کرو۔ اس کے لوٹتے ہی درمیان میں ایک اونچی دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا، اس طرف تو رحمت ہوگی اور دوسری طرف عذاب ہوگا۔ فرمان الٰہی ہے کافر ہماری ڈھیل کو اپنے حق میں بہتر نہ جانیں۔ اس تاخیر میں وہ اپنی بدکرداریوں میں اور بڑھ جاتے ہیں پس قرآن میں جہاں استہزاء مسخریت یعنی مذاق، مکر، خدیعت یعنی دھوکہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں یہی مراد ہے۔ ایک اور جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ صرف ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہہ کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں ان کی بدکرداریوں اور کفر و شرک پر انہیں ملامت کی گئی ہے۔ اور مفسرین کہتے ہیں یہ الفاظ صرف جواب میں لائے گئے ہیں جیسے کوئی بھلا آدمی کسی مکار کے فریب سے بچ کر اس پر غالب آ کر کہتا ہے کہو میں نے کیسا فریب دیا حالانکہ اس کی طرف سے فریب نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ فرمان الٰہی ہے کہ آیت (وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللهُ وَاللهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ) 3۔ آل عمران : 54) اور آیت (اَللهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ)2۔ البقرة:15) ورنہ اللہ کی ذات مکر اور مذاق سے پاک ہے مطلب یہ ہے کہ ان کا فن فریب انہی کو برباد کرتا ہے۔ ان الفاظ کا یہ بھی مطلب

۱۔ (معالم التنزیل: ص: ۲٤: ج: ۱: ابوسعود: ص: ۵۷: ج: ۱: خازن: ص: ۳۰: ج: ۱، تفسیر مظہری)

بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ان کی ہنسی، دھوکہ، تمسخر اور بھول کا ان کو بدلہ دے گا تو بدلے میں بھی وہی الفاظ استعمال کئے گئے دونوں لفظوں کے دونوں جگہ معنی جدا جدا ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم میں ہے آیت (جَزَٰٓؤُا سَيِّئَةٍۭ بِمِثۡلِهَا) 10۔یونس:27) یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے آیت (فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ) جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو تو ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ لینا حقیقتاً برائی نہیں۔ زیادتی کے مقابلہ میں بدلہ لینا زیادتی نہیں۔ لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے حالانکہ پہلی برائی اور زیادتی "ظلم" ہے اور دوسری برائی اور زیادتی "عدل" ہے لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں کلام اللہ میں ایسی عبارتیں ہیں وہاں یہی مطلب ہے۔ ایک اور مطلب بھی سنئے دنیا میں یہ منافق اپنی اس ناپاک پالیسی سے مسلمانوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے اللہ نے بھی ان کے ساتھ یہی کیا کہ دنیا میں انہیں امن وامان مل گیا اور یہ مست ہو گئے حالانکہ یہ عارضی امن ہے، قیامت والے دن انہیں کوئی امن نہیں ملے گا گو یہاں ان کے مال اور جانیں بچ گئیں لیکن اللہ کے ہاں یہ دردناک عذاب کا شکار بنیں گے۔ امام ابن جریرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی بہت تائید کی ہے اس لیے کہ مکر، دھوکہ اور مذاق جو بلاوجہ ہو اس سے تو اللہ کی ذات پاک ہے ہاں انتقام، مقابلے اور بدلے کے طور پر یہ الفاظ اللہ کی نسبت کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ ان کا بدلہ اور سزا ہے۔ یمدھم کا مطلب ڈھیل دینا اور بڑھانا بیان کیا گیا ہے۔ جیسے فرمایا آیت (اَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ وَّبَنِيۡنَ) 23۔المومنون:55) یعنی کیا یہ یوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے مال اور اولاد کی کثرت ان کے لیے باعث خیر ہے نہیں! نہیں! نہیں! صحیح شعور ہی نہیں اور آیت (سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ) 7۔الاعراف:182) اس طرح ہم انہیں

آہستہ آہستہ پکڑیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے غرض کہ ادھر یہ گناہ کرتے ہیں ادھر دنیوی نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں جن پر یہ پھولے نہیں سماتے حالانکہ وہ حقیقت میں عذاب ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ انہیں ڈھیل دینے اور انہیں اپنی سرکشی اور بغاوت میں بڑھنے کے لیے ان کو مہلت دی جاتی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ اپنے کفر میں گرے جاتے ہیں۔ عمہ کہتے ہیں گمراہی کو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ضلالت و کفر میں ڈوب گئے اور اس ناپاکی نے انہیں گھیر لیا اب یہ اسی دلدل میں اترتے جاتے ہیں، اسی ناپاکی میں پھنسے جاتے ہیں اور اس سے نجات کی تمام راہیں ان پر بند ہو جاتی ہیں۔ بھلا ایسی دلدل میں جو ہو اور پھر اندھا بہرا اور بیوقوف ہو وہ کیسے نجات پا سکتا ہے۔ آنکھوں کے اندھے پن کے لیے عربی میں "عمی" کا لفظ آتا ہے اور دل کے اندھاپے کے لیے "عمہ" کا لیکن کبھی دل کے اندھے پن کے لیے بھی "عمی" کا لفظ آتا ہے جیسے قرآن میں ہے آیت (وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ) 22۔ الحج:46)۔[۱]

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾ ﴾

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی پس نہ تو ان کی تجارت نے کوئی نفع دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے تھے۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انہوں نے اسلام کو بھی قریب سے دیکھا اس کا ذائقہ

۱۔ تفسیر ابن کثیر

بھی چکھا اور کفر میں تو پہلے سے مبتلا ہی تھے پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی ان کے اس عمل کو قرآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان دے کر دی اور تکلیف دہ چیز یعنی کفر خرید لیا۔ [۱]

ایمان فروش لوگ

حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے کہ انہوں نے ہدایت چھوڑ دی اور گمراہی لے لی۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں انہوں نے ایمان کے بدلے کفر قبول کیا۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں" ہدایت پر گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔" جیسے اور جگہ قوم ثمود کے بارے میں ہے آیت (وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ)41۔فصلت:17) یعنی باوجود اس کے کہ ہم نے قوم ثمود کو ہدایت سے روشناس کر دیا مگر پھر بھی انہوں نے اس رہنمائی کی جگہ اندھے پن کو پسند کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ منافقین ہدایت سے ہٹ کر گمراہی پر آ گئے اور ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی گویا ہدایت کو بیچ کر گمراہی خرید لی۔ اب ایمان لا کر پھر کافر ہوئے ہوں خواہ سرے سے ایمان ہی نصیب نہ ہوا ہو اور ان منافقین میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے آیت (ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ)63۔المنافقون 3:) یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے پس ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور ایسے بھی

۱۔ تفسیر معارف القرآن

منافق تھے جنہیں ایمان نصیب ہی نہ ہوا پس نہ تو انہیں اس سودے میں فائدہ ہوا، نہ راہ ملی، بلکہ ہدایت کے چمنستان سے نکل کر گمراہی کے خارزار میں، جماعت کے مضبوط قلعہ سے نکل کر تنہائیوں کی تنگ جیل میں، امن کے وسیع میدان سے نکل کر خوف کی اندھیری کوٹھری میں اور سنت کے پاکیزہ گلشن سے نکل کر بدعت کے سنسان جنگل میں آ گئے۔ (۱)

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ ﴾

ان کی مثال اس شخص کی مثال کی سی ہے جس نے آگ روشن کی، پھر جب آگ نے اس کا ارد گرد روشن کر دیا، تو اللہ نے چھین لی ان کی روشنی اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا وہ نہیں دیکھتے۔

منافقین کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقابلے میں یہ مثال ہے، جیسا کسی شخص نے اندھیرے میں آگ جلائی، تاکہ اس کے ذریعے سے اپنے مال اور اہل وعیال کی حفاظت کرے، جب وہ آگ روشن ہو گئی اور ارد گرد اور چیزیں بھی نظر آنے لگیں اور اپنے مال اور اہل واعیال کے بارے میں اطمینان ہو گیا تو اچانک وہ آگ بجھ گئی، اسی طرح منافقین رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن

۱۔ تفسیر ابن کثیر

پاک پر ایمان لائے اور حقیقت میں ان کا ایمان صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی جانوں، اموال وعیال کی قتل اور قید سے حفاظت کریں، چنانچہ جب وہ مرجائیں گے تو ان کے ایمان کا نفع ختم ہوجائے گا اور ان کو حق تعالیٰ قبر کی ایسی سختیوں میں ڈال دے گا کہ اس کے بعد ان کو راحت وآرام نظر ہی آئے گا۔ [۱]

شک، کفر اور نفاق کیا ہے

مثال کو عربی میں مثیل بھی کہتے ہیں اس کی جمع امثال آتی ہے۔ جیسے قرآن میں ہے آیت (وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ إِلَّا الْعٰلِمُوْنَ) 29۔العنکبوت:43) یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جنہیں صرف عالم ہی سمجھتے ہیں۔ اس آیت شریف کا مطلب یہ ہے کہ جو منافق گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور اندھے پن کو بینائی کے بدلے مول لیتے ہیں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے اندھیرے میں آگ جلائی اس کے دائیں بائیں کی چیزیں اسے نظر آنے لگیں، اس کی پریشانی دور ہوگئی اور فائدے کی امید بندھی کہ دفعتہ آگ بجھ گئی اور سخت اندھیرا چھا گیا نہ تو نگاہ کام کرسکے، نہ راستہ معلوم ہوسکے اور باوجود اس کے وہ شخص خود بہرا ہو۔ کسی کی بات کو نہ سن سکتا ہو۔ گونگا ہو کسی سے دریافت نہ کرسکتا ہو، اندھا ہو جو روشنی سے کام نہ چلا سکتا ہو۔ اب بھلا یہ راہ کیسے پا سکے گا؟ ٹھیک اسی طرح یہ منافق بھی ہیں کہ ہدایت چھوڑ کر راہ گم کر بیٹھے اور بھلائی چھوڑ کر برائی کو چاہنے لگے۔ اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان قبول کر کے کفر کیا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں کئی جگہ یہ صراحت موجود ہے واللہ اعلم۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں سدیؒ سے یہی نقل کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ تشبیہ بہت ہی درست اور صحیح ہے، اس لیے کہ اولاً تو ان منافقوں کو نور ایمان حاصل ہوا پھر ان کے

۱۔ تفسیر ابن عباس

نفاق کی وجہ سے وہ چھن گیا اور یہ حیرت میں پڑ گئے اور دین گم ہو جانے کی حیرت سے بڑی حیرت اور کیا ہو گی؟ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ جن کی یہ مثال بیان کی گئی ہے انہیں کسی وقت بھی ایمان نصیب ہی نہ ہوا تھا کیونکہ پہلے فرمان الٰہی گزر چکا ہے کہ آیت (وماھم بمومنین) یعنی گو یہ زبان سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر حقیقتاً یہ ایماندار نہیں۔ درحقیقت اس آیۃ مبارکہ میں ان کے کفر و نفاق کے وقت کی خبر دی گئی ہے اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس حالت کفر و نفاق سے پہلے کبھی انہیں ایمان حاصل ہی نہیں ہوا۔ ممکن ہے ایمان لائے ہوں، پھر اس سے ہٹ گئے ہوں اور اب دلوں میں مہریں لگ گئی ہوں دیکھئے دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے آیت (ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ) 63۔ المنافقون:3) یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا، پھر ان کے دلوں پر مہر لگ گئی۔ اب وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثال میں روشنی اور اندھیرے کا ذکر ہے یعنی کلمہ ایمان کے ظاہر کرنے کی وجہ سے دنیا میں کچھ نور ہو گیا، کفر کے چھپانے کی وجہ سے پھر آخرت کے اندھیروں نے گھیر لیا۔ ایک جماعت کی مثال شخص واحد سے اکثر دی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اور جگہ ہے آیت (رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ) 33۔ الاحزاب:19) تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف آنکھیں پھیر پھیر کر اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح وہ شخص جو سکرات موت میں ہو۔ اور اس آیت کو بھی دیکھئے آیت (مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ) 31۔ لقمان:28) تم سب کا پیدا کرنا اور مار ڈالنے کے بعد پھر زندہ کر دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک جان کو دوبارہ زندہ کرتا۔ تیسری جگہ تورات سیکھ کر عملی عقیدہ

اس کے مطابق نہ رکھنے والوں کی مثال میں کہا گیا ہے آیت (كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا) 62
۔الجمعہ:5) گدھے کی مانند ہیں جو کتابیں لادے ہوئے ہو۔سب آیتوں میں جماعت کی مثال ایک
ہی دی گئی ہے۔اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں منافقوں کی جماعت کی مثال ایک شخص سے دی گئی۔
بعض کہتے ہیں تقدیر کلام یوں ہے۔آیت (مثل قصتھم کمثل قصۃ الذین استوقدوا نارا) یعنی ان کے
واقعہ کی مثال ان لوگوں کے واقعہ کی طرح ہے جو آگ روشن کریں۔بعض کہتے ہیں کہ آگ جلانے والا تو
ایک ہے۔لیکن مجموعی طور پر پوری جماعت اس سے محظوظ ہوتی ہے جو اس کے ساتھ ہے اور اس قسم کا اور
الذی یہاں الذین کے معنی میں ہیں جیسے کہ شاعروں کے شعروں میں بھی میں کہتا ہوں اس مثال میں بھی
واحد کے صیغہ کے بعد ہی جمع کے صیغہ بھی ہیں بنورھم اور ترکھم اور لا یرجعون ملاحظہ ہوں۔اس طرح کلام
میں اعلیٰ فصاحت اور بہترین خوبی بھی آگئی ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی روشنی لے گیا اس سے مطلب یہ ہے کہ
جو نور نفع دینے والا تھا وہ تو ان سے ہٹا لیا اور جس طرح آگ کے بجھ جانے کے بعد تپش اور دھواں اور
اندھیرا رہ جاتا ہے اسی طرح ان کے پاس نقصان پہنچانے والی چیز یعنی شک و کفر و نفاق رہ گیا تو راہ
راست کو نہ خود دیکھ سکیں نہ دوسرے کی بھلی بات سن سکیں نہ کسی سے بھلائی کا سوال کر سکیں۔اب پھر لوٹ
کر ہدایت پر آنا محال ہو گیا۔اس کی تائید میں مفسرین کے اقوال سنئے۔حضرت ابن عباس ؓ، ابن مسعود ؓ
اور بعض اور صحابہ رضوان اللہ علیہم فرماتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ تشریف لانے کے
بعد کچھ لوگ اسلام لے آئے مگر پھر منافق بن گئے۔ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں ہو
پھر آگ جلا کر روشنی حاصل کرے اور آس پاس کی بھلائی برائی کو سمجھنے لگے اور معلوم کرے کہ کس راہ میں
کیا ہے؟ کہ اچانک آگ بجھ جائے روشنی جاتی رہے۔اب معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس راہ میں کیا کیا ہے؟

اسی طرح منافق شرک وکفر کی ظلمت میں تھے پھر اسلام لا کر بھلائی برائی یعنی حلال حرام وغیرہ سمجھنے لگے مگر پھر کافر ہو گئے اور حرام وحلال خیر وشر میں کچھ تمیز نہ رہی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں نور سے مراد ایمان اور ظلمت سے مراد ضلالت وکفر ہے یہ لوگ ہدایت پر تھے لیکن پھر سرکشی کر کے بہک گئے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں ایمانداری اور ہدایت کی طرف رخ کرنے کو اس مثال میں آس پاس کی چیز کے روشنی کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عطا خراسانیؒ کا قول ہے کہ منافق کبھی کبھی بھلائی کو دیکھ لیتا ہے اور پہچان بھی لیتا ہے لیکن پھر اس کے دل کی کور چشمی اس پر غالب آ جاتی ہے۔ عکرمہؒ، عبدالرحمنؒ، حسنؒ، سدیؒ اور ربیعؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ ایمان لاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ روشنی سے ان کے دل جگمگا اٹھتے ہیں جیسے آگ کے جلانے سے آس پاس کی چیزیں روشن ہو جاتی ہیں لیکن پھر کفر اس روشنی کو کھو دیتا ہے جس طرح آگ کا بجھ جانا پھر اندھیرا کر دیتا ہے۔ مندرجہ بالا اقوال تو ہماری اس تفسیر کی تائید میں تھے کہ جن منافقوں کی یہ مثال بیان کی گئی ہے وہ ایمان لا چکے تھے پھر کفر کیا۔ اب امام ابن جریرؒ کی تائید میں جو تفسیر ہے اسے بھی سنئے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ مثال منافقوں کی ہے کہ وہ اسلام کی وجہ سے عزت پا لیتے ہیں۔ مسلمانوں میں نکاح، ورثہ اور تقسیم مال غنیمت میں شامل ہوتے ہیں لیکن مرتے ہی یہ عزت چھن جاتی ہے جس طرح آگ کی روشنی آگ بجھتے ہی جاتی رہتی ہے۔ ابو العالیہؒ فرماتے ہیں جب منافق آیت (لا الہ الا اللہ) پڑھتا ہے تو دل میں نور پیدا ہوتا ہے پھر جہاں شک کیا وہ نور گیا، جس طرح لکڑیاں جب تک جلتی رہیں روشنی رہی، جہاں بجھ گئیں نور گیا۔ ضحاکؒ فرماتے ہیں نور سے مراد یہاں ایمان ہے جو ان کی زبانوں پر تھا۔ قتادہ کہتے ہیں آیت (لا الہ الا اللہ) ان کے لیے روشنی کر دیتا تھا امن وامان، کھانا پینا،

بیوی بچے سب مل جاتے تھے لیکن شک و نفاق ان سے یہ تمام راحتیں چھین لیتا ہے جس طرح آگ کا بجھنا روشنی دور کر دیتا ہے۔ حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ آیت (لا الہ الا اللہ) کہنے سے منافق کو (دنیوی نفع مثلاً مسلمانوں میں لڑکے لڑکی کا لین دین، ورثہ کی تقسیم، جان و مال کی حفاظت وغیرہ) مل جاتا ہے لیکن چونکہ اس کے دل میں ایمان کی جڑ اور اس کے اعمال میں خلوص نہیں ہوتا اس لیے موت کے وقت وہ سب منافع سلب ہو جاتے ہیں جیسے آگ کی روشنی بجھ جائے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اندھیروں میں چھوڑ دینا سے مراد مرنے کے بعد عذاب پانا ہے۔ یہ لوگ حق کو دیکھ کر زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں اور ظلمت کفر سے نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے کفر و نفاق کی وجہ سے ہدایت اور حق پر قائم رہنا ان سے چھن جاتا ہے۔ سدیؒ کا قول ہے کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں موت کے وقت منافقین کی بد اعمالیاں اندھیروں کی طرح ان پر چھا جاتی ہیں اور کسی بھلائی کی روشنی ان کے لیے باقی نہیں رہتی جس سے ان کی توحید کی تصدیق ہو۔ وہ بہرے ہیں، حق کے سننے اور راہ راست کو دیکھنے اور سمجھنے سے اندھے ہیں۔ ہدایت کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ نہ انہیں توبہ نصیب ہوتی ہے نہ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ [1]

﴿ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾ ﴾

یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں پس وہ نہیں لوٹیں گے۔

ربط کلام: منافقوں کا تذکرہ جاری ہے۔ منافقت کی بیماری کے ظاہری اعضا پر منفی اثرات۔

(بہرے) "اَصَمّ" کی جمع ہے۔ بُکۡمٌ (گونگے) "اَبۡکَم" کی جمع ہے اور عُمۡیٌ (اندھے) "اَعۡمٰی

۱

" کی جمع ہے۔ ان کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کان، زبانیں یا آنکھیں ہیں ہی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ)[الاحقاف :٢٦] "اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔" (فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ) یعنی وہ اس گمراہی سے جو خرید بیٹھے اور اس ہدایت کی طرف جسے فروخت کر بیٹھے واپس نہیں لوٹتے۔ ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے مومن اور دل میں پکے کافر تھے۔ [1]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ان یہودیوں کی یہ بھی مثال بیان کی گئی ہے، جیسا کہ کسی شکست کھائے ہوئے انسان نے کوئی علم حاصل کیا اور اس کے پاس اور شکست خوردہ لوگ جمع ہو گئے پھر انہوں نے اپنے علم کو تبدیل کر دیا، جس کی وجہ سے ان کا فائدہ اور امن وسلامتی سب ہی برباد ہو گئے، اسی طرح سے یہود رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے آپ کے اور قرآن مجید کے ذریعے سے مدد مانگا کرتے تھے جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت ہوئی تو انہوں نے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کفر وانکار کے سبب ان کے ایمان لانے کی خواہش اور ان کے ایمان کے نفع کو ختم کر دیا اور انھیں یہودیت کی گمراہیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا کہ انھیں اب ہدایت کا راستہ ہی نظر نہیں آتا، یہ سب بہرے، گونگے اور اندھے بنے ہوئے ہیں، کہ اپنے کفر اور گمراہی سے ہرگز نہیں

---

[1] تفسیر القرآن

لوٹ سکتے۔ [۱]

قتادہؒ نے کہا: وہ حق سننے سے بہرے ہیں، حق کہنے سے گونگے ہیں، حق دیکھنے سے اندھے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی مراد ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کا جو آپ نے آخر زمانہ کے والوں کے متعلق حدیث جبرائیل میں فرمایا۔ واذا رایت الحفاۃ العراۃ الصم البکم ملوک الارض فذاک من اشراطھا۔ (جب تو دیکھے کہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن، (حق سننے سے) بہرے، (حق کہنے سے) گونگے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں تو یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ واللہ اعلم۔ [۲]

مسند احمد میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دل چار قسم کے ہیں ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو، دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہیں، تیسرے وہ دل جو الٹے ہیں چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں۔ پہلا دل تو مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے۔ دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا دل خالص منافقوں کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان ونفاق دونوں جمع ہیں۔ ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو اور نفاق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جس میں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہو۔ اب جو مادہ بڑھ جائے وہ دوسرے پر غالب آجاتا ہے۔ اس حدیث کی اسناد بہت ہی عمدہ ہے۔ [۳]

۱۔ تفسیر ابن عباس
۲۔ تفسیر قرطبی احکام القرآن
۳۔ تفسیر گلدستہ تفسیر

﴿ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝١٩ ﴾

یاان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے تیز بارش ہورہی ہواس میں اندھیریاں بھی ہوں اور گرج بھی اور بجلی بھی وہ کڑک کے سبب، موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

منافقین اور یہودیوں کی قرآن پاک کے ساتھ یہ دوسری مثال ہے جیسا کہ جنگل میں رات کے وقت آسمان سے بارش برسے اسی طرح قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ اس میں فتنوں کی تاریکیاں بیان کی گئی ہیں اور گرج، چمک، ڈر اور ڈانٹ اور بیان وتبصرہ اور وعید ہے، یہ لوگ موت اور تباہی کے خوف سے، کڑک کی آواز سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں، اسی طرح یہ منافقین قرآن مجید کے بیان اور وعید کے وقت موت سے بچنے کے لیے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈاخل کر لیتے ہیں کہ کہیں دل ان کی طرف مائل نہ ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ منافقین کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان سب کو دوزخ میں جمع کرنے والا ہے، قریب ہے کہ یہ آگ اور چمک کافروں کی نگاہوں کو ختم کردے اسی طرح سے قرآن کریم بھی ان گمراہوں کی آنکھوں کو ختم کردینے والا ہے۔ [1]

---

[1] تفسیر ابن عباس

شان نزول

امام ابن جریر طبریؒ اس آیت کے شان نزول میں اپنی اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ' حضرت ابن مسعودؓ وغیرھما سے روایت کرتے ہیں۔

اہل مدینہ سے دو منافق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے تو ان کو اس بارش نے آلیا جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے' اس میں شور گرج اور کڑک تھی اور بجلی چمک رہی تھی اور جب بھی بجلی زور سے کڑکتی تو وہ موت کے ڈر سے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیتے اور جب بجلی چمکتی تو وہ اس کی روشنی میں چلتے اور جب اندھیرا چھا جاتا تو کھڑے رہ جاتے' وہ کہنے لگے کہ کاش صبح ہو جائے تو ہم پھر (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چلے جائیں' پھر جب صبح ہوئی تو وہ آپ کے پاس آئے اور خلوص دل سے اسلام لے آئے اور انہوں نے نیکی کے ساتھ اسلام کے احکام پر عمل کیا اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے منافقوں کی مثال ان دو منافقوں کے ساتھ دی ہے جو مدینہ سے نکلے تھے۔

منافقین کی ایک اور پہچان

منافق جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس میں حاضر ہوتے تو وہ اس خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ مبادا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ان کے متعلق کوئی کلام نازل ہوا ہو یا ان کی کوئی بات پکڑی گئی ہو اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا جائے' جس طرح بارش میں گھرے ہوئے ان دو منافقوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں اور جب فتوحات اسلام کی وجہ سے ان کو بہت

زیادہ مال غنیمت ملا اور ان کے ہاں اولاد ہوئی تو وہ اسلام پر کچھ قائم ہوئے اور کہنے لگے کہ (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین حق ہے، جس طرح وہ دو منافق بجلی کی روشنی میں چل پڑتے تھے اور جب کسی مصیبت کی وجہ سے ان کا مال اور اولاد ہلاک ہو جاتے، پھر کفر کی طرف لوٹ جاتے اور کہتے کہ یہ دین (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے ہے، جس طرح بجلی چمکتی اور اندھیرا چھا جاتا تو وہ دو منافق کھڑے رہ جاتے تھے۔ [۱]

بارش سے مراد اسلام ہے، اندھیروں اور گرج سے مراد وہ تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں جو اسلام کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ چمک سے مراد مسلمانوں کو حاصل ہونے والی کامیابیاں ہیں اور کڑکنے والی بجلیوں سے مراد جہاد کے احکام ہیں، جن میں منافقوں کو موت دکھائی دیتی ہے۔ سیدنا ابو موسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہدایت اور علم جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسی مثال اس بارش کی جو کثرت سے ہو، وہ بارش جب زمین پر پہنچتی ہے تو زمین کا وہ حصہ جو صاف ہوتا ہے پانی جذب کر لیتا ہے، پھر اس سے گھاس اور سبزہ اگتا ہے اور زمین کا جو حصہ سخت ہوتا ہے وہ پانی کو روک لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، لوگ اس سے پیتے ہیں، پلاتے ہیں اور کھیتی میں آبپاشی کرتے ہیں اور زمین کا بعض حصہ بالکل چٹیل میدان ہوتا ہے، نہ پانی کو روکتا ہے اور نہ اس پر گھاس اگتی ہے۔ بس یہی مثال اس شخص کی ہے جو اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کرے اور جس چیز کو دے کر مجھے اللہ نے بھیجا ہے وہ اس کو نفع پہنچائے، پھر وہ شخص اس کو پڑھے اور پڑھائے اور (چٹیل میدان کی) مثال اس شخص کی سی ہے جو ہدایت اور علم دین کی طرف متوجہ نہ ہو اور

۱۔ (جامع البیان ج۱ ص۱۱۹، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

جس ہدایت کو دے کر میں مبعوث کیا گیا ہوں اسے قبول نہ کرے۔" [۱]

علماء کا رعد کے متعلق اختلاف ہے۔ ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرمایا: یہود نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رعد کے متعلق پوچھا کہ یہ (کڑک) کیا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے (جو بادل پر مقرر ہے) اس کے پاس آگ کے کوڑے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانک کر لے جاتا ہے جہاں اللہ چاہتا ہے۔ یہود نے کہا: یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: وہ فرشتہ بادل کو جھڑکتا ہے جب وہ اسے جھڑکتا ہے حتی کہ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ یہود نے کہا: آپ نے سچ کہا اس تفسیر پر اکثر علماء کا اتفاق ہے۔ پس الرعد (کڑک) سنی جانے والی آواز کا اسم ہے۔ حضرت علیؓ نے یہ فرمایا۔ یہ لغت عرب میں معلوم ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرمایا: الرعد ایک ہوا ہے۔ بادل کے درمیان چھا جاتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے۔ البرق کے بارے میں اختلاف ہے، حضرات علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ البرق لوہے کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ بادل کو چلاتا ہے۔ [۲]

الصواعق، جمع ہے صاعقہ کی۔ حضرات ابن عباسؓ اور مجاہدؒ وغیرہما نے کہا: جب الرعد فرشتہ زیادہ غضبناک ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے یہی صواعق ہے۔ اسی طرح خلیل نے کہا۔ فرمایا: یہ رعد کی آواز سے شدید ہوتی ہے، اس کے ساتھ کبھی آگ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ گرتا ہے اسے جلا دیتا ہے۔ ابوزید نے کہا: الصاعقہ آگ ہے جو سخت کڑک میں آسمان سے گرتی ہے، خلیل نے ایک قوم سے

۱۔[بخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم:۷۹]

۲۔تفسیر قرطبی الجامع احکام القرآن

الساعقۃ (سین کے ساتھ) حکایت کیا ہے۔ابوبکر نقاش نے کہا، کہا جاتا ہے: صاعقۃ، صعقۃ وصاقعۃ تمام کا معنی ایک ہے۔ [۱]

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرمایا: ہم حضرت عمرؓ کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ایک سفر میں تھے اور ہمارے ساتھ حضرت کعب الاحبارؒ بھی تھے۔فرمایا: تیز ہوا چلنے لگی، بادل گرجنے لگا اور شدید بارش اور ٹھنڈک ہوگئی۔لوگ گھبرا گئے۔حضرت عباسؓ نے کہا: مجھے کعب الاحبارؒ نے کہا جس نے کڑک کی آواز سن کر کہا "سُبحَانَ مَن یُسَبِّحُ الرَّعدُ بِحَمدِہٖ وَالمَلَائِکَۃُ مِن خِیفَتِہٖ" تو اس بادل، ٹھنڈک اور بجلی میں جو مصیبت ہوگی اس سے وہ بچا لیا جائے گا۔حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اور کعب نے یہ کلمات پڑھے جب صبح ہوئی تو لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمرؓ سے کہا: اے امیر المومنین! لوگوں میں جو گھبراہٹ تھی وہ ہم میں نہ تھی۔حضرت عمرؓ نے پوچھا: وہ کیسے؟ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: میں نے حضرت عمرؓ سے حضرت کعبؒ کی بات کہی تو حضرت عمرؓ نے کہا: سبحان اللہ! کیوں تم نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہم بھی وہ کہتے جیسا تم نے کہا۔ [۲]

﴿ یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۰ ﴾

۱۔تفسیر قرطبی الجامع احکام القرآن
۲۔تفسیر قرطبی الجامع احکام القرآن

قریب ہے کہ بجلی اچک لے جائے ان کی آنکھیں، جب کبھی وہ ان کے لیے روشنی کرتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت سلب کر لیتا، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جب بجلی کی روشنی ہوتی ہے تو چلنا شروع کر دیتے ہیں، اسی طرح جب منافقین ایمان کا اظہار کرتے ہیں تو مومنوں کے درمیان چلنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ان کا اظہار ایمان بظاہر قبول کر لیا جاتا ہے لیکن جب مر جاتے ہیں تو قبر کے اندھیرے میں پڑے رہتے ہیں۔اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو گرج و چمک سے ان کے کانوں اور نگاہوں کو ختم کر دے اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو قرآن کریم کی وعید اور عذاب سے منافقوں اور یہودیوں کی سننے کی قوت اور قرآن حکیم کی وضاحت سے ان کی دیکھنے کی قوت ختم کر دے۔ [۱]

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مضبوط آیتیں ان منافقوں کی قلعی کھول دیں گی اور ان کے چھپے ہوئے عیب ظاہر کر دیں گی اور اپنی نورانیت سے انہیں مبہوت کر دیں گی جب ان پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایمان ان پر ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دل ہو کر پیروی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن پھر جہاں شک وشبہ آیا، دل میں کدورت اور ظلمت بھر گئی اور بھونچکے ہو کر کھڑے رہ گئے۔اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کو ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان

۱۔ تفسیر ابن عباس

پیدا ہوالیکن جہاں اس کے خلاف نظر آیا یہ الٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے۔

حضرت ابن عباس ؓ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھہر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے۔ دیگر بہت سے مفسرین کا بھی یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی قول ہے واللہ اعلم۔ روز قیامت بھی ان کا یہی حال رہے گا کہ جب لوگوں کو ان کے ایمان کے اندازے کے مطابق نور ملے گا بعض کو کئی کئی میلوں تک کا، بعض کو اس سے بھی زیادہ، کسی کو اس سے کم، یہاں تک کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ کبھی روشن ہو اور کبھی اندھیرا کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ذرا سی دور چل سکیں گے پھر ٹھہر جائیں گے پھر ذرا سی دور کا نور ملے گا پھر بجھ جائے گا اور بعض وہ بے نصیب بھی ہوں گے کہ ان کا نور بالکل بجھ جائے گا یہ پورے منافق ہوں گے۔ [1]

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں" ایمان والوں کو ان کے اعمال کے مطابق نور ملے گا بعض کو کھجور کے درخت جتنا، کسی کو قد آدم جتنا، کسی کو صرف اتنا ہی کہ اس کا انگوٹھا ہی روشن ہو، کبھی بجھ جاتا ہو، کبھی روشن ہو جاتا ہو" حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں" انہیں نور ملے گا ان کے اعمال کے مطابق جس کی روشنی میں وہ پل صراط سے گزریں گے۔ بعض لوگوں کا نور پہاڑ جتنا ہوگا، بعض کا کھجور جتنا اور سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور اس کے انگوٹھے پر ہوگا کبھی چمک اٹھے گا اور کبھی بجھ جائے گا" (ابن ابی حاتم) حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں" کہ تمام اہل توحید کو قیامت کے دن نور ملے گا۔ جب منافقوں کا نور بجھ جائے گا تو موحد ڈر کر کہیں گے آیت (رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا) 66۔التحریم:8) یا رب ہمارے نور کو پورا کر" (ابن ابی حاتم) ضحاک بن مزاحم کا بھی یہی قول ہے۔ ان احادیث سے معلوم

۱۔ تفسیر ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم

ہوا کہ قیامت والے دن لوگ کئی قسم کے ہونگے۔ (۱)

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ ﴾

اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

مومنوں، کافروں اور منافقین کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں اور جماعتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اے لوگو! اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے اندر تقویٰ جیسی عظیم صفت پیدا ہو جائے تو اس اللہ کی عبادت و بندگی کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے ان لوگوں کو پیدا کیا جن کو تمہارے اس دنیا میں آنے کا سبب بنایا ہے۔ (۲)

اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان

یہاں سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی الوہیت کا بیان شروع ہوتا ہے وہی اپنے بندوں کو عدم سے وجود میں لایا، اسی نے ہر طرح کی ظاہری و باطنی نعمتیں عطا فرمائیں اللہ جو برکتوں والا اور تمام عالم کو پالنے والا ہے پس سب کا خالق، سب کا رازق، سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس لیے شرک سے مبرا ہر قسم کی عبادت کا وہی مستحق ہے۔ اور فرمایا" اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم جانتے ہو۔ صحیحین میں

۱۔ تفسیر ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم
۲۔ تفسیر بصیرت القرآن

حدیث ہے"حضرت ابن مسعودؓ پوچھتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے۔فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تمہارا خالق ہے کسی کو شریک ٹھہرانا"حضرت معاذؓ والی حدیث میں ہے" جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں دوسری حدیث میں ہے تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں کہے جو کچھ اللہ اکیلا چاہے۔طفیل بن سنجرہ حضرت عائشہؓ کے سوتیلے بھائی فرماتے ہیں میں نے خواب میں چند یہودیوں کو دیکھا اور ان سے پوچھا تم کون ہے؟ انہوں نے کہا تم بھی اچھے لوگ ہو لیکن افسوس تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاہیں پھر میں نصرانیوں کی جماعت کے پاس گیا اور ان سے بھی اسی طرح پوچھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے ان سے کہا افسوس تم بھی مسیح (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا مانتے ہو۔انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔میں نے ان سے کہا افسوس تم بھی مسیح (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا مانتے ہو۔انہوں نے بھی یہی جواب دیا میں نے صبح اپنے اس خواب کا ذکر کچھ لوگوں سے کیا پھر دربار نبوی میں حاضر ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی یہی خواب بیان کیا۔آپ نے پوچھا کیا کسی اور سے بھی تم نے اس کا ذکر کیا ہے؟ میں نے کہا ہاں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب آپ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا طفیل نے ایک خواب دیکھا اور تم میں سے بعض کو بیان بھی کیا میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کلمہ کے کہنے سے روک دوں لیکن فلاں فلاں کاموں کی وجہ سے میں اب تک نہ کہہ سکا۔یادرکھو"اب ہرگز ہرگز اللہ چاہے اور اس کا رسول"کبھی نہ کہنا بلکہ یوں کہو کہ صرف اللہ تعالیٰ اکیلا جو چاہے ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں۔آپ نے فرمایا کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے یوں کہہ جو اللہ تعالیٰ اکیلا

چاہے ایسے تمام کلمات توحید کے سراسر خلاف ہیں۔توحید باری کی اہمیت کے بارے میں یہ سب احادیث بیان ہوئی ہیں۔واللہ اعلم۔تمام کفار اور منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور فرمایا اللہ کی عبادت کرو یعنی اس کی توحید کے پابند ہو جاؤ، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو جو نہ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں جو تمہیں روزی پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں اس توحید کی طرف بلا رہے ہیں جس کے حق اور سچ ہونے میں کوئی شک نہیں۔شرک اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جیسے چیونٹی جو رات کے اندھیرے میں کسی صاف پتھر پر چل رہی ہو، قسم ہے اللہ کی اور قسم ہے آپ کی حیات کی، یہ بھی شرک ہے انسان کا یہ کہنا اگر یہ کتیا نہ ہوتی تو چور رات کو ہمارے گھر میں گھس آتے یہ بھی شرک ہے۔آدمی کا یہ قول کہ اگر بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چوری ہو جاتی یہ بھی شرک کا کلمہ ہے کسی کا یہ قول کہ جو اللہ چاہے اور آپ یہ بھی شرک ہے کسی کا یہ کہنا کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور فلاں نہ ہوتا۔یہ سب کلمات شرک ہیں صحیح حدیث میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں تو آپ نے فرمایا کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے؟ دوسری حدیث میں ہے تم اچھے لوگ ہوتے اگر تم شرک نہ کرتے تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے۔ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں انداد کے معنی شریک اور برابر کے ہیں۔مجاہدؒ فرماتے ہیں تم تورات وانجیل پڑھتے ہو اور جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک اور لاشریک ہے، پھر جانتے ہوئے کیوں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو۔[1]

مسند احمد میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ (علیہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر

السلام) کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو، قریب تھا کہ وہ اس میں غفلت کریں تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگار عالم کا حکم تھا کہ ان پانچ چیزوں پر خود کار بند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو۔ لہٰذا یا تو آپ کہہ دیجئے یا میں پہنچا دوں۔ حضرت یحییٰ (علیہ السلام) نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت لے گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ دیا جائے یا زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں پس یحییٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا، جب مسجد بھر گئی تو آپ اونچی جگہ پر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر کے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ خود بھی عمل کروں تم سے بھی ان پر عمل کراؤں۔ ایک یہ کہ اللہ ایک کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے اور غلام کام کاج کرے لیکن جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے کسی اور کو دے دے کیا۔ تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا، تمہیں روزی دینے والا، تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ دوسری یہ کہ نماز کو ادا کرو اللہ تعالیٰ کی نگاہ بندے کی طرف ہوتی ہے۔ جب تک کہ وہ نماز میں ادھر ادھر منہ پھیرے جب تم نماز میں ہو تو خبردار ادھر ادھر التفات نہ کرنا۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ روزے رکھا کرو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس مشک کی تھیلی بھری ہوئی ہو جس سے اس کے تمام ساتھیوں کے دماغ معطر رہیں۔ یاد رکھو روزے دار کے منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔ چوتھا حکم یہ ہے کہ صدقہ دیتے رہا کرو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمنوں نے قید کر لیا اور گردن کے ساتھ اس کے ساتھ باندھ دیئے گردن مارنے کے لیے لے جانے

لگے تو وہ کہنے لگا کہ تم مجھ سے فدیہ لو اور مجھے چھوڑ دو چنانچہ جو کچھ تھا کم زیادہ دے کر اپنی جان چھڑا لی۔ پانچواں اس کا حکم یہ ہے کہ بہ کثرت اس کے نام کا ذکر کیا کرو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کے پیچھے تیزی کے ساتھ دشمن دوڑتا آتا ہے اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں گھس جاتا ہے اور وہاں امن وامان پا لیتا ہے اسی طرح بندہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت شیطان سے بچا ہوا ہوتا ہے یہ فرما کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اب میں بھی تمہیں پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا حکم جناب باری تعالیٰ نے مجھے دیا ہے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے رہنا اللہ اور اس کے رسول اور مسلمان حاکم وقت کے احکام سننا۔ اور جاننا ہجرت کرنا اور جہاد کرنا جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر نکل جائے گویا وہ اسلام کے پٹے کو اپنے گلے سے اتار پھینکے گا ہاں یہ اور بات ہے کہ رجوع کر لے جو شخص جاہلیت کی پکار پکارے وہ جہنم کا کوڑا کرکٹ ہے لوگوں نے کہا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگرچہ وہ روزے دار اور نمازی ہو فرمایا اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔ مسلمانوں کو ان کے ان ناموں کے ساتھ پکارتے رہو جو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے رکھے ہیں مسلمین مومنین اور عباد اللہ یہ حدیث حسن ہے اس آیت میں بھی یہی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہیں روزی دیتا ہے پس عبادت بھی اسی کی کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت میں توحید باری تعالیٰ کا پورا خیال رکھنا چاہیے کسی اور کی عبادت نہ کرنی چاہیے ہر ایک عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔ [1]

لعلکم تتقون" (تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ) فرمایا کہ اس عبادت کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ جب تم ہر وقت

۱۔ تفسیر ابن کثیر

اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو گے، اس کے فرماں بردار بن جاؤ گے، اپنی خواہشات کو اس کے حکموں کے تابع کر دو گے تو پھر تمہیں تقویٰ والی صفت حاصل ہو جائے گی، اور تم اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے بن جاؤ گے، پھر تقویٰ کے مختلف درجات ہیں، اس کا ایک معنیٰ گناہوں سے بچنا بھی ہے کہ جب کوئی شخص ہر وقت اللہ کی عبادت میں لگا رہے گا اس کو خوش رکھنے کی فکر میں ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچے گا، اور اس کا ایک معنیٰ دوزخ کے عذاب سے بچنا بھی ہے کہ جب کوئی شخص گناہوں سے بچے گا تو ظاہر ہے دوزخ کے عذاب سے بھی محفوظ رہے گا اسی لیے بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ لکھا ہے "تاکہ تم دوزخ سے بچو"۔ [۱]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جبرائیل (علیہ السلام) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا: "احسان کیا ہے؟" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے دیکھنے کی کیفیت پیدا نہ کر سکو تو (یہ تصور پیدا کر لو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔" [۲]

سیدنا معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے؟" معاذؓ نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے

۱۔ تفسیر تبیان الفرقان

۲۔ [بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبرائیل (علیہ السلام) عن الایمان۔۔ الخ: ۵۰۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان و الاسلام۔۔ الخ: ۸]

ہیں۔فرمایا:” یہ کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔“[۱]

﴿ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ﴾

جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل نکالے، لہٰذا اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم جانتے ہو۔

ان دو آیتوں (آیت نمبر: ۲۱ اور ۲۲) میں اسلام کے بنیادی عقیدے توحید کی دعوت دی گئی ہے اور مختصر انداز میں اس کی دلیل بھی بیان کر دی گئی ہے اہل عرب یہ مانتے تھے کہ ساری کائنات کو پیدا کرنا، زمین وآسمان کی تخلیق اور آسمان سے بارش برسانا اور اس سے پیداوار اگانا، یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے ہیں، اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے کام بتوں کے سپرد کر رکھے ہیں اور وہ بت اپنے کاموں میں براہ راست فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان بتوں کی عبادت اس لیے کرتے تھے کہ وہ ان کی مدد کریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہر چیز پیدا کرنے والے ہم ہیں اور ہمیں کائنات

۱۔[بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی دعاء النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أمتہ إلی توحید اللہ تبارک وتعالیٰ: ۷۳۷۳۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعًا: ۳۰]

چلانے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تو عبادت کسی اور کی کرنا کتنے بڑے ظلم کی بات ہے۔ [۱]

امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن مسعودؓ اور صحابہ میں سے بعض حضراتؓ سے روایت کیا ہے کہ لفظ آیت "الذی جعل لکم الارض فراشا" سے مراد ہے وہ زمین بچھونا ہے جس پر چلتے ہیں اور وہ بچھونا ہے اور ٹھہرنے کی جگہ بھی ہے لفظ آیت "والسماء بناء" کے بارے میں فرمایا کہ زمین پر آسمان قبہ کی شکل میں بنایا گیا اور وہ ایک چھت ہے زمین پر۔

امام ابوداؤدؒ، ابن ابی حاتمؒ، ابوالشیخؒ، ابن مردویہ اور بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک دیہاتی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! جانیں مشقت میں پڑ گئیں اور اولاد ضائع ہوگئی اور مال کم ہو گئے اور مویشی ہلاک ہو گئے ہمارے لیے رب سے پانی طلب کیجئے۔ آپ کی بارگاہ میں اللہ تعالیٰ کی سفارش پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگارہ میں آپ کی سفارش پیش کرتے ہیں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سبحان اللہ! اور آپ برابر سبحان اللہ فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے چہروں پر ناگواری دیکھی پھر آپ نے فرمایا کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کی ذات کیسی شان والی ہے کہ اس کی شان اس سے زیادہ عظمت والی ہے کسی کے پاس اس کو بطور سفارش پیش نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اپنے آسمانوں کے اوپر ہے اپنے عرش پر اور اس کا عرش اس کے آسمانوں پر ہے۔ اور اس کے آسمان اسی طرح اس کی زمینوں پر ہیں اور اپنی انگلیوں کے ساتھ فرمایا کہ وہ قبہ کی طرح ہے اور بیشک اس کے ساتھ وہ چر چراتا ہے جیسے کجاوہ اپنے سوار کے ساتھ چر چراتا ہے۔ [۲]

۱۔ آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی

۲۔ الدر منثور امام سیوطی

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا: یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے تمھارے اوپر نعمتوں کی بارش کی، زمین کو تمھارے لیے فرش بنایا، جس پر تم مکان بناتے ہو، کاشت کرتے ہو اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہو۔ ارشاد فرمایا: (وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ) [الذاریات: ۴۸] ”اور زمین، ہم نے اسے بچھا دیا، سو (ہم) اچھے بچھانے والے ہیں۔“ اور فرمایا: (الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ) [الزخرف: ۱۰] ”وہ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے بنائے، تاکہ تم راہ پاؤ۔“ اور فرمایا: (وَاللّٰهُ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا) [نوح: ۱۹] ”اور اللہ نے تمھارے لیے زمین کو ایک فرش بنا دیا۔“

وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً: یعنی آسمان کو تمھارے لیے چھت بنایا، اس میں شمس و قمر اور ستاروں کو بسایا تاکہ وہ تمھیں فائدہ پہنچائیں۔ ارشاد فرمایا: (ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ـ رَفَعَ سَمْکَهَا فَسَوّٰهَا) [النازعات: ۲۷، ۲۸] ”کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا۔“ اور فرمایا: (اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ) [قٓ: ۶] ”تو کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کیسے اسے بنایا اور اسے سجایا اور اس میں کوئی درزیں نہیں ہیں۔“

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ: ارشاد فرمایا: (وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓی اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ کَذٰلِکَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ) [الاعراف: ۵۷] ”اور وہی ہے جو ہواؤں

کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔“

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ : یعنی بادل سے پانی برسایا، جس کے ذریعے مختلف قسم کے پھل پیدا کیے، تاکہ تم انھیں استعمال کرو، ان سے قوت حاصل کرو اور زندہ رہو۔ ارشاد فرمایا: (فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ) [الاعراف : ۵۷] ” پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔“ اور فرمایا: (اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا) [الفاطر : ۲۷] ” کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیشک اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی پھل نکالے، جن کے رنگ مختلف ہیں۔“ اور فرمایا: (هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۔ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ) [النحل : ۱۰، ۱۱] ” وہی ہے جس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، تمھارے لیے اسی سے پینا ہے اور اسی سے پودے ہیں جن میں تم چراتے ہو۔ وہ تمھارے لیے اس کے ساتھ کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بیشک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا : ذکر کردہ تمام نعمتوں کا تقاضا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک نہ بناؤ،

جو تمہاری طرح مخلوق ہیں اور آسمان وزمین کے درمیان ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں ہیں اور تم یہ جانتے بھی ہو کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں، وہ تنہا پیدا کرنے والا ہے، روزی دینے والا ہے اور وہی آسمان وزمین کے درمیان سارے امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا، اے اللہ کے رسول! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "(سب سے بڑا گناہ یہ ہے) کہ تم اللہ کا شریک بناؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"[۱]

سیدنا ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو غصہ دلانے والی بات سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا ہو، بیشک لوگ (کسی کو) اس کا شریک بناتے ہیں، کسی کو اس کا بیٹا بناتے ہیں، اس کے باوجود وہ (صبر کرتا ہے اور) ان کو رزق دیتا ہے، عافیت دیتا ہے اور (ہر قسم کی چیزیں) عطا فرماتا ہے۔"[۲]

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی شریک کو پکارتا تھا تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔"[۳]

وجود باری تعالیٰ پر دلائل

امام رازیؒ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور فی الواقع یہ آیت اللہ

۱۔[بخاری، کتاب الأدب، باب قتل الولد خشیة أن یأکل معه:۶۰۰۱]

۲۔[مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب فی الکفار:۲۸۰۴/۵۰]

۳۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ (ومن الناس من یتخذ۔۔الخ):۴۴۹۷]

تعالیٰ کے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے زمین اور آسمان کی مختلف شکل وصورت مختلف رنگ مختلف مزاج اور مختلف نفع کی موجودات ان میں سے ہر ایک کا نفع بخش ہونا اور خاص حکمت کا حامل ہونا ان کے خالق کے وجود کا اور اس کی عظیم الشان قدرت، حکمت، زبردست سطوت اور سلطنت کا ثبوت ہے کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی موجودگی کی کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا دعا (یا سبحان اللہ ان البعر لیدل علی البعیر ۔ وان اثر الاقدام لیدل علی المسیر ۔ فسماء ذات ابراج وارض ذات فجاج۔ وبحار ذات امواج الا یدل ذالک علی وجود اللطیف الخبیر۔) یعنی مینگنی سے اونٹ معلوم ہو سکے اور پاؤں کے نشان زمین پر دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ کوئی آدمی گیا ہے تو کیا یہ برجوں والا آسمان یہ راستوں والی زمین یہ موجیں مارنے والے سمندر اللہ تعالیٰ باریک بین اور باخبر کے وجود پر دلیل نہیں ہو سکتے ؟ حضرت امام مالکؒ سے ہارون رشید نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے آپ نے فرمایا زبانوں کا مختلف ہونا، آوازوں کا جداگانہ ہونا، نغموں کا الگ ہونا، ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے امام ابوحنیفہؒ سے بھی یہی سوال ہوتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں کہ چھوڑو میں کسی اور سوچ میں ہوں۔ لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بہت بڑی کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں نہ کوئی اس کا نگہبان ہے نہ چلانے والا ہے باوجود اس کے وہ برابر آ جا رہی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گزر جاتی ہے ٹھہرنے کی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے نہ اس کا کوئی ملاح ہے نہ منتظم۔ سوال کرنے والے دہریوں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے کوئی عقلمند ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی اتنے بڑے نظام کے ساتھ تلاطم والے سمندر میں آئے جائے اور کوئی اس کا چلانے والا نہ ہو آپ نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر ایک کشتی تو بغیر چلانے والے کے نہ چل سکے لیکن یہ ساری دنیا آسمان وزمین کی

سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں اوران کا مالک حاکم خالق کوئی نہ ہو؟ یہ جواب سن کر وہ لوگ ہکا بکا ہو گئے اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے حضرت امام شافعیؒ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ توت کے پتے ایک ہی ہیں ایک ہی ذائقہ کے ہیں کیڑے اور شہد کی مکھی اور گائیں بکریاں ہرن وغیرہ سب اس کو چباتے کھاتے اور چرتے چگتے ہیں اسی کو کھا کر ریشم کا کیڑا ریشم تیار کرتا ہے مکھی شہد بناتی ہے، ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے اور گائیں بکریاں مینگنیاں دیتی ہیں۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور اسی کو ہم اللہ تبارک وتعالیٰ مانتے ہیں وہی موجد اور صانع ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک مرتبہ وجود باری تعالیٰ پر دلیل طلب کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ سنو یہاں ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں نہ کوئی راستہ ہے بلکہ سوراخ تک نہیں باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور اندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف سے بالکل بند ہے ہوا تک اس میں نہیں جاسکتی اچانک اس کی ایک دیوار گرتی ہے اور ایک جاندار آنکھوں کانوں والا خوبصورت شکل اور پیاری بولی والا چلتا پھرتا نکل آتا ہے۔ بتاؤ اس بند اور محفوظ مکان میں اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں؟ اور وہ ہستی انسانی ہستیوں سے بالاتر اور اس کی قدرت غیر محدود ہے یا نہیں؟ آپ کا مطلب یہ تھا کہ انڈے کو دیکھو چاروں طرف سے بند ہے پھر اس میں پروردگار خالق یکتا جاندار بچہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی دلیل ہے اللہ کے وجود پر اور اس کی توحید پر۔ حضرت ابونواسؒ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا آسمان سے بارش برسنا، اس سے درختوں کا پیدا ہونا اور ان ہری ہری شاخوں پر خوش ذائقہ میووں کا لگنا ہی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی کافی دلیل ہے ابن المعتزؒ فرماتے ہیں افسوس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی تکذیب

پر لوگ کیسے دلیر ہو جاتے ہیں حالانکہ ہر چیز اس پروردگار کی موجود اور لاشریک ہونے پر گواہ ہے بزرگوں کا مقولہ ہے کہ آسمانوں کو دیکھو ان کی بلندی ان کی وسعت، ان کے چھوٹے بڑے چمکیلے اور روشن ستاروں پر نظریں ڈالو۔ ان کے چمکنے دمکنے ان کے چلنے پھرنے، ٹھہر جانے، ظاہر ہونے اور چھپ جانے کا مطالعہ کرو۔ سمندروں کو دیکھو، جو موجیں مارتے ہوئے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اونچے نیچے مضبوط پہاڑوں کو دیکھو جو زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور اسے ہلنے نہیں دیتے، جن کے رنگ، جن کی صورتیں مختلف ہیں۔ قسم قسم کی دوسری مخلوقات پر نظر ڈالو، ادھر سے ادھر پھر جانے والی کھیتیوں اور باغوں کو شاداب کرنے والی خوشنما نہروں کو دیکھو۔ کھیتوں، باغوں کی سبزیوں اور ان کے طرح طرح کے پھل پھول مزے مزے کے میووں پر غور کرو زمین ایک پانی ایک، لیکن شکلیں صورتیں، خوشبوئیں، رنگ ذائقہ، فائدہ الگ الگ۔ کیا یہ تمام مصنوعات تمہیں نہیں بتاتیں کہ ان کا صانع کوئی ہے؟ کیا یہ تمام موجودات با آواز بلند نہیں کہہ رہیں کہ ان کا موجد کوئی ہے؟ کیا یہ ساری مخلوق اپنے خالق کی ہستی اس کی ذات اور اس کی توحید پر دلالت نہیں کرتی۔ یہ ہیں وہ زوردار دلائل جو اللہ جل وعلا نے اپنی ذات کے منوانے کے لیے ہر نگاہ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں جو اس کی زبردست قدرتوں، اس کی پرزور حکمتوں، اس کی لاثانی رحمتوں، اس کے بے نظیر انعاموں، اس کے لازوال احسانوں پر دلالت کرنے کے لیے کافی وافی ہیں۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ نہ اس کا کوئی پالنے والا ہے، نہ اس کے سوا کوئی پیدا کرنے اور حفاظت کرنے والا، نہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہ اس کے سوا کوئی مسجود لاشک۔ ہاں دنیا کے لوگو! سن لو میرا توکل اور بھروسہ اسی پر ہے میری انابت اور التجا اسی کی طرف ہے، میرا جھکنا اور پست ہونا اسی کے سامنے ہے، میری تمناؤں کا مرکز، میری امیدوں کا آسرا، میرا ماویٰ، ملجاو ہی ایک ہے اس کے دست

رحمت کو تکتا ہوں اور اسی کا نام جپتا ہوں۔ (۱)

﴿ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾ ﴾

اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل کوئی ایک سورت لے آؤ، اور اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لاؤ اگر تم سچے ہو۔

ربط آیات: گزشتہ آیات میں عبادت اور معرفت خداوندی کے طریقے بتائے گئے اور محکم دلائل سے اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کی توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کیا گیا، ان آیات میں نبوت کے دلائل کا بیان ہے تاکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت و رسالت کی معرفت حاصل ہو، اسی لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سب سے اعلیٰ اور افضل معجزے کو بیان کیا تاکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت و رسالت میں منکرین کو کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

امام احمد، بخاری، مسلم، نسائی اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انبیاء میں سے کوئی نبی ایسا نہیں مگر اس کو ایسے معجزات دیئے گئے

۱۔ تفسیر ابن کثیر

جن پر لوگ ایمان لے آئے۔ اور مجھے قرآن دیا گیا جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کیا ہے میں امید کرتا ہوں کہ میں ان (انبیاء) میں سے تابعداری کے لحاظ سے قیامت کے دن زیادہ ہوں گا۔

امام ابن ابی حاتمؒ نے حضرت حسنؓ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "وان کنتم فی ریب" الآیۃ سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کفار میں سے اس شخص کے لیے ہے جس نے اس چیز میں شک کیا جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لے کر آئے۔

امام عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتمؒ نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "وان کنتم فی ریب" سے مراد ہے "فی شک" یعنی شک میں "مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ" سے مراد ہے کہ اس قرآن کی مثل جو حق اور سچ ہو (کوئی کتاب لے آؤ) جس میں کوئی باطل اور جھوٹ نہ ہو۔

امام عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "فاتوا بسورۃ من مثلہ" سے مراد ہے قرآن کے مثل۔ لفظ آیت "وادعوا شھداءکم من دون اللہ" (اور بلاؤ اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو لے آؤ) یعنی وہ لوگ جو تمہارے لیے گواہی دیں جب تم اس کے پاس (اس کتاب) کو لے آؤ کہ وہ اس کی مثل ہے۔ [۱]

تصدیق نبوت اعجاز قرآن

توحید کے بعد اب نبوت کی تصدیق کی جارہی ہے کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے جو قرآن پاک اپنے بندے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارا ہے اسے اگر تم ہمارا کلام نہیں مانتے تو تم اور تمہارے مددگار سب مل کر پورا قرآن نہیں صرف ایک سورت تو اس جیسی بنا لاؤ۔ جب تم

۱۔ الدر منثور

ایسا نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کیوں شک کرتے ہو؟ اپنے ہم فکر اور مددگار سب کو جمع کرو تو بھی تم سب ناکام رہو گے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے انہیں بھی بلا لو اور ان سے بھی مدد چاہو پھر اس جیسی ایک سورت ہی تو بنا لاؤ۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ تم اپنے حاکموں اور اپنے زباں دان فصیح و بلیغ لوگوں سے بھی مدد لے لو۔ قرآن پاک کے اس معجزے کا اظہار اور ایسا انداز خطاب کئی جگہ ہے سورہ قصص میں ہے آیت (قُلۡ فَاۡتُوۡا بِكِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ هُوَ اَهۡدٰى مِنۡهُمَاۤ اَتَّبِعۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ) 28۔القصص:49) یعنی اگر تم سچے ہو تو ان دونوں سے (یعنی تورات و قرآن سے) زیادہ ہدایت والی کوئی اور اللہ کی کتاب لاؤ تو میں بھی اس کی تابعداری کروں گا۔ سورہ سبحان میں فرمایا آیت (قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا) 17۔ الاسراء:88) یعنی اگر تمام جنات اور انسان جمع ہو کر اور ہر ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ یہ چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو بھی ان کے امکان میں نہیں سورہ ہود میں فرمایا آیت (اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ) 11۔ہود:13) یعنی کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ قرآن کو خود اس پیغمبر نے گھڑ لیا تم کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم سب مل کر اور اللہ کے سوا جنہیں تم بلا سکتے ہو بلا کر اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لاؤ۔ سورہ یونس میں ہے آیت (وَمَا كَانَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ يُّفۡتَرٰى مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيۡلَ الۡكِتٰبِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ) 10۔ یونس: 37) یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی طرف سے گھڑا ہوا نہیں بلکہ یہ اگلی کتابوں کی

تصدیق کرنے والا اور کتاب کی تفصیل ہے جس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں جو رب العالمین کی طرف سے ہے کیا یہ لوگ اسے خودساختہ کہتے ہیں ان سے کہو کہ اللہ کے سوا ہر شخص کو بلا کر اس قرآن کی سینکڑوں سورتوں میں سے ایک چھوٹی سی سورت جیسی سورت تو بنالاؤ تا کہ تمہارا سچ ظاہر ہو۔ یہ تمام آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اہل مکہ کو اس کے مقابلہ میں عاجز ثابت کر کے پھر مدینہ شریف میں بھی اس مضمون کو دہرایا گیا او پر کی آیت مثلہ کی ضمیر کو بعض نے قرآن کی طرف لوٹایا ہے یعنی کوئی سورت اس قرآن جیسی لاؤ۔ بعض نے یہ ضمیر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لوٹائی ہے یعنی آپ جیسا کوئی امی ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ کچھ پڑھا ہوا نہ ہونے کے باوجود وہ کلام کہے جس کا مثل کسی سے نہ بن سکے لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ مجاہدؒ، قتادہؒ، عمرو، بن مسعودؓ، ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور اکثر محققین کا یہی قول ہے امام ابن جریر طبریؒ، زمخشری رازیؒ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اس کی ترجیح کی وجوہات بہت سی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں سب کو ڈانٹ ڈپٹ بھی ہے اجتماعی اور الگ الگ بھی۔ خواہ وہ امی اور ان پڑھ ہوں یا اہل کتاب اور پڑھے لکھے ہوں اس میں اس معجزے کا کمال ہے اور بہ نسبت اس کے کہ صرف ان پڑھ لوگوں کو عاجز کیا جائے اس میں زیادہ مبالغہ ہے پھر دس سورتوں کا مطالبہ کرنا اس کی مثل نہ لا سکنے کی پیشنگوئی کرنا بھی اسی حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ذات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پس اس عام اعلان سے جو بار بار کیا گیا اور ساتھ ہی پیشنگوئی بھی کر دی گئی کہ یہ لوگ اس پر قادر نہیں۔ مکہ میں اور مدینہ میں بارہا اس کا اعادہ کیا گیا اور وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی تھی جنہیں اپنی فصاحت اور بلاغت پر ناز تھا جو لوگ آپ کی اور آپ کے دین کی دشمنی پر ادھار کھا بیٹھے تھے وہ درحقیقت اس سے عاجز آ گئے نہ پورے قرآن کا جواب دے سکے نہ دس

سورتوں کا، نہ ایک سورت کا، پس ایک معجزہ تو یہ ہے کہ اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی وہ نہ بنا سکے دوسرا معجزہ یہ ہے کہ پیشنگوئی سچ ثابت ہوئی کہ یہ ہرگز اس جیسا نہیں بنا سکتے چاہے سب جمع ہو جائیں اور قیامت تک محنت کرلیں۔ پس ایسا ہی ہوا نہ تو اس زمانہ میں کسی کی یہ جرات ہوئی نہ اس کے بعد سے آج تک اور نہ قیامت تک کسی سے یہ ہوسکے گا اور بھلا کیسے ہوسکتا؟ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل اسی طرح اس کا کلام بھی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن پاک کو بیک نظر دیکھنے سے ہی اس کے ظاہری اور باطنی لفظی اور معنوی ایسے ایسے کمالات ظاہر ہوتے ہیں جو مخلوق کے بس کے نہیں خود رب العالمین فرماتا ہے آیت (الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ) 11۔ ہود:1) یعنی اس کتاب کی آیتیں جو حکمت والے ہر طرح کی خبریں جاننے والے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے محکم مضبوط اور مفصل الگ الگ ہیں۔ پس الفاظ محکم اور معانی مفصل یا الفاظ مفصل اور معانی محکم پس قرآن اپنے الفاظ میں اور اپنے مضامین میں بے نظیر ہے جس کے مقابلے، معارضے اور مثل سے دنیا عاجز اور بے بس ہے اس پاک کلام میں اگلی خبریں جو دنیا سے پوشیدہ تھیں وہ ہو بہو بیان کی گئیں آنے والے امور کے تذکرے کئے گئے جو لفظ بہ لفظ پورے اترے۔ تمام بھلائیوں کا حکم تمام برائیوں سے ممانعت اس میں ہے۔ سچ ہے آیت (وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا) 6۔ الانعام:115) یعنی خبروں میں صداقت اور احکام میں عدل تیرے رب کے کلام میں پورا پورا ہے۔ پاکیزہ قرآن تمام تر حق وصداقت و ہدایت سے پر ہے نہ اس میں واہی تواہی باتیں ہیں نہ ہنسی مذاق نہ کذب وافترا جو شاعروں کے کلام میں عموماً پایا جاتا ہے بلکہ ان کے اشعار کی قدر و قیمت ہی اسی پر مقولہ مشہور ہے کہ اعذبہ اکذبہ جوں جھوٹ زیادہ اتنا ہی مزید سرتم دیکھو گے کہ لمبے لمبے پرزور قصیدے مبالغہ اور کذب

آمیز یا تو عورتوں کی تعریف وتوصیف میں ہوں گے یا گھوڑوں کی اور شراب کی ستائش میں ہوں گے یا کسی انسان کی بڑھی چڑھی مدح وتعریف میں ہوں گے یا اونٹنیوں کی آرائش وزیبائش یا بہادری کے مبالغہ آمیز گیت یا لڑائیوں کی چالبازیوں یا ڈر خوف کے خیالی منظروں کے بیان میں ہوں گے جن سے کوئی فائدہ نہیں۔ نہ دین کا نہ دنیا کا صرف شاعر کی زبان دانی اور اس کی قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے۔ نہ اخلاق پر ان سے کوئی عمدہ اثر نہ اعمال۔ پر پھر نفس مضمون کے ساتھ پورے قصیدے میں بمشکل دو ایک شعر ہوتے ہیں۔ باقی سب بھرتی کے اور ادھر ادھر کی لایعنی اور فضول بکواس برخلاف اس کے قرآن پاک کے اس پر نظر ڈالو تو دیکھو گے کہ اس کا ایک ایک لفظ فصاحت وبلاغت سے دین ودنیا کے نفع سے، خیر وبرکت سے پر ہے۔ پھر کلام کی ترتیب وتہذیب الفاظ کی بندش، عبارت کی روانی، معانی کی نورانیت، مضمون کی پاکیزگی، سونے پر سہاگہ ہے۔ اس کی خبروں کی حلاوت، اس کے بیان کردہ واقعات کی سلاست، مردہ دلوں کی زندگی ہے۔ اس کا اختصار کمال کا اعلیٰ نمونہ اور اس کی تفصیل معجزے کی جان ہے اس کا کسی چیز کا دوہرانا قند مکرر کا مزہ دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سچے موتیوں کی بارش برس رہی ہے۔ بار بار پڑھو دل نہ اکتائے، مزے لیتے جاؤ اور ہر وقت نیا مزہ پاؤ۔ مضامین سمجھتے جاؤ اور ختم نہ ہوں۔ یہ قرآن پاک کا ہی خاصہ ہے اس چاشنی کا ذائقہ، اس مٹھاس کا مزہ کوئی اس سے پوچھے جنہیں عقل وحواس علم وفضل کا کچھ حصہ قدرت نے عطا فرمایا۔ قیامت کے بیان کی آیتیں ہیں کہ ہولناک مناظر جنت ودوزخ کا بیان رحمتوں اور زحمتوں کا پورا پورا وصف۔ اولیاء اللہ کے لیے طرح طرح کی نعمتیں۔ دشمنان اللہ کے لیے طرح طرح کے عذاب۔ کہیں بشارت ہے کہیں ڈراوا ہے کہیں نیکیوں کی طرف رغبت ہے۔ کہیں بدکاریوں سے ممانعت ہے۔ کہیں دنیا کی طرف سے زہد کرنے کی،

کہیں آخرت کی طرف رغبت کرنے کی تعلیم ہے۔ یہی وہ تمام آیتیں ہیں جو راہ راست دکھاتی ہیں اور بہتر رہنمائی کرتی ہیں اللہ کی پسندیدہ شریعت کی طرف جھکاتی ہیں اور دلوں کو جلا دیتی ہیں اور شیطانی دروازوں کو بند کر دیتی ہے اور برے اثرات کو زائل کرتی ہیں۔ صحیح بخاری مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر نبی کو ایسے معجزے دیئے گئے کہ جنہیں دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے اور میرا معجزہ اللہ کی وحی یعنی قرآن پاک ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ میرے تابعدار بہ نسبت اور نبیوں کے بہت زیادہ ہوں گے اس لیے کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے ساتھ چلے گئے لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔ لوگ اسے دیکھتے جائیں گے اور اسلام میں داخل ہوتے جائیں گے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان کہ میرا معجزہ وحی ہے جو مجھ کو دی گئی ہے کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور قرآن کریم مجھی کو ملا ہے جو اپنے معارضے اور مقابلے میں تمام دنیا کو عاجز کر دینے والا ہے۔ بخلاف دوسری آسمانی کتابوں کے وہ اکثر علماء کے نزدیک اس وصف سے خالی ہیں واللہ اعلم۔ (۱)

﴿ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾ ﴾

پس اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر

پچھلی آیات میں توحید کا بیان تھا اب اسلام کے دوسرے اہم عقیدے یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا بیان ہے اور عرب کے جو لوگ قرآن پر ایمان لانے کے بجائے یہ الزام لگاتے تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی طرف سے یہ کلام بنالیا ہے، انہیں زبردست چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر ایسا کلام کوئی انسان بنا سکتا ہے تو تم بڑے فصیح وبلیغ ہو، تم سب مل کر قرآن جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ، ساتھ ہی قرآن نے دعوی کیا ہے کہ تم سب مل کر بھی ایسا نہیں کرسکو گے اور واقعہ یہی ہے کہ اہل عرب جو اپنی زبان وادب پر ناز کرتے تھے ان سب کو اس چیلنج کے بعد سانپ سونگھ گیا اور کوئی شخص یہ چیلنج قبول کرنے کے لیے آگے نہ بڑھا بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے اس خدائی کلام کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور اس طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت اور قرآن کریم کی سچائی روز روشن کی طرح ثابت اور واضح ہوگئی۔ [۱]

امام ابن ابی شیبہؒ نے المصنف میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا کہ جب نماز میں آگ کے ذکر سے گزرے تو چاہیے کہ آگ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ اور جب جنت کے ذکر سے گزرے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے۔

ابن ابی شیبہؒ، ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے ابولیلیٰؓ سے روایت کیا کہ میں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پہلو میں نماز پڑھی جب آپ ایک آیت پر پہنچے تو آپ نے فرمایا آگ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں ہلاکت ہے آگ والوں کے لئے۔

عبد بن حمید اور ابن جریرؒ نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "فان لم تفعلوا ولن تفعلوا" سے مراد ہے تم

۱۔ آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی

اس پر ہرگز قادر نہ ہوگے اور ہرگز تم کو اس کی طاقت نہ ہوگی۔ [۱]

تفسیر در منثور میں بحوالہ طبرانی، حاکم اور بیہقی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ پتھر جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے (وَ قُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ) میں فرمایا ہے۔ کبریت (گندھک) کے پتھر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جیسے چاہا پیدا فرمادیا۔

جہنم کا ایندھن

وقود کے معنی ایندھن کے ہیں جس سے آگ جلائی جائے۔ جیسے چپٹیاں لکڑیاں وغیرہ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے آیت (وَاَمَّا الۡقٰسِطُوۡنَ فَكَانُوۡا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا) 72۔الجن:15) ظالم لوگ جہنم کی لکڑیاں ہیں اور جگہ فرمایا تم اور تمہارے معبود جو اللہ کے سوا ہیں جہنم کی لکڑیاں ہیں تم سب اس میں وارد ہوگے اگر وہ سچے معبود ہوتے تو وہاں وارد نہ ہوتے دراصل یہ سب کے سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور حجارہ کہتے ہیں پتھر کو یہاں مراد گندھک کے سخت سیاہ اور بڑے بڑے اور بدبودار پتھر ہیں جن کی آگ بہت تیز ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ان پتھروں کو زمین و آسمان کی پیدائش کے ساتھ ہی آسمان اول پر پیدا کیا گیا ہے۔ (ابن جریر ابن ابی حاتم مستدرک حاکم) ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور چند اور صحابہ سے سدی نے نقل کیا ہے کہ جہنم میں یہ سیاہ گندھک کے پتھر بھی ہیں جن کی سخت آگ سے کافروں کو عذاب کیا جائے گا۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں ان پتھروں کی بدبو مردار کی بو سے بھی زیادہ ہے محمد بن علیؒ اور ابن جریجؒ بھی کہتے ہیں کہ مراد گندھک کے بڑے بڑے اور سخت پتھر ہیں۔ بعض نے کہا ہے مراد وہ پتھر جن کی مورتیاں بنائی جاتی ہیں اور پھر ان کی

۱۔ الدرمنثور امام جلال الدین سیوطی

پرستش کی جاتی تھی جیسے اور جگہ ہے آیت (اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ) 21۔الانبیآء:98) تم اور تمہارے وہ معبود جو اللہ کے سوا ہیں جہنم کی لکڑیاں ہیں قرطبیؒ اور رازیؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ گندھک کے پتھر جو کسی شکل میں بھی اللہ کے سوا پوجے جاتے ہوں لیکن یہ وجہ کوئی قوی وجہ نہیں اس لیے کہ جب آگ گندھک کے پتھروں سے سلگائی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی تیزی اور حرارت معمولی آگ سے بہت زیادہ ہوگی اس کا بھڑکنا جلنا سوزش اور شعلے بھی بہت زیادہ ہوں گے علاوہ اس کے پھر سلف سے بھی اس کی تفسیر یہی مروی ہے اسی طرح ان پتھروں میں آگ کا لگنا بھی ظاہر ہے۔اور آیت کا مقصود آگ کی اور اس کی سوزش کا بیان کرنا ہے اور اس کے بیان کے لیے بھی یہاں پتھر سے مراد گندھک کے پتھر لینا زیادہ مناسب ہے تا کہ وہ آگ تیز ہو اور اس سے بھی عذاب میں سختی ہو قرآن کریم میں ہے آیت (كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا) 17۔الاسرآء:97) جہاں شعلے ہلکے ہوئے کہ ہم نے اور بھڑکا دیا۔ایک حدیث میں ہے ہر موذی آگ میں ہے لیکن یہ حدیث محفوظ اور معروف نہیں۔قرطبیؒ فرماتے ہیں اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ہر وہ شخص جو دوسروں کو ایذاء دے جہنمی ہے دوسرے یہ کہ ہر ایذاء دہندہ چیز جہنم کی آگ میں موجود ہوگی جو جہنمیوں کو عذاب دے گی۔اعدت یعنی تیار کی گئی ہے مراد بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ آگ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد پتھر ہوں یعنی وہ پتھر جو کافروں کے لیے تیار کئے گئے ہیں۔ابن مسعودؓ کا یہی قول ہے اور فی الحقیقت دونوں معنی میں کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ پتھروں کا تیار کیا جانا آگ کے جلانے کے لیے ہے۔لہٰذا آگ کی تیاری کے لیے پتھروں کا تیار کیا جانا ضروری ہے۔پس دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہر وہ شخص

جو کفر پر ہو اس کے لیے وہ آگ تیار ہے۔ اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جہنم اب موجود اور پیدا شدہ ہے کیونکہ ”اعدت“ کا لفظ ہی اس کی دلیل میں آیا ہے بہت سی حدیثیں بھی ہیں۔ ایک مطول حدیث میں ہے جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا، دوسری حدیث میں ہے جہنم نے اللہ تعالیٰ سے دو سانس لینے کی اجازت چاہی اور اسے سردی میں ایک سانس لینے اور گرمی میں دوسرا سانس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ تیسری حدیث میں ہے صحابہ کہتے ہیں ہم نے ایک مرتبہ بڑے زور کی ایک آواز سنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا یہ کس چیز کی آواز ہے آپ نے فرمایا ستر سال پہلے ایک پتھر جہنم میں پھینکا گیا تھا آج وہ تہ کو پہنچا۔ چوتھی حدیث میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورج گرہن کی نماز پڑھتے ہوئے جہنم کو دیکھا۔ پانچویں حدیث میں ہے کہ آپ نے شب معراج میں جہنم کو اس میں عذابوں کے سلسلے کو ملاحظہ فرمایا اسی طرح اور بہت سی صحیح متواتر حدیثیں مروی ہیں۔ [۱]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک زور دار آواز سنی، تو دریافت فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو یہ کس چیز کی آواز ہے؟“ کہتے ہیں ہم نے کہا، اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”یہ اس پتھر کی آواز ہے جسے ستر سال پہلے جہنم میں پھینکا گیا تھا، وہ مسلسل گرتا رہا، اب اس کے پیندے تک پہنچا ہے۔“ [۲]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جہنم نے اپنے رب سے شکایت کرتے ہوئے عرض کی، اے میرے رب! میرے ایک حصے نے دوسرے کو کھا لیا ہے، تو

۱۔ تفسیر ابن کثیر

۲۔ [مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا، باب جھنم أعاذنا اللہ منہا: ۲۸۴۴]

اللہ تعالیٰ نے اسے ایک سردی کے موسم اور ایک گرمی کے موسم میں، دو سانس لینے کی اجازت عطا فرما دی۔“ ①

سیدنا ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”تمہاری یہ (دنیا کی) آگ جسے ابن آدم جلاتا ہے، جہنم کی آگ کی گرمی کا سترواں حصہ ہے۔“ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کی، واللہ! یا رسول اللہ! (انسانوں کو جلانے کے لیے تو) یہی دنیا کی آگ کافی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”لیکن وہ تو دنیا کی آگ سے انہتر (۶۹) درجے زیادہ گرم ہے اور اس کا ہر حصہ اس دنیا کی آگ کے برابر گرم ہے۔“ ②

سیدنا جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”(نماز کسوف کے دوران میں) جہنم میرے سامنے لائی گئی اور یہ اس وقت لائی گئی جب تم نے (دوران نماز میں) مجھے (اپنی جگہ سے) پیچھے ہٹتے دیکھا، میں (اس وقت) اس ڈر سے پیچھے ہٹا کہ کہیں مجھے جہنم کی لو نہ لگ جائے۔“ ③

سیدنا ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جہنم میں سب سے ہلکا عذاب اس آدمی کو ہوگا جسے آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی، ان جوتیوں کی وجہ سے اس کا دماغ کھولنے لگے گا۔“ ④

۱۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ النار وأنھا مخلوقۃ: ۳۲۶۰۔ مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الإبراد بالظھر۔۔۔ الخ: ۶۱۷]

۲۔[مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا، باب جھنم أعاذنا اللہ منھا: ۲۸۴۳]

۳۔[مسلم، کتاب الکسوف، باب ما عرض علی النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فی صلوۃ الکسوف من أمر الجنۃ والنار: ۹۰۴]

۴۔[مسلم، کتاب الإیمان، باب أھون أھل النار عذابا: ۲۱۱]

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵ ﴾

اور آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی جب کبھی ان کو ان (باغات) میں سے کوئی پھل رزق کے طور پر دیا جائے گا تو وہ کہیں گے "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا" اور انہیں وہ رزق ایسا ہی دیا جائے گا جو دیکھنے میں ملتا جلتا ہوگا اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان (باغات) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ربط آیات: اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ ترغیب کو ترہیب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تا کہ جو پیش کیا جاتا ہے۔ وہ خوش اسلوبی سے حاصل ہو اور جو چیز ہلاک کرنے والی ہے اس کے ارتکاب سے بچا جائے۔ جب کفار اور ان کے اعمال کا ذکر کیا۔ اور ان کو عذاب سے ڈرایا۔ تو اس کے بعد اہل ایمان اور ان کے اعمال کا ذکر کیا اور ان کو اپنے اس ارشاد سے خوش خبری دی۔ [1]

۱۔ تفسیر مدارک التنزیل

جنت کے معنی

علامہ راغب اصفہانیؒ جنت کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جن" کا اصل میں معنی ہے: کسی چیز کو حواس سے چھپا لینا۔

جنان، قلب کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی حواس سے مستور ہوتا ہے، جنین، پیٹ میں بچہ کو کہتے ہیں وہ بھی مستور ہوتا ہے، مجن اور جنہ ڈھال کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی حملہ آور کے حملہ سے چھپاتی ہے اور جن بھی حواس سے مستور ہوتے ہیں، اور جنت میں اس باغ کو کہتے ہیں جس میں بہت زیادہ گھنے درخت ہوں اور درختوں کے گھنے پن اور زیادہ ہونے کی وجہ سے زمین چھپ گئی ہو، اور دارالجزاء کا نام جنت اس لیے ہے کہ اس کو زمین کی جنت (گھنے باغ) کے ساتھ تشبیہہ دی گئی ہے اگرچہ دونوں جنتوں میں بہت فرق ہے، یا اس کو اس وجہ سے جنت کہا گیا ہے کہ اس کی نعمتیں ہم سے مستور ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جمع کے صیغہ سے "جنات" اس لیے فرمایا ہے کہ جنتیں سات ہیں: (۱) جنت الفردوس (۲) جنت عدن (۳) جنت النعیم (۴) دارالخلد (۵) جنت الماوی۔ (۶) دارالسلام (۷) علیین۔ [۱]

جنت کی نعمتیں

امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو

۱۔ (المفردات ص ۹۸، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ، ایران، ۱۳۴۲ھ)

کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا ہے اور اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو"۔ فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین"۔ سو کسی کو معلوم نہیں کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا چیز پوشیدہ رکھی گئی ہے۔" (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو پہلا گروہ جنت میں داخل ہوگا اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگا' نہ وہ اس میں تھوکیں گے' نہ ناک سے ریزش آئے گی' نہ فضلہ خارج ہوگا' ان کے برتن جنت میں سونے کے ہوں گے اور کھنگے سونے اور چاندی کے ہوں گے اور اس میں عود کی خوشبو ہوگی' ان کا پسینہ مشک کی طرح خوشبودار ہوگا' ہر جنتی کو دو بیویاں ملیں گی' ان کی پنڈلیوں کا مغز گوشت کے پار سے نظر آئے گا یہ ان کے حسن کی جھلک ہے' ان کے دلوں میں اختلاف اور بغض نہیں ہوگا' سب کے دل ایک طرح کے ہوں گے اور وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے۔ (۲)

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جنت میں چابک جتنی جگہ بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (۳)

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے ایک سوار سو سال تک چلتا رہے گا اور اگر تم چاہو تو یہ پڑھو:" وظل ممدود"۔ (۴)

۱۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

۲۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

۳۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

۴۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک جنت میں سو درجات ہیں' اور ہر دو درجوں میں آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے اور فردوس سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور ان درجوں کے وسط میں ہے اور اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کے دریا جاری ہوتے ہیں پس جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو۔ [۱]

امام احمد، عبد بن حمید نے اپنی سند میں ترمذی اور ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں بیہقیؒ نے البعث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کو جنت کے بارے میں بتائیے کہ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا (اس کی ایک) اینٹ سونے کی اور (ایک) اینٹ چاندی کی ہے اس کی کنکریاں موتی اور یاقوت ہیں اس کی لپائی کستوری کی ہے، اور اس کی مٹی زعفران ہے۔ اور جو شخص اس میں داخل ہوگا خوشحال رہے گا ناامید نہ ہوگا۔ ہمیشہ رہے گا اور نہیں مرے گا۔ اس کے کپڑے پرانے نہیں ہوں گے اور اس کی جوانی ختم نہیں ہوگی۔

امام ابن ابی الدنیاؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جنت کی زمین سفید ہے اس کا صحن کافور کی چٹانیں ہیں اس کے اردگرد کستوری کے ٹیلے ہیں ریت کے ٹیلوں کی طرح۔ اس میں بہتی ہوئی نہریں ہیں اس میں پہلے اور پیچھے جنت والے سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے۔ (پھر) اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کی ہوا بھیجے گا جو ان پر کستوری کی خوشبو بکھیرے گی۔ آدمی اپنی بیوی کی طرف لوٹے گا تو اس کا حسن اور خوشبو زیادہ ہو چکی ہوگی تو وہ کہے گا تو میرے پاس سے گیا تو میں تجھ پر تعجب کرنے والی تھی (تیری خوبصورتی پر) اور

۱۔ (جامع ترمذی ص ۳۶۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اب تو میں سخت تعجب کرنے والی ہوں (تیری خوبصورتی پر)۔ [1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں۔ (البقرہ:۲۵)

"بحر" کا معنی ہے: سمندر "نھر" کا معنی ہے: دریا اور "جدول" نہر کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان باغات کے نیچے سے دریا بہتے ہیں' اس کا معنی یہ ہے کہ دریا کہ دونوں کناروں پر درخت لگے ہوئے ہیں' یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کوئی لمبی نہر زمین میں کھودی ہوئی ہے، مسروق سے امام ابن جریرؒ ' امام ابن مبارکؒ اور امام بیہقیؒ نے اس اثر کو روایت کیا ہے۔ [2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب بھی ان کو ان باغات سے کھانے کے لیے کوئی پھل دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا۔ (البقرہ:۲۵)

حسن بصریؓ سے روایت ہے کہ جنتی کو ایک پیالہ دیا جائے گا' وہ اس میں سے کھائے گا' پھر اس کو دوسرا اسی طرح کا پیالہ دیا جائے گا تو وہ کہے گا: یہ تو پہلے کی طرح ہے تو فرشتے کہیں گے: تم کھاؤ ان کا رنگ ایک ہے اور ذائقہ مختلف ہے' اور امام ابن جریرؒ نے موقوفا روایت کیا ہے اور حاکم نے "مستدرک" میں حضرت ثوبانؓ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ اہل جنت میں سے کوئی شخص پھل توڑے گا اور ابھی وہ پھل اس کے منہ تک نہیں پہنچے گا کہ اس درخت پر اس کے بدلہ دوسرا پھل لگ جائے گا تو وہ کہے گا کہ یہ تو اسی طرح ہے' اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنت کے پھل شکل وصورت میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں تا کہ جنتی ان کی طرف راغب ہوں کیونکہ جب انسان کوئی نئی چیز دیکھتا ہے تو اس سے متوحش ہوتا ہے اور اس وقت جنتی کہیں گے: یہ ایسے ہی پھل ہیں جیسے ہم کو دنیا میں دیئے گئے تھے حالانکہ وہ صرف صورت میں دنیا

۱۔ تفسیر الدرمنثور

۲۔ (عنایۃ القاضی ج ۲ ص ٦٦' مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

کے پھلوں کی طرح ہوں گے ذائقہ مختلف ہوگا' اور اس میں یہ حکمت ہے کہ ان کو بہت تعجب اور خوشی ہوگی کہ صورۃ مماثل ہونے کے باوجود ان کا ذائقہ کس قدر مختلف ہے۔ اس آیت کا ایک محمل یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو اللہ کی عبادت اور اس کی معرفت سے جو لذت دنیا میں حاصل ہوتی تھی اسی جنس کی لذت جنت میں بھی ذکر الٰہی اور اس کی معرفت سے حاصل ہوگی لیکن جنت میں یہ لذت بہت زیادہ ہوگی' اس کو پھلوں سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ جس طرح پھلوں سے حواس کو لذت حاصل ہوتی ہے' اسی طرح معرفت الٰہی سے روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ [۱]

نیک مومنین کی جزاء

حضرت عبداللہؓ سے بھی یہ مروی ہے جنتیوں کا یہ قول کہ پہلے بھی ہم کو یہ میوے دیئے گئے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں بھی یہ میوے ہمیں ملے تھے صحابہؓ اور ابن جریرؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے بعض کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے یعنی سابقہ کل بھی یہی دیئے گئے تھے یہ اس لیے کہیں گے کہ ظاہری صورت وشکل میں وہ بالکل مشابہ ہونگے۔ یحییٰ بن کثیرؒ کہتے ہیں کہ ایک پیالہ آئے گا کھائیں گے پھر دوسرا آئے گا تو کہیں گے یہ تو ابھی کھایا ہے فرشتے کہیں گے کھایئے تو اگرچہ صورت شکل میں یکساں ہیں لیکن مزہ اور ہے۔ فرماتے ہیں جنت کی گھاس زعفران ہے اس کے ٹیلے مشک کے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت غلمان ادھر ادھر سے میوے لا لا کر پیش کر رہے ہیں وہ کھا رہے ہیں وہ پھر پیش کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں اسے تو ابھی کھایا ہے وہ جواب دیتے ہیں حضرت رنگ روپ ایک ہے لیکن ذائقہ اور ہی ہے چکھ کر دیکھئے کھاتے ہیں تو اور ہی لطف پاتے ہیں یہی معنی ہیں کہ ہم شکل لائیں جائیں گے۔ دنیا

۱۔ (عنایۃ القاضی ج۲ ص ۷۳' مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

کے میووں سے بھی اور نام شکل اور صورت میں بھی ملتے جلتے ہوں گے لیکن مزہ کچھ دوسرا ہی ہوگا۔
حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صرف نام میں مشابہت ہے ورنہ کہاں یہاں کی چیز کہاں وہاں کی؟
یہاں تو فقط نام ہی ہے عبدالرحمنؒ کا قول ہے دنیا کے پھلوں جیسے پھل دیکھ کر کہہ دیں گے کہ یہ تو دنیا میں کھا چکے ہیں مگر جب چکھیں گے تو لذت کچھ اور ہی ہوگی۔ (۱)
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے لیے ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ (البقرہ:۲۵)
جنتی عورتوں اور حوروں کی پاکیزگی' حسن و جمال اور ان کے ساتھ نکاح کی کیفیت کا بیان:
امام ابن جریرؒ اپنی اسانید کے ساتھ روایت کرتے ہیں' حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: وہ نجاست سے پاک ہوں گی' مجاہدؒ سے روایت ہے کہ وہ بول اور براز اور منی سے پاک ہوں گی اور مجاہدؒ ہی سے روایت ہے کہ حیض سے' بول اور براز سے' ناک کی ریزش سے' تھوک سے' منی سے اور بچہ جننے سے پاک ہوں گی' قتادہؒ سے روایت ہے کہ گناہ سے پاک ہوں گی۔ (۲)
حافظ سیوطیؒ بیان کرتے ہیں: امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ادنی درجہ کا جنتی شخص وہ ہوگا جس کے اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی۔ (۳)
امام ابن ابی شیبہؒ ' امام احمدؒ، امام نسائیؒ' امام عبد بن حمیدؒ' امام ابن المنذرؒ اور امام ابن ابی حاتمؒ اپنی اپنی اسانید سے روایت کرتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۱۔ تفسیر ابن کثیر
۲۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۱۳۷' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)
۳۔ (حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' درمنثور ج ۱ ص ۳۹' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران) (دو دنیا کی عورتیں ہوں گی اور ستر آخرت کی۔ ابن عساکر)

کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے ابوالقاسم! آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے‘ آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! ایک جنتی شخص کو کھانے‘ پینے‘ جماع اور شہوت سے سو دنیاوی آدمیوں کی قوت دی جائے گی‘ اس نے کہا: جو شخص کھاتا پیتا ہے وہ رفع حاجت بھی کرتا ہے اور جنت پاک جگہ ہے وہاں نجاست نہیں ہوتی آپ نے فرمایا: ان کی رفع حاجت ایک پسینہ نکلنے سے ہوگی جس سے مشک کی سی خوش بو آئے گی اور پسینہ آنے کے بعد ان کا پیٹ خالی ہو جائے گا۔ [۱]

امام طبرانیؒ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت کرتے ہیں کہ پیشاب اور جنابت (جماع کے وقت منی کا خروج) ایک پسینہ ہوگا جو ان کے بالوں کے نیچے سے لے کر پیروں تک سے نکلے گا اور اس سے مشک کی خوشبو آئے گی۔ [۲]

حافظ نور الدین الہیثمیؒ بیان کرتے ہیں: امام طبرانیؒ اور امام بزارؒ نے حضرت سعید بن عامر بن خذیمؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر اہل جنت کی ازواج میں سے کوئی عورت جھانکے تو تمام روئے زمین مشک کی خوشبو سے بھر جائے اور سورج اور چاند کی روشنی ماند پڑ جائے۔ [۳]

امام طبرانیؒ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں‘ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! قرآن مجید میں ہے: ”حور عین“ اس کی تفسیر

۱۔ (درمنثور‘ ج۱ ص۴۰‘ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)
۲۔ (درمنثور‘ ج۱ ص۴۰‘ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)
۳۔ (مجمع الزوائد ج۱۰ ص۴۱۷‘ مطبوعہ دار الکتاب العربی‘ بیروت‘ ۱۴۰۲ھ)

فرمائیے آپ نے فرمایا: وہ گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی اوران کی اتنی گھنی پلکیں ہوں گی جیسے گدھ کے پر' میں نے کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): قرآن کی آیت " کانھن الیاقوت والمرجان"۔ کی تفسیر فرمائیں آپ نے فرمایا: ان کی صورت حسین اور سیرت جمیل ہوگی میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (آیت) " کانھن بض مکنون" کی تفسیر فرمائیں فرمایا: ان کی کھال اس طرح باریک ہوگی جیسے انڈے کے چھلکے کے اندر لپٹی ہوئی کھال باریک ہوتی ہے' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (آیت) " عربا اترابا" کی تفسیر فرمائیں' آپ نے فرمایا: جو عورتیں دنیا میں بوڑھی ہوکر فوت ہوں گی' ان کے بال سفید ہوچکے ہوں گے اور وہ کمزور ہوچکی ہوں گی' اللہ تعالیٰ ان کو بڑھاپے کے بعد دوشیزہ بنا کر اٹھائے گا اور وہ اپنے شوہروں سے محبت کرنے والی ہوں گی اور سب ایک عمر کی ہوں گی' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آیا دنیا کی عورتیں افضل ہوں گی یا حورعین افضل ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: دنیا کی عورتیں' حورعین سے اس طرح افضل ہوں گی جس طرح ظاہر' باطن سے افضل ہوتا ہے' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی وجہ؟ آپ نے فرمایا: اس کی فضیلت کا سبب ان کے روزے اور ان کی نمازیں ہیں اللہ تعالیٰ ان کے چہروں میں نور پیدا کردے گا ان کا جسم ریشم کی طرح ہوگا' رنگ گورا ہوگا' کپڑے سبز ہوں گے' سنہرے زیورات ہوں گے' ان کی انگوٹھی موتی کی ہوگی' اور ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی وہ کہیں گی: سنو! ہم دائمی ہیں' کبھی نہیں مریں گی' سو! ہم ہمیشہ نعمت میں ہیں کبھی مغموم نہیں ہوں گی' اور ہم قیام کرنے والیاں ہیں کبھی سفر نہیں کریں گی' ہم خوش ہونے والیاں ہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی' اس کو مبارک ہو جس کے لیے ہم ہیں اور وہ ہمارے لیے ہے' میں نے عرض کیا' ہماری بعض عورتیں دنیا میں دو خاوندوں

سے (یکے بعد دیگرے) نکاح کرتی ہیں' بعض تین سے اور بعض چار سے' تو وہ عورت جنت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوگی؟ آپ نے فرمایا: اے ام سلمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اس عورت کو اختیار دیا جائے گا اور جس خاوند کا اخلاق دنیا میں سب سے اچھا ہوگا وہ اس کو اختیار کرے گی' وہ کہے گی: اے میرے رب! میرے اس خاوند کا اخلاق سب سے اچھا تھا' میرا اس کے ساتھ نکاح کر دے۔ اے ام سلمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) دنیا اور آخرت کی خیر اچھے اخلاق کے ساتھ وابستہ ہے۔ (۱)

جس عورت نے دنیا میں متعدد نکاح کیے ہوں' وہ آخرت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوگی؟

جس عورت نے متعدد نکاح کیے ہوں تو ایک صورت یہ ہے کہ ہر خاوند نے اس کو طلاق دے دی ہو اور جب وہ فوت ہو تو وہ کسی خاوند کے نکاح میں نہ ہو اس صورت میں اس کو جنت میں اختیار دیا جائے گا کہ جس خاوند کے اخلاق سب سے اچھے ہوں' وہ اس سے نکاح کرے جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ کی مذکورہ الصدر حدیث میں ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے متعدد نکاح کیے ہوں اور آخری خاوند نے اس کو طلاق نہ دی ہو اور وہ اس کے نکاح میں فوت ہوئی ہو' اس صورت میں وہ جنت میں آخری خاوند کے نکاح میں ہوگی جیسا کہ حضرت ابوداؤد (علیہ السلام) اور حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں ہے۔ (۲)

جن مردوں اور عورتوں کا دنیا میں نکاح نہیں ہوا ان کا جنت میں نکاح ہو جائے گا:

علامہ ابن حجر مکیؒ لکھتے ہیں: جو کم سن بچہ حشر میں دنیاوی عمر اور جسامت پر اٹھایا جائے گا' جنت میں دخول کے وقت اس کی جسامت بڑھا دی جائے گی اور وہ بالغوں کی طرح جنت میں داخل ہوگا اور اس کا دنیاوی

۱۔ (المعجم الکبیر ج ۲۳ ص ۳۶۸۔۳۶۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

۲۔ (فتاوی حدیثیہ ص ۴۱' مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر ۱۳۵۶ھ)

عورتوں اور حوروں کے ساتھ نکاح کر دیا جائے گا۔ (۱)

دُنیا کی نعمتوں میں کدورت ملی ہوئی ہے۔خوشی کے ساتھ رنج ہے تندرستی کے ساتھ بیماری ہے۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے ہیں۔ مال اور عہدوں کے ساتھ دوسروں کا حسد اور دشمنی ہے اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ سب نعمتیں فانی ہیں، صاحب نعمت بھی فانی ہے نعمتوں کا دوام اور ہیشگی کسی کے لیے نہیں۔ آخرت کی نعمتیں ابدی ہیں دائمی ہیں ہمیشہ کے لیے ہیں۔ ان کے زوال اور چھن جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ زندگی بھی دائمی ہوگی۔ (خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا) ان کی شان میں فرمادیا ہے۔ (۲)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ ﴾

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی بھی مثال بیان فرمائے، چاہے وہ مچھر کی ہو، یا کسی ایسی چیز کی جو مچھر سے بھی زیادہ (معمولی) ہو سو جو لوگ ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ بلاشبہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور وہ لوگ

۱۔ (فتاوی حدیثیہ ص ۱۵۶، مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ، مصر ۱۳۵۶ھ)

۲۔ تفسیر انوار البیان

جنہوں نے کفر اختیار کیا سو وہ کہتے ہیں کہ کیا ارادہ کیا اللہ نے اس مثال دینے کا اللہ اس مثال سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے (مگر) وہ گمراہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہیں۔

شان نزول

ابن جریرؒ نے سدیؒ سے اپنی اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی یہ دو مثالوں بیان فرمائیں (آیت) "کمثل الذی استوا قد نارا"۔ اور (آیت) "اور کصیب من السمآء"۔ تو منافق کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس سے بہت اونچی اور بلند ہے کہ اس قسم کی مثالیں بیان کرے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کردیں اور واحدی نے عبدالغنی بن سعید ثقفیؒ، موسیٰ بن عبدالرحمنؒ، ابن جریجؒ، عطاءؒ حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جب مشرکین کے معبودوں کا تذکرہ فرمایا کہ اگر مکھی بھی ان سے کسی چیز کو چھین لے تو وہ اسے دور نہیں کرسکتے اور ان کے معبودوں کی حقیقت واضح فرمائی اور مکڑی کا ذکر کیا ہے، ان چیزوں کے ذکر سے کیا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی عبدالغنی غیر معتبر راوی ہیں، عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں بواسطہ معمر قتادہؒ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا تو مشرکین کہنے لگے کہ مکھی اور مکڑی کے ذکر سے کیا فائدہ، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی اور ابن ابی حاتمؒ نے حسنؒ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے (آیت) "یایھا الناس ضرب مثل"۔ آیت نازل فرمائی تو مشرکین کہنے کہ ان مثالوں

اوراس قسم کی مثالوں سے کیا حاصل ہے تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ واقعی اللہ تعالیٰ نہیں شرماتے اس بات سے کہ کوئی یہاں بیان کردیں پہلا قول سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے سورت کے شروع میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے زیادہ مناسب اور روایت میں مشرکین کا جو ذکر آرہا ہے وہ اس آیت کریمہ کے مدنی ہونے کے مخالف نہیں۔ (۱)

اللہ جل شانہ کی مثالیں اور دنیا

ابن عباس ؓ، ابن مسعودؓ اور چند صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت ہے کہ جب اوپر کی تین آیتوں میں منافقوں کی دو مثالیں بیان ہوئیں یعنی آگ اور پانی کی تو وہ کہنے لگے کہ ایسی ایسی چھوٹی مثالیں اللہ تعالیٰ ہرگز بیان نہیں کرتا۔ اس پر یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں جب قرآن پاک میں مکڑی اور مکھی کی مثال بیان ہوئی تو مشرک کہنے لگے بھلا ایسی حقیر چیزوں کے بیان کی قرآن جیسی اللہ کی کتاب میں کیا ضرورت تو جواباً یہ آیتیں اتریں اور کہا گیا کہ حق کے بیان سے اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکہ میں اتری حالانکہ ایسا نہیں واللہ اعلم۔ اور بزرگوں سے بھی اس طرح کا شان نزول مروی ہے۔ ربیع بن انسؒ فرماتے ہیں یہ خود ایک مستقل مثال ہے جو دنیا کے بارے میں بیان کی گئی۔ مچھر جب تک بھوکا ہوتا ہے زندہ رہتا ہے جہاں موٹا تازہ ہوا مرا۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں کہ جب دنیاوی نعمتیں دل کھول کر حاصل کر لیتے ہیں وہیں اللہ کی پکڑ آجاتی ہے جیسے اور جگہ فرمایا آیت (فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ)6۔ الانعام:44) جب یہ ہماری نصیحت بھول جاتے ہیں تو ہم ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیتے

۱۔ تفسیر ابن عباس (لباب النقول فی اسباب النزول از علامہ سیوطی (رح)

ہیں یہاں تک کہ اترانے لگتے ہیں اب دفعتہً ہم انہیں پکڑ لیتے ہیں (ابن جریر ابن ابی حاتم) امام ابن جریرؒ نے پہلے قول کو پسند فرمایا ہے اور مناسبت بھی اسی کی زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔ تو مطلب یہ ہوا کہ مثال چھوٹی سے چھوٹی ہو یا بڑی سے بڑی بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نہ رکتا ہے نہ جھجھکتا ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر دنیا کی قدر اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔ دوسرے یہ معنی ہیں کہ اس سے زیادہ بڑی اس لیے کہ بھلا مچھر سے ہلکی اور چھوٹی چیز اور کیا ہوگی؟ قتادہ بن دعامہؒ کا یہی قول ہے۔ ابن جریرؒ بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جس کسی مسلمان کو کانٹا چبھے یا اس سے زیادہ تو اس پر بھی اس کے درجے بڑھتے ہیں اور گناہ مٹتے ہیں اس حدیث میں بھی یہی لفظ فوقھا ہے تو مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان چھوٹی بڑی چیزوں کے پیدا کرنے سے شرماتا نہیں اور نہ رکتا ہے۔ اسی طرح انہیں مثال کے طور پر بیان کرنے سے بھی اسے عار نہیں۔ ایک جگہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے کان لگا کر سنو جنہیں اللہ کے سوا پکار سکتے ہو وہ سارے کے سارے جمع ہو جائیں تو بھی ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر ان سے کچھ چھین لے جائے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ عابد اور معبود دونوں ہی بیحد کمزور ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو مددگار بناتے ہیں مکڑی کے جالے جیسی ہے جس کا گھر تمام گھروں سے زیادہ بودا اور کمزور ہے اور جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال پاک درخت سے دی جس کی جڑ مضبوط ہو اور جس کی شاخیں آسمان میں ہوں جو بحکم اللہ ہر وقت پھل دیتا ہو۔ ان مثالوں کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے غور و تدبر کے لیے بیان فرماتا ہے اور ناپاک کلام کی مثال ناپاک درخت جیسی ہے جو زمین کے اوپر اوپر ہی ہو اور جڑیں مضبوط نہ ہوں اللہ

تعالیٰ ایمان والوں کو مضبوط بات کے ساتھ دنیا اور آخرت میں برقرار رکھتا ہے اور ظالموں کو گمراہ کرنا ہے اللہ جو چاہے کرے۔ دوسری جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ اس مملوک غلام کی مثال پیش کرتا ہے جسے کسی چیز پر اختیار نہیں۔ اور جگہ فرمایا۔ دو شخصوں کی مثال اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے جن میں سے ایک تو گونگا اور بالکل گرا پڑا بے طاقت ہے جو اپنے آقا پر بوجھ ہے جہاں جائے برائی ہی لے کر آئے اور دوسرا وہ جو عدل و حق کا حکم کرے، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ دوسری جگہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے خود تمہاری مثال بیان فرماتا ہے کیا تم اپنی چیزوں میں اپنے غلاموں کو بھی اپنا شریک اور برابر کا حصہ دار سمجھتے ہو؟ اور جگہ ارشاد ہے ان مثالوں کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں (پوری طرح) صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ بعض سلف صالحین فرماتے ہیں جب میں قرآن کی کسی مثال کو سنتا ہوں اور سمجھ نہیں سکتا تو مجھے رونا آتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ ان مثالوں کو صرف عالم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں مثالیں خواہ چھوٹی ہوں خواہ بڑی ایماندار ان پر ایمان لاتے ہیں اور انہیں حق جانتے ہیں اور ان سے ہدایت پاتے ہیں۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ وہ انہیں اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ ”انہ“ کی ضمیر کا مرجع مثال ہے یعنی مومن اس مثال کو اللہ کی جانب سے اور حق سمجھتے ہیں اور کافر باتیں بناتے ہیں جیسے سورہ مدثر میں آیت (وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً) 74۔المدثر: 31) یعنی ہم نے آگ والے فرشتوں کی گنتی کو کفار کی آزمائش کا سبب بنایا ہے۔ اہل کتاب یقین کرتے ہیں اور ایماندار ایمان میں بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کو کوئی شک نہیں رہتا لیکن بیمار دل اور کفار کہہ اٹھتے ہیں کہ اس مثال سے کیا مراد؟ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ تیرے رب کے لشکروں کو اس

کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہاں بھی اسی ہدایت وضلالت کو بیان کیا۔[۱]

ایک ہی مثال کے دو ردعمل کیوں؟

صحابہ کرامؓ سے مروی ہے کہ اس سے گمراہ منافق ہوتے ہیں اور مومن راہ پاتے ہیں۔ گمراہ اپنی گمراہی میں بڑھ جاتے ہیں کیونکہ اس مثال کے درست اور صحیح ہونے کا علم ہونے کے باوجود اسے جھٹلاتے ہیں اور مومن اقرار کر کے ہدایت ایمان کو بڑھا لیتے ہیں۔ فاسقین سے مراد منافق ہیں۔ بعض نے کہا ہے کافر مراد ہیں جو پہچانتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ حضرت سعد کہتے ہیں مراد خوارج ہیں۔ اگر اس قول کی سند حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تک صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ تفسیر معنوی ہے اس سے مراد خوارج نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ فرقہ بھی فاسقوں میں داخل ہے۔ جنہوں نے نہروان میں حضرت علیؓ پر چڑھائی کی تھی تو یہ لوگ گو نزول آیت کے وقت موجود نہ تھے لیکن اپنے بدترین وصف کی وجہ سے معناً فاسقوں میں داخل ہیں۔ انہیں خارجی اس لیے کہا گیا ہے کہ امام کی اطاعت سے نکل گئے تھے اور شریعت اسلام کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے۔ لغت میں فاسق کہتے ہیں اطاعت اور فرماں برداری سے نکل جانے کو۔ جب چھلکا ہٹا کر خوشہ نکلتا ہے تو عرب کہتے ہیں فسقت چوہے کو بھی فویسقہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بل سے نکل کر فساد کرتا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پانچ جانور فاسق ہیں حرم میں اور حرم سے باہر کے قتل کر دیئے جائیں۔ کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کالا کتا۔ پس لفظ فاسق کافر کو اور ہر نافرمان کو شامل ہے لیکن کافر فسق زیادہ سخت اور زیادہ برا ہے اور آیت میں مراد فاسق سے کافر ہے واللہ اعلم۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "قیامت کے دن ایک بڑا اور موٹا آدمی آئے گا، اللہ کے نزدیک اس کی وقعت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگی۔" [۱]

سیدنا سہل بن سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر دنیا کی وقعت اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔" [۲]

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي: ارشاد فرمایا: (وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ)[الاحزاب:۵۳] "اور اللہ حق سے شرم نہیں کرتا۔"

سیدہ ام سلیمؓ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایک موقع پر عرض کیا تھا، بیشک اللہ حق بات سے نہیں شرماتا۔ [۳]

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کا بندہ اور بندی اسلام میں بوڑھے ہوجائے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے سے حیا فرماتا ہے۔ [۴]

حافظ سیوطیؒ، امام ابن النجارؒ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو بوڑھا شخص صحیح عمل کرتا ہو اور پابندی سے سنت پر عمل کرتا

۱۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (أولئک الذین کفروا بآیات ربھم ولقاۂ فحبطت أعمالھم): ۴۷۲۹]

۲۔[ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ عزوجل: ۲۳۲۰]

۳۔[بخاری، کتاب الغسل، باب إذا احتلمت المرأۃ: ۲۸۲۔ مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منھا: ۳۱۳]

۴۔(کنز العمال ج۱۵ ص۶۷۲ مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۵ھ) ہے۔

ہوں اللہ تعالیٰ کو اس سے حیا آتی ہے کہ وہ کوئی سوال کرے اور اللہ اس کو نہ دے۔ [۱]

حضرت ابوسعیدؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب کوئی اللہ کا بندہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھے تو اللہ کو اس سے حیا آتی ہے کہ وہ اپنی کسی حاجت کا سوال کرے اور اس کے پورا ہونے سے پہلے لوٹ جائے۔ [۲]

امام ابوداؤدؒ روایت کرتے ہیں: حضرت سلیمانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک تمہارا رب حیادار، کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے۔ [۳]

﴿ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾ ﴾

جو لوگ اللہ کا وعدہ توڑتے ہیں اس سے پختہ اقرار کرنے کے بعد اور اس کو کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا تھا کہ وہ اسے جوڑے رکھیں، اور زمین (ملک) میں فساد کرتے ہیں وہی لوگ خسارے میں ہیں۔

۱۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج۲ ص ۳۰۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱٤۱٤ھ)

۲۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج۲ ص ۳۰۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱٤۱٤ھ)

۳۔ (سنن ابوداؤد ج۱ ص ۲۰۹، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور ۱٤۰۵ھ)

اس قسم کی مثال سے یہودی گمراہ ہوتے ہیں جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بہت تاکید وزور کے ساتھ وعدہ کرتے ہیں اور پھر بدعہدی کا ارتکاب کرتے ہیں اہل ایمان اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ صلہ رحمی کو ختم کرتے ہیں اور لوگوں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن حکیم سے بدظن کرتے ہیں یہی لوگ دنیا وآخرت کے تباہ ہونے کی وجہ سے گھاٹے اور خسارے میں ہیں۔ [۱]

وہ اللہ تعالیٰ کا عہد توڑتے ہیں۔ اس کے فرمان کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہ سب اوصاف کفار کے ہیں۔ مومنوں کے اوصاف تو اس کے برخلاف ہوتے ہیں جیسے سورہ رعد میں بیان ہے کہ آیت (افمن یعلم) الخ کیا پس وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اترا وہ حق ہے کیا اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھا ہو؟ نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور میثاق نہیں توڑتے اور اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑتے ہیں اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب کی برائی سے کانپتے رہتے ہیں۔ آگے چل کر فرمایا۔ جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑ دیں اور جس چیز کو ملانے کا اللہ کا حکم ہو وہ اسے نہ ملائیں اور زمین میں فساد پھیلائیں ان کے لیے لعنتیں ہیں اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ یہاں عہد سے مراد وہ وصیت ہے جو اللہ نے بندوں کو کی تھی جو اس کے تمام احکام بجالانے اور تمام نافرمانیوں سے بچنے پر مشتمل ہے۔ اس کا توڑ دینا اس پر عمل نہ کرنا ہے۔ بعض کہتے ہیں عہد توڑنے والے اہل کتاب کے کافر منافق ہیں اور عہد وہ ہے جو ان سے تورات میں لیا گیا تھا کہ وہ اس کی تمام باتوں پر عمل

۱۔ تفسیر ابن عباس

کریں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کریں جب بھی آپ تشریف لے آئیں آپ کی نبوت کا اقرار کریں اور جو کچھ آپ اللہ کی جانب سے لے کر آئیں اس کی تصدیق کریں اور اس عہد کو توڑ دینا یہ ہے کہ انہوں نے آپ کی نبوت کا علم ہونے کے باوجود الٹا اطاعت سے انکار کر دیا اور باوجود عہد کا علم ہونے کے اسے چھپایا دنیاوی مصلحتوں کی بنا پر اس کا الٹ کیا۔ امام ابن جریرؒ اس قول کو پسند کرتے ہیں اور مقاتل بن حیانؒ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی خاص جماعت نہیں بلکہ شک و کفر و نفاق والے سب کے سب مراد ہیں۔ عہد سے مراد توحید اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا اقرار کرانا ہے جن کی دلیل میں کھلی ہوئی نشانیاں اور بڑے بڑے معجزے موجود ہیں اور اس عہد کو توڑ دینا توحید و سنت سے منہ موڑنا اور انکار کرنا ہے یہ قول اچھا ہے زمخشریؒ کا میلان بھی اسی طرح ہے وہ کہتے ہیں عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید ماننے کا اقرار ہے جو فطرت انسان میں داخل ہونے کے علاوہ روز میثاق بھی منوایا گیا ہے۔ فرمایا گیا تھا کہ آیت (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ)7۔الاعراف:172) کیا میں تمہارا رب ہوں؟ تو سب نے جواب دیا تھا بلٰی بیشک تو ہمارا رب ہے۔ پھر وہ کتابیں دی گئیں ان میں بھی اقرار کرایا گیا جیسے فرمایا آیت (وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ؕ)2۔البقرۃ:40) میرے عہد کو نبھاؤ میں بھی اپنے وعدے پورے کروں گا۔ بعض کہتے ہیں وہ عہد مراد ہے جو روحوں سے لیا گیا تھا جب وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی پیٹھ سے نکالی گئی تھیں جیسے فرماتا ہے آیت (وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ؕ)7۔الاعراف:172) جب تیرے رب نے اولاد آدم سے وعدہ لیا کہ میں ہی تمہارا رب ہوں اور ان سب نے اقرار کیا۔ اور اس کا توڑنا اس سے انحراف ہے۔ یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر میں منقول ہیں۔ ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں عہد اللہ کو

توڑنا منافقوں کا کام ہے جن میں یہ چھ خصلتیں ہوتی ہیں۔ بات کرنے میں جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، اللہ کے عہد کو مضبوطی کے بعد توڑ دینا، اللہ تعالیٰ نے جن رشتوں کے ملانے کا حکم دیا ہے، انہیں نہ ملانا، زمین میں فساد پھیلانا۔ یہ چھ خصلتیں ان کی اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب کہ ان کا غلبہ ہو اور جب وہ مغلوب ہوتے ہیں تو تین اگلے کام کرتے ہیں۔ سدی فرماتے ہیں قرآن کے احکام کو پڑھنا جاننا سچ کہنا پھر نہ ماننا بھی عہد کو توڑنا تھا اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے ان سے مراد صلہ رحمی کرنا، قرابت کے حقوق ادا کرنا وغیرہ ہے جیسے اور جگہ قرآن مجید میں ہے آیت (فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ 47۔ محمد:22) قریب ہے کہ تم اگر لوٹو تو زمین میں فساد کرو اور رشتے ناتے توڑ دو۔ ابن جریرؒ اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے یعنی جسے ملانے اور ادا کرنے کا حکم دیا تھا انہوں نے اسے توڑا اور حکم عدولی کی۔ خاسرون سے مراد آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں جیسے فرمان باری ہے۔ آیت (أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ 13۔ الرعد:25) ان لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ اہل اسلام کے سوا جہاں دوسروں کے لیے یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد گناہ گار ہیں۔ خاسرون جمع ہے خاسر کی۔ چونکہ ان لوگوں نے نفسیاتی خواہشوں اور دنیوی لذتوں میں پڑ کر رحمت اللہ سے علیحدگی کر لی اس لیے انہیں نقصان یافتہ کہا گیا جیسے وہ شخص جسے اپنی تجارت میں گھاٹا آئے اسی طرح یہ کافر و منافق ہیں یعنی قیامت والے دن جب رحم و کرم کی بہت ہی حاجت ہوگی اس دن رحمت الٰہی سے محروم رہ جائیں گے۔ [۱]

۱۔ تفسیر ابن کثیر

سیدنا جبیر بن مطعمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "رشتہ داری کو کاٹنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" [۱]

سیدنا عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "صلہ رحمی کرنے والا شخص وہ نہیں جو برابر کا معاملہ کرتا ہے، بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا شخص وہ ہے کہ جب اس سے رشتہ داری قطع کی جائے تو وہ اسے ملائے۔" [۲]

سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے رشتہ داری ملاتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں، میں ان سے احسان کرتا ہوں اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں اور میں ان سے حلم و بردباری کا معاملہ کرتا ہوں اور وہ مجھ سے جہالت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر ایسے ہی ہے جس طرح تم کہہ رہے ہو تو گویا کہ تم ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو اور جب تک اس عمل پر قائم رہو گے، ہمیشہ ان کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے ایک مددگار تمہارے ساتھ رہے گا۔" [۳]

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸ ﴾

تم کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، تو اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر

۱۔[بخاری، کتاب الأدب، باب إثم القاطع: ۵۹۸۴۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتہا: ۲۵۵۶]

۲۔[بخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافئ: ۵۹۹۱]

۳۔[مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتہا: ۲۵۵۸]

وہ تمہیں موت دے گا، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ربط آیات: پچھلی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے وجود، توحید اور رسالت کے دلائل واضحہ اور منکرین ومخالفین کے خیالات باطلہ کا رد مذکور تھا، مذکورہ دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انعامات کا ذکر کر کے اس پر اظہار تعجب کیا گیا کہ اتنے احسانات کے ہوتے ہوئے کیسے یہ ظالم کفر و انکار میں مبتلا ہیں جس میں اس پر تنبیہ ہے کہ اگر دلائل میں غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تو کم از کم محسن کا احسان ماننا، اس کی عظیم و اطاعت کرنا تو ہر شریف انسان کا طبعی اور فطری تقاضا ہے، اسی راستے سے تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر آجاؤ۔ [1]

امام ابن جریرؒ نے حضرت ابن مسعودؓ اور کئی دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کیا کہ لفظ آیت "کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم" سے مراد ہے کہ تم کچھ بھی نہ تھے پھر تم کو پیدا فرمایا لفظ آیت "ثم یمیتکم ثم یحییکم" پھر تم کو موت دے گا۔ پھر تم کو زندہ کرے گا۔

امام ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا لفظ آیت "وکنتم امواتا" یعنی تم اپنے باپوں کی پشتوں میں مردہ تھے کچھ بھی نہ تھے پھر تم کو پیدا فرمایا پھر تم کو موت دے گا سچی موت پھر تم کو زندہ کرے گا سچی زندگی (دے کر) جب تم کو (قیامت کے دن) اٹھائے گا۔

عبد بن حمید اور ابن جریرؒ نے حضرت قتادہؒ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ وہ اپنے باپوں کی پیٹھوں میں مردہ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ فرمایا اور ان کو نکالا پھر ان کو موت دے گا جو اس سے

۱۔ تفسیر معارف القرآن

ضروری ہے پھر ان کو زندہ کرے گا قیامت کے دن اٹھانے کے لئے۔ پس یہ دو زندگیاں ہیں اور دو موتیں ہیں۔

وکیع اور ابن جریرؒ نے ابو صالحؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "ثم یمیتکم ثم یحییکم" یعنی تم کو قبر میں زندہ کرے گا پھر وہ تم کو موت دے گا۔

امام ابن جریر نے مجاہدؒ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں تھے یہاں تک کہ تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دے گا سچی موت پھر تم کو زندہ کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول لفظ آیت "ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین" (ہمارے رب نے ہم کو دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ فرمایا) اسی کے مثل ہے۔

امام ابن جریرؒ نے ابو العالیہؒ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ کچھ بھی نہ تھے اس نے ان کو موت دی پھر ان کو زندہ کیا پھر قیامت کے دن زندہ ہونے کے بعد اسی کی طرف وہ لوٹیں گے۔ [۱]

ٹھوس دلائل پر مبنی دعوت

اس بات کا ثبوت دیتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے وہ قدرتوں والا ہے۔ وہی پیدا کرنے والا اور اختیار والا ہے۔ اس آیت میں فرمایا تم اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کیسے کر سکتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے کو عبادت میں شریک کیسے کر سکتے ہو؟ جبکہ تمہیں عدم سے وجود میں لانے والا ایک وہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا کیا یہ بغیر کسی چیز کے پیدا کئے گئے؟ یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ انہوں نے زمین و آسمان بھی پیدا کیا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ بے یقین لوگ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ

۱۔ تفسیر الدر منثور

کفار جو کہیں گے آیت (رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثۡنَتَيۡنِ) 40۔غافر:11) اے اللہ دو دفعہ تو نے ہمیں مارا اور دو دفعہ جلایا ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔ اس سے مراد یہی ہے جو اس آیت (وَ كُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡيَاكُمۡ) 2۔البقرۃ:28) میں ہے مطلب یہ ہے کہ تم اپنے باپوں کی پیٹھ میں مردہ تھے یعنی کچھ بھی نہ تھے۔ اس نے تمہیں زندہ کیا یعنی پیدا کیا پھر تمہیں مارے گا یعنی موت ایک روز ضرور آئے گی پھر تمہیں قبروں سے اٹھائے گا۔ پس ایک حالت مردہ پن کی دنیا میں آنے سے پہلے پھر دوسری دنیا میں مرنے اور قبروں کی طرف جانے کی پھر قیامت کے روز اٹھ کھڑے ہونے کی۔ دو زندگیاں اور دو موتیں۔ ابو صالح ؒ فرماتے ہیں کہ قبر میں انسان کو زندہ کر دیا جاتا ہے۔ عبدالرحمن بن زید ؒ کا بیان ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی پیٹھ میں انہیں پیدا کیا پھر ان سے عہد و پیمان لے کر بے جان کر دیا پھر ماں کے پیٹ میں انہیں پیدا کیا پھر دنیوی موت ان پر آئی پھر قیامت والے دن انہیں زندہ کرے گا لیکن یہ قول غریب ہے۔ پہلا قول ہی درست ہے۔ ابن مسعود ؓ، ابن عباس ؓ اور تابعین ؒ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ [۱]

سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ یہ اس کو زیبا نہیں، ابن آدم مجھے گالی دیتا ہے، حالانکہ یہ اس کو زیبا نہیں، اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ میں اس کو دوبارہ اسی طرح پیدا کرنے پر قادر نہیں جس طرح وہ پہلے تھا اور رہا اس کا مجھے گالی دینا تو یہ اس کا وہ قول ہے کہ میری اولاد ہے، حالانکہ میں اس بات سے پاک ہوں کہ میں کسی کو بیوی یا اولاد بناؤں۔" [۲]

۱۔تفسیر ابن کثیر

۲۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (وقالوا اتخذ اللہ ولدا سبحانہ):٤٤٨٢]

حیات برزخی:

اس آیت میں دنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذکر ہے جو قیامت کے روز ہونے والی ہے قبر کی زندگی قبر کا سوال و جواب اور قبر میں ثواب و عذاب ہونا قرآن کریم کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہے اس کا ذکر نہیں وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اس طرح کی زندگی نہیں ہے جو انسان کو دنیا میں حاصل ہے یا آخرت میں پھر ہوگی بلکہ ایک درمیانی صورت مثل خواب کی زندگی کے ہے اس کو دنیا کی زندگی کا تکملہ بھی کہا جا سکتا ہے اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی اس لیے کوئی مستقل زندگی نہیں جس کا جداگانہ ذکر کیا جائے۔ ۱

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۹ ﴾

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا فرمایا جو کچھ زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو ٹھیک سات آسمان بنایا، اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔

امام عبد بن حمید اور ابن جریرؒ نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت ”ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا“

۱۔ تفسیر معارف القرآن

سے مراد ہے کہ مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے ساری کی ساری (چیزوں کو) یہ اکرام ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے ابن آدم کے لئے۔ ساز و سامان ہے (دنیا کا) اور گزارے کی روزی اور نفع بخش چیزیں ہیں ایک مدت تک۔

امام عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخؒ نے العظمہ میں مجاہدؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا" سے مراد ہے کہ مسخر کر دیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا، لفظ آیت "ثم استوی الی السماء" یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا فرمایا جب زمین کو پیدا فرمایا تو اس سے دھواں ظاہر ہوا اسی لیے فرمایا لفظ آیت "ثم استوی الی السماء فسوھن سبع سموت" یعنی پیدا فرمایا سات آسمانوں کو بعض کو اوپر بعض کے، اور (پیدا فرمایا) سات زمینوں کو ان کے بعض کو نیچے بعض کے۔

عرش پانی پر تھا

امام ابن جریرؒ، ابن المنذرؒ، ابن ابی حاتم اور بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں، سدیؒ کے طریق سے ابو مالک اور ابو صالحؒ سے اور انہوں نے ابن عباسؓ سے، مرہ المدانیؒ سے انہوں نے ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کیا کہ لفظ آیت "ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا، ثم استوی الی السماء فسوھن سبع سموت" سے مراد ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی نہ تھا۔ پانی سے پہلے کسی چیز کو پیدا نہیں فرمایا جب ارادہ فرمایا کہ مخلوق کو پیدا کیا جائے تو پانی سے دھوئیں کو نکالا وہ دھواں پانی پر بلند ہوا اس کو آسمان بنا دیا۔ پھر پانی خشک ہوا تو اسے زمین بنا دیا۔ پھر اس کی سطح میں پھاڑا پھر (دوسری مرتبہ) پھاڑا تو دونوں میں سات زمین بنا دیں۔ اتوار اور پیر کے دن، پھر زمین کو مچھلی پر پیدا فرمایا۔ اور جس کا ذکر ن

والقلم میں ہے اور مچھلی پانی سے ہے اور پانی ایک چٹان پر ہے اور یہ چٹان فرشتہ کی پیٹھ پر ہے اور فرشتہ ایک اور چٹان پر ہے اور چٹان ہوا میں ہے۔ اور وہی چٹان ہے جس کا ذکر حضرت لقمانؒ نے فرمایا۔ یہ نہ آسمان میں اور نہ زمین میں ہے۔ مچھلی نے حرکت کی اور تڑپی تو زمین پر زلزلہ آیا اور اس پر پہاڑوں کو گاڑ دیا پہاڑ نے زمین پر فخر کیا۔ اسی لیے یہ قول ہے لفظ آیت ”وجعل لہا رواسی ان تمید بکم“ اور اس میں پہاڑوں کو پیدا فرمایا اور اس کے رہنے والوں کے لیے خوراک پیدا فرمائی اور درخت پیدا فرمائے اور جو کچھ چاہا دونوں میں پیدا فرمایا۔ منگل اور بدھ کو۔ اور یہ قول ہے (اللہ تعالیٰ کا) لفظ آیت ”ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض“ الی قولہ ”وبارک فیہا وقدر فیہا“ پھر فرماتے ہیں کہ اس کے درختوں کو اگایا۔ اور اس میں ان کی غذائیں مقرر فرمائیں۔ ان کے رہنے والوں سے فرمایا لفظ آیت ”فی اربعۃ ایام، سواء للسائلین“ فرماتے ہیں جو شخص سوال کرے تو اسی طرح معاملہ ہے۔ لفظ آیت ”ثم استوی الی السماء وہی دخان“ اور یہ دھواں تھا پانی کے سانس لینے سے جب وہ سانس لیتا ہے۔ پھر اس کو ایک آسمان بنا دیا پھر اس کو پھاڑ دیا تو دونوں میں سات آسمان بنا دیئے۔ خمیس اور جمعہ کے دن اس دن کا نام جمعہ اس لیے رکھا گیا کیونکہ اس میں آسمان اور زمین کی پیدائش کو جمع فرمایا۔ لفظ آیت ”واوحی فی کل سماء امرھا“ فرمایا ہر آسمان میں اس کی مخلوق کو پیدا فرمایا فرشتوں میں سے اور پیدا فرمایا جو اس میں ہے سمندروں میں سے، پہاڑوں میں سے، اولوں میں سے، اور جو کچھ نہیں جانا گیا۔ پھر دنیا کے آسمان کو ستاروں سے مزین فرمایا پھر (ان ستاروں کو) زینت اور شیاطین سے حفاظت (کا ذریعہ) بنا دیا۔ پھر جب (مخلوق کی) پیدائش سے فارغ ہوئے جس کو پسند فرمایا پھر (اللہ تعالیٰ نے) عرش پر قرار پکڑا۔

امام بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ لفظ آیت ”ثم استوی الی السماء“

سے مراد ہے۔یعنی سات آسمان کو پیدا فرمایا (پھر) فرمایا پانی پر آگ کو جاری فرمایا تو سمندر سے بھاپ اٹھی اور ہوا کی طرف بلند ہوئی پھر اس سے آسمان بنا دیئے۔

امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم اور بیہقیؒ نے ابو عالیہؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "ثم استوی الی السماء" سے مراد ہے کہ اس نے آسمان کو بلند فرمایا اور "فسوھن" سے مراد ہے کہ ان کی پیدائش کو ٹھیک بنا دیا۔

امام عثمان بن سعید الدارمیؒ نے کتاب الرد علی الجہمیہ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے چیزوں کے پیدا فرمانے کا ارادہ فرمایا جس وقت ان کا عرش پانی پر تھا۔ اور اس وقت نہ زمین تھی نہ آسمان تھا۔ (پہلے) ہوا کو پیدا فرمایا اس کو پانی پر مسلط فرمادیا حتی کہ اس کی موجوں میں طغیانی آگئی۔ اور ٹیلوں کی طرح ابھرنے لگی۔ پھر پانی میں سے دھواں، مٹی اور جھاگ کو نکالا۔ اس سے آسمانوں کو پیدا فرمایا اور مٹی سے زمینیں پیدا فرمائیں اور جھاگ سے پہاڑ پیدا فرمائے۔

امام احمد، بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں، مسلم، نسائی، ابن المنذر، ابو الشیخؒ نے العظمہ میں، ابن مردویہ اور بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ نے ہفتہ کے دن مٹی کو پیدا فرمایا۔ اور بدھ کے دن نور کو پیدا فرمایا۔ اور خمیس کے دن اس میں جانور پھیلا دیئے۔ اور جمعہ کے دن آدم (علیہ السلام) کو عصر کے بعد پیدا فرمایا۔

آسمان وزمین کے درمیان کا فاصلہ

امام احمد، عبد بن عبید، ابوداؤد، ترمذیؒ، انہوں نے اس کو حسن بھی کہا ہے۔ ابن ماجہ اور عثمان بن سعید الدارمیؒ نے الرد علی الجہمیہ میں، ابن ابی الدنیاؒ نے المطر میں، ابن ابی عاصم نے السنۃ میں ابو یعلیؒ، ابن خذیمہ نے التوحید میں، ابن ابی حاتم، ابو احمد، الحاکم نے الکنی میں، الطبرانی نے الکبیر میں ابو الشیخ نے

العظمہ میں حاکم (انہوں نے اسے صحیح بھی کہا ہے) اللالکائی نے السنۃ میں اور بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں عباس بن عبدالمطلبؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ان دونوں کے درمیان پانچ سو سال کا راستہ ہے۔ اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک (بھی) پانچ سو سال کا راستہ ہے۔ اور ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی ہے۔ اور ساتویں آسمان پر ایک سمندر ہے۔ اس کی اونچائی اور نیچائی کے درمیان فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ پھر اس کے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں۔ ان کی سرین اور ان کے کھروں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش ہے جس کے اونچے اور نیچے حصہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم اس کے اوپر ہے اور بنی آدم کے اعمال میں سے کوئی چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔

اسحاق بن راہویہؒ نے اپنی سند میں، البزار، ابوالشیخ نے العظمہ میں، ابن مردویہ اور بیہقیؒ نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا آسمان اور زمین کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اسی طرح ساتویں آسمان تک اور زمینوں کے درمیان بھی اسی طرح فاصلہ ہے۔ اور ساتویں آسمان سے عرش کے درمیان تمام فاصلوں کی مثل فاصلہ ہے۔ اور اگر تم اپنے ساتھی کے لیے گڑھا کھودو پھر اسے اس میں لٹکا دو تو اللہ تعالیٰ کو وہاں پاؤ گے یعنی اس کے علم کو۔

امام ترمذی، ابوالشیخ اور ابن مردویہؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ ہم نبی اکرم (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ایک بادل گزرا آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔آپ نے فرمایا یہ بادل ہے یہ زمین کو سیراب کرنے والا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے ایسے شہر کی طرف لے جانا ہے جو اس کی عبادت نہیں کرتے اور نہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں آپ نے فرمایا اس کے اوپر آسمان ہے (پھر فرمایا) کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے ؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا اس کے اوپر رکی ہوئی موج ہے اور محفوظ چھت ہے۔کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے اوپر آسمان ہے۔کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے اوپر دوسرا آسمان ہے۔کیا تم جانتے ہو ان دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان دونوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے یہاں تک کہ آپ نے سات آسمان شمار فرمائے ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ بیان فرمایا۔پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا یہ زمین ہے۔کیا تم جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا اس کے نیچے دوسری زمین ہے اور دونوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔یہاں تک کہ سات زمینیں شمار فرمائیں۔ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

حضرت عثمان بن سعید الدارمیؒ نے الرد علی الجہمیہ میں، ابن المنذر، طبرانی، ابوالشیخ، ابن مردویہ، اللالکائی اور بیہقی ؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے آسمان و زمین کے درمیان پانچ سوسال کا فاصلہ ہے۔ اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سوسال کا فاصلہ ہے۔ اور ہر آسمان کی موٹائی پانچ سوسال کی ہے اور آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سوسال کا فاصلہ ہے۔ اور کرسی اور پانی کے درمیان پانچ سوسال کا فاصلہ ہے اور عرش پانی پر ہے اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جس (دین) پر تم ہو۔

امام بیہقی ؒ نے عبداللہ عمرو بن عاصؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا اے اللہ تیری ذات برکت والی ہے اس کی سفیدی شدید ہے اور دوسرے (آسمان) کی سفیدی اس سے شدید ہے۔ پھر اسی طرح فرماتے گئے یہاں تک کہ سات آسمانوں کا ذکر فرمایا۔ اور ساتویں آسمان کے اوپر پانی کو پیدا فرمایا۔ پانی کے اوپر عرش کو پیدا فرمایا، آسمان دنیا کے اوپر سورج، چاند، ستارے اور رجوم پیدا فرمائے۔

امام ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور ابن مردویہؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ایک آدمی نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ آسمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ موج ہے جو تم سے روک دی گئی ہے۔

اسحاق بن راہویہ نے اپنی سند میں ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور طبرانی ؒ نے الاوسط میں اور ابوالشیخ نے ربیع بن انسؓ سے روایت کیا کہ آسمان دنیا ایک موج ہے جو روک دی گئی۔ اور دوسرا (آسمان) سفید سنگ مرمر کا ہے۔ اور تیسرا لوہے کا ہے۔ اور چوتھا تانبے کا ہے اور پانچواں چاندی کا ہے اور چھٹا سونے کا ہے اور ساتویں سرخ یاقوت کا ہے اور اس کے اوپر نور کے بیابان ہیں۔ اور اس کے اوپر اللہ کے سوا

کوئی نہیں جانتا۔اوروہ فرشتہ جو پردہ پر مقرر کیا گیا ہے اس کو میطا طروش کہا جاتا ہے۔

ابوالشیخ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا کہ آسمان دنیا سبز زمرہ سے ہے اس کا نام رقیعاء ہے اور دوسرا سفید چاندی سے ہے اس کا نام ازقلون ہے۔اور تیسرا سرخ یاقوت سے ہے اور اس کا نام قیدوم ہے۔اور چوتھا سفید موتی سے ہے اس کا نام ماعون ہے۔اور پانچواں سرخ سونے سے ہے اس کا نام ریقا ہے اور چھٹا زرد یاقوت ہے اس کا نام دقناء سے اور ساتواں نور سے ہے اس کا نام عریبا ہے۔

امام ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا کہ آسمان دنیا کا نام رقیع ہے اور ساتویں آسمان کا نام صراخ ہے۔

عثمان بن سعید الدارمیؒ نے کتاب الرد علی الجہمیہ میں اور ابن المنذرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ آسمانوں کا سردار وہ آسمان ہے جس میں عرش ہے۔اور زمینوں کا سردار وہ زمین ہے جس پر تم رہتے ہو۔

ابن ابی حاتم نے شعبیؒ سے روایت کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے ابوالجلد کی طرف لکھا اور ان سے آسمان کے بارے میں پوچھا یہ کون سی چیز سے بنا ہوا ہے؟ انہوں نے ان کی طرف لکھا کہ آسمان اسی موج سے ہے جو روک دی گئی ہے۔

ابن ابی حاتم نے حیہ عوفیؒ سے روایت کیا کہ میں نے حضرت علیؓ کو اس دن پر کہتے ہوئے سنا جس میں وہ قسم اٹھا رہے تھے (اور فرما رہے تھے) قسم ہے اس ذات کی جس نے آسمان کو دھویں اور پانی سے پیدا فرمایا۔

امام ابن ابی حاتم اور ابوالشیخؒ نے حضرت کعبؓ سے روایت کیا کہ آسمان دودھ سے بھی زیادہ سفید ہے۔

عبدالرزاق اور ابن ابی حاتمؒ نے حضرت سفیان ثوریؒ سے روایت کیا کہ زمینوں کے نیچے ایک چٹان ہے ہم کو یہ بات پہنچتی ہے کہ اسی چٹان سے آسمان کی سرسبزی ہے۔

ابوالشیخ نے العظمہ میں اور بیہقی نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ہر چیز میں سوچ بچار کرو لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات میں سوچ بچار مت کرو کیونکہ ساتویں آسمان کے درمیان اس کی کرسی تک سات ہزار نور ہیں اور وہ اس کے اوپر ہے۔

امام عبدالرزاق اور ابن جریر نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول لفظ آیت "فسوھن سبع سموت" سے مراد ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہے اور ہر دو آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اما قولہ تعالیٰ: "وھو بکل شیء علیم"۔

امام ابن الضریس نے حضرت ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا کہ بلاشبہ قرآن میں سب سے زیادہ انصاف والی وہ آیت ہے کہ اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ [۱]

اوپر کی آیات میں ان دلائل قدرت کا بیان تھا جو خود انسان کے اندر ہیں اب اس مبارک آیت میں ان دلائل کا بیان ہو رہا ہے جو روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔" استوا" یہاں قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہے اس لیے کہ اس کا صلہ "الی" ہے "سوھن" کے معنی درست کرنے اور ساتوں آسمان بنانے کے ہیں سماء اسم جنس ہے۔ ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا جب اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو پانی سے

۱۔ الدر منثور

دھواں بلند کیا وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے پھر پانی خشک ہو گیا اور اس کی زمین بنائی پھر اس کو الگ الگ کر کے سات زمینیں بنائیں اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں۔ زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے آیت (ن والقلم مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور صفاۃ فرشتے پر اور فرشتے پتھر پر زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا اور وہ ٹھہر گئی پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو دھواں تھا آسمان بنایا پھر اسی میں سات آسمان بنائے جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں جمعہ کے دن کو اس لیے جمعہ کہا جاتا ہے کہ اس میں زمین و آسمان کی پیدائش جمع ہو گئی ہر آسمان میں اس نے فرشتوں کو پیدا کیا اور ان چیزوں کو جن کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں کہ دنیا آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت دی اور انہیں شیطان سے حفاظت کا سبب بنایا ان تمام چیزوں کو پیدا کر کے پروردگار نے عرش عظیم پر قرار پکڑا جسے فرماتا ہے۔ آیت (خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ) 7۔ الاعراف: 54) یعنی چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کر کے پھر عرش پر مستوی ہو گیا ابن جریرؒ میں ہے حضرت عبداللہ بن سعیدؓ فرماتے ہیں کہ اتوار سے مخلوق کی پیدائش شروع ہوئی۔ دو دن میں زمینیں پیدا ہوئیں دو دن میں ان میں موجود تمام چیزیں پیدا کیں اور دو دن میں آسمانوں کو پیدا کیا جمعہ کے دن آخری وقت ان کی پیدائش ختم ہوئی اور اسی وقت حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور اسی وقت میں قیامت قائم ہو گی۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا اس سے جو دھواں اوپر چڑھا اس کے آسمان بنائے جو ایک پر ایک اس طرح سات ہیں اور زمینیں ایک نیچے ایک اوپر اس طرح سات ہیں۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے جیسے سورہ سجدہ کی آیت میں ہے۔ علماء

کی اس پر متفق ہیں۔ صرف قتادہؒ فرماتے ہیں کہ آسمان زمین سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ قرطبیؒ اس میں توقف کرتے ہیں آیت (والنازعات) کی آیت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں آسمان کی پیدائش کا ذکر زمین سے پہلے ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے جب یہ سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ زمین پیدا تو آسمانوں سے پہلے کی گئی ہے لیکن بعد میں پھیلائی گئی ہے۔ یہی جواب اگلے پچھلے علماء کا ہے۔۔ صحیح مسلم اور نسائی میں حدیث میں ہے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا مٹی کو اللہ تعالیٰ نے ہفتہ والے دن پیدا کیا، پہاڑوں کو اتوار کے دن، درختوں کو پیر کے دن، برائیوں کو منگل کے دن نور کو، بدھ کے دن، جانوروں کو جمعرات کے دن، آدم کو جمعہ کے دن اور عصر کے بعد جمعہ کی آخری ساعت میں عصر کے بعد سے رات تک۔ یہ حدیث غرائب میں سے ہے۔ امام ابن مدینیؒ، امام بخاری وغیرہ نے اس پر بحث کی ہے اور فرمایا ہے کہ کعب کا اپنا قول اور حضرت ابو ہریرہؓ نے کعب کا یہ قول سنا ہے اور بعض راویوں نے اسے غلطی سے مرفوع حدیث قرار دے لیا ہے۔ امام بیہقی کہتے ہیں۔ [1]

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا

۱۔ تفسیر ابن کثیر

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں فرشتوں نے کہا: کیا آپ ایسے شخص کو نائب بنائیں گے جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا؟ حالانکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں آپ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ربط آیات: جس طرح اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا تاکہ انسان ان نعمتوں کا اعتراف کرے اور کفر اور معصیت سے باز آئے اللہ پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کرے' اسی طرح ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ انسان کے مورث اعلیٰ حضرت آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے کن نعمتوں سے نوازا' حضرت آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنایا' ان کو اپنی صورت پر پیدا کیا' ان کو کائنات کی تمام اشیاء کے اسماء کا علم عطا فرمایا اور ان کو مسجود ملائک بنایا' ان کو پہلے جنت میں رکھا پھر ان کو خلافت جاری کرنے کے لیے زمین پر بھیجا اور یہ حضرت آدم (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں' ان کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی اولاد اپنے مورث اعلیٰ پر کی گئی ان نعمتوں کا شکر بجا لائے اچھی طرح سے اس کی اطاعت کرے اور کفر اور معصیت سے دور رہے۔

علامہ بیضاویؒ لکھتے ہیں: "ملائکۃ" کا لفظ "ملاک" کی جمع ہے' یہ "الوکۃ" سے بنا ہے' جس کا معنی رسالت (پیغام پہنچانا) ہے کیونکہ ملائکہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہیں' ان میں سے بعض حقیقۃ رسول

ہیں، مثلاً جو فرشتے خود ان کے لیے رسول ہیں، ان کی حقیقت میں عقلاء کا اختلاف ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ جوہر ہیں جو قائم بذاتہ ہے، اکثر مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ اجسام لطیفہ ہیں جو مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر قادر ہیں، کیونکہ انبیاء کرام (علیہ السلام) ان کو اسی طرح دیکھتے تھے، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق رہتے ہیں۔

ان فرشتوں کو علیین اور ملائکہ مقربین کہا جاتا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی سرمو مخالفت یا نافرمانی نہیں کرتے۔ ان فرشتوں کو "المدبرات امرا" کہا جاتا ہے، ان میں سے بعض فرشتے آسمانوں کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور بعض زمین کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں۔ [1]

خلیفہ کی تعریف اور اس کی اقسام

خلیفہ نائب یا قائم مقام کو کہتے ہیں، جب اصل شخص خود کار حکومت انجام نہ دے سکے تو اس کا خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے، مثلاً اصل شخص کہیں چلا جائے تو عارضی طور پر اس کی جگہ کام کرنے کے لیے خلیفہ مقرر کرتے ہیں یا اصل شخص فوت ہو جائے تو اس کی جگہ خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کہیں جانے یا فوت ہونے سے پاک ہے تو پھر اس کو خلیفہ کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خلیفہ کی ضرورت نہ تھی بلکہ بندوں کو ضرورت تھی کیونکہ انسان اپنی مادی کثافت اور عدم قرب کے حجابات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیض حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اس سے احکام وصول نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسانوں کے درمیان ایک خلیفہ بنایا اور اس کا نام نبی اور رسول رکھا، اور انبیاء (علیہم السلام) کو

۱۔ (انوار التنزیل (درسی) ص ۵۹، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

ایسی صلاحیت اور استعداد اعطا فرمائی کہ وہ فرشتوں کے واسطے سے یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے احکام حاصل کرسکیں۔ عام انبیاء اور مرسلین کی طرف فرشتے بھیجے جاتے ہیں اور مقربین سے اللہ تعالیٰ خود بھی کلام فرماتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے میقات میں کلام فرمایا اور ہمارے نبی حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شب معراج کلام فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور سلف سے اس قصہ کی روایات جو آئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے پیدا ہونے سے دو ہزار برس پہلے زمین پر جنات رہتے تھے انہوں نے زمین پر طرح طرح کے فساد کئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ایک گروہ کو جنات کی تنبیہ اور سرکوبی کے لیے بھیجا۔ ان فرشتوں نے جنات کو مار کر دریا کے ٹاپوں اور جزیروں میں نکال دیا اب بنی آدم کی پیدائش کا حال سن کر فرشتوں نے اسی قیاس پر یہ بات کہی تھی کہ جنات کی طرح بنی آدم بھی زمین میں فساد پھیلا دیں گے لیکن فرشتوں کی یہ بات کچھ اعتراض کے طور پر نہیں تھی کیونکہ خلافت مرضی اللہ تعالیٰ کے وہ کوئی بات منہ سے نکالنے میں معصوم ہیں صرف پیدائش بنی آدم کی حکمت دریافت کرنے کو انہوں نے یہ بات کہی تھی اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں کوئی خفگی ظاہر نہیں فرمائی بلکہ اتنا ہی فرمایا کہ بنی آدم کی پیدائش کی حکمت جو مجھ کو معلوم ہے اس کو تم نہیں جانتے جس کا مطلب یہ تھا کہ بنی آدم کی پیدائش سے زمین میں فقط فساد ہی نہیں پھیلے گا بلکہ ان میں انبیاء صدیق شہید اصلحاء بھی ہوں گے جن سے زمین میں اللہ کا دین پھیلے گا اور پھر اخیر کو اللہ کی جنت آباد ہوگی۔ [۱]

امام حاکمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو جنت سے نکالا

۱۔ تفسیر احسن التفاسیر

اس میں داخل کرنے سے پہلے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لفظ آیت "انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء" اور وہ (ابلیس) اس (جنت) میں عام جنات کی پیدائش سے دو ہزار سال سے پہلے جو جان کی اولاد ہے (کیونکہ جان سارے جنات کا باپ ہے) (مگر) جنات نے زمین میں فساد مچایا۔ اور خون بہائے جب انہوں نے زمین میں فساد کیا تو (اللہ تعالیٰ نے) ان پر فرشتوں کا ایک لشکر بھیجا جنہوں نے ان کی خوب پٹائی کی یہاں تک کہ ان کو سمندروں کے جزائر (کی طرف) بھگا دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لفظ آیت "انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ قالوا اتجعل فیھا من یسفد فیھا ویسفک الدماء" جیسا کہ ان جنات نے کیا (یہ انسان بھی ایسا کرے گا) (اس پر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا لفظ آیت "انی اعلم مالا تعلمون (۳۰)" (میں زیادہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے)۔

امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ نے ابن عمرؓ سے اس طرح روایت کیا کہ ابلیس فرشتوں کے قبیلوں میں سے ایک قبیلہ سے ہے۔ ان کو جن کہا جاتا ہے ان کو فرشتوں کے درمیان سے آگ کی لو سے پیدا کیا گیا۔ اس کا نام حارث تھا جنت کے داروغوں میں ایک داروغہ تھا۔ تمام فرشتے اس قبیلے کے علاوہ نور سے پیدا کئے گئے۔ اور جن کو آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا گیا۔ اور وہ آگ کی زبان ہے جو آگ کی ایک جانب ہوتی ہے جب وہ بھڑک اٹھے سب سے پہلے زمین کے رہنے والوں میں جن تھے۔ انہوں نے اس میں فساد کیا۔ خون بہائے اور ان کے بعض نے بعض کو قتل کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ایک لشکر میں ان کی طرف ابلیس کو بھیجا۔ انہوں نے ان سے جنگ شروع کی یہاں تک کہ ان کو سمندروں کے جزیروں اور پہاڑوں کی طرف بگا دیا۔ جب ابلیس نے یہ کام کیا تو اپنے دل میں تکبر کیا اور کہنے لگا میں نے جو کام کیا وہ کسی نے نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل سے اس بات پر واقف ہوئے مگر فرشتے واقف نہ ہوئے۔ اللہ

تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا لفظ آیت "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" فرشتوں نے عرض کیا" قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویفسک الدماء" (پھر) فرمایا میں ابلیس کے دل سے تکبر اور غرور پر مطلع ہو چکا ہوں کہ تم اس پر مطلع نہیں ہوئے۔ پھر (اللہ تعالیٰ نے) آدم (علیہ السلام) کی مٹی لانے کا حکم فرمایا تو وہ لائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو لیس دار اور بدبودار مٹی سے پیدا فرمایا وہ مٹی کے بعد سڑا ہوا گارا تھا اسی میں سے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا پھر جسم کو چالیس راتیں پڑا رکھا۔ ابلیس اس کے پاس آ کر اس کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارتا تھا تو وہ چھینکتا اور آواز دیتا تھا۔ پھر اس کے منہ کے راستے اندر داخل ہو کر اس کی دبر سے باہر نکل آتا تھا۔ اور اس کی دبر سے اندر داخل ہو کر اس کے منہ سے نکل آتا تھا۔ پھر کہتا تھا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تجھے کس لیے پیدا کیا گیا۔ اگر میں تجھ پر مسلط کر دیا گیا تو ضرور تجھ کو ہلاک کر دوں گا اور اگر تو مجھ پر مسلط ہو گیا تو میں ضرور تیری نافرمانی کروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر روح پھونکی اپنی روح میں سے تو وہ روح گزرتی گئی وہاں گوشت اور خون پیدا ہوتا گیا۔ جب روح ناف تک پہنچی تو انہوں نے اپنے جسم میں سے جس چیز کو دیکھا اس کو بہت پسند کیا۔ (پھر) انہوں نے کھڑے ہونے کوشش کی۔ مگر اس پر قادر نہ ہوئے اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے لفظ آیت "خلق الانسان من عجل" (کہ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے) جب اس کے جسم میں روح پوری ہو گئی تو ان کو چھینک آئی۔ (اس پر) انہوں نے کہا لفظ آیت "الحمد للہ رب الناس" اللہ تعالیٰ کے الہام کی وجہ سے۔ پھر (اللہ تعالیٰ نے) ان فرشتوں سے فرمایا جو ابلیس کے ساتھ تھے خاص طور پر سوائے ان فرشتوں کے جو آسمانوں میں تھے۔ لفظ آیت "اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس۔ انی واستکبر" (سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا انکار اور تکبر کرتے ہوئے) جب اس کے دل میں تکبر پیدا ہوا تو کہنے لگا میں اس کو سجدہ

نہیں کروں گا اور میں اس سے بہتر ہوں اور عمر میں بڑا ہوں اور پیدائش کے لحاظ سے زیادہ طاقتور ہوں۔تو (اس پر) اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام خیر سے مایوس کر دیا اور اس کو شیطان دھتکارا ہوا بنا دیا۔ [۱]

امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ ؒ نے العظمہ میں ابوالعالیہؒ سے روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بدھ کے دن پیدا فرمایا۔اور جنات کو خمیس کے دن پیدا فرمایا۔اور آدم (علیہ السلام) کو جمعہ کے دن پیدا فرمایا۔جنات میں سے ایک قوم نے کفر کیا تو فرشتے ان کی طرف زمین میں اترے اور ان سے جنگ کی (کیونکہ) اس وقت خون ریزی اور فساد تھا زمین میں۔(اس کو دیکھ کر) فرشتوں نے کہا تھا لفظ آیت "اتجعل فیھا من یسفد فیھا ویسفک الدماء"۔(کیا آپ زمین میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتے ہیں جو فساد کرے اور خون بہائے)۔

امام ابن جریرؒ نے ابن زیدؒ سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا فرمایا تو فرشتے اس سے بہت زیادہ ڈر گئے۔اور کہنے لگے اے ہمارے رب آپ نے اس کو کیوں پیدا فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کے لیے جو میری مخلوق میں سے میری نافرمانی کرے گا اور اس دن فرشتوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اور مخلوق نہ تھی۔فرشتے کہنے لگے اے ہمارے رب اور (کیا) ہم پر وہ زمانہ آئے گا جس میں ہم تیری نافرمانی کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں میں زمین میں ایک مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس میں اپنا خلیفہ بناؤں گا وہ لوگ خون بہائیں گے اور زمین میں فساد کریں گے۔فرشتوں نے عرض کیا لفظ آیت "اتجعل فیھا من یفسد فیھا" (کیا آپ اس میں ایسا خلیفہ بنائیں گے جو اس زمین میں فساد کرے گا)۔ہم کو خلیفہ بنا دیجئے کہ ہم اس میں (موجود) ہیں۔لفظ آیت "ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک

۱۔تفسیر الدر منثور

"اور ہم آپ کی حمد کے ساتھ آپ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، پاکی بیان کرتے ہیں۔ لفظ آیت" قال انی اعلم مالا تعلمون" (اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)۔ [۱]

امام ابن جریر اور ابن عساکرؒ نے حضرت ابن مسعودؓ اور دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ مخلوق (پیدا کرنے) سے فارغ ہوئے جو وہ محبوب رکھتے تھے۔ (اس کے بعد) آپ عرش کی طرف متوجہ ہوئے اور ابلیس کو آسمان دنیا کی بادشاہی پر مقرر کر دیا اور وہ فرشتوں کے اس قبیلہ میں سے تھا جس کو جن کہا جاتا تھا۔ ان کا نام جن اس لیے رکھا گیا کیونکہ وہ جنت کے داروغہ تھے۔ اور ابلیس اپنی بادشاہی کے ساتھ داروغہ بھی تھا۔ اس کے دل میں تکبر آ گیا اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ مجھے دیا کیونکہ میرے اندر صلاحیت زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ اس کے خیالات پر مطلع ہوئے تو فرشتوں سے فرمایا لفظ آیت" انی جاعل فی الارض خلیفۃ" کہنے لگے اے ہمارے رب" اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء۔۔قال انی اعلم مالا تعلمون (۳۰)"۔ (بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)۔ [۲]

امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم اور ابن عساکرؒ نے ابن سابطؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا زمین مکہ مکرمہ سے پھیلائی گئی اور فرشتے بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور وہ پہلے طواف کرنے والے تھے۔ اور یہی زمین ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لفظ آیت" انی جاعل فی الارض خلیفۃ" اور کسی نبی کی جب قوم ہلاک ہو جاتی اور وہ نبی اور صالحین عذاب سے نجات پاتے تو سب لوگ مکہ میں آتے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہتے حتی کہ اس (زمین) میں مر جاتے۔

۱۔ تفسیر الدر منشور

۲۔ تفسیر ابن جریر طبری

اور بلاشبہ نوح اور ہود اور شعیب اور صالح (علیہم السلام) کی قبریں زمزم اور رکن اور مقام کے درمیان ہیں۔

امام عبدالرزاق، عبد بن حمید اور ابن جریرؒ نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول لفظ آیت" نحن نسبح بحمدک ونقدس لک" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ" التسبیح" سے مراد تسبیح ہے اور" التقدیس" سے مراد نماز ہے۔ (۱)

امام ابن ابی شیبہؒ، احمدؒ، ترمذی اور نسائیؒ نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب کلام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لیے چنا۔ سبحان ربی وبحمدہ اور دوسرے لفظ میں سبحان اللہ وبحمدہ ہے۔

امام ابن جریر اور ابونعیمؒ نے الحلیہ میں سعد بن جبیرؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر خطابؓ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرشتوں کی نماز کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جبرائیل (علیہ السلام) تشریف لائے اور فرمایا کہ آسمان دنیا کے فرشتے قیامت تک سجدہ میں ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں لفظ آیت" سبحان ذی الملک والملکوت" اور دوسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک رکوع میں ہیں اور کہہ رہے ہیں" سبحان ذی العزت والجبروت"۔ اور تیسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک قیام میں ہیں اور کہہ رہے ہیں سبحان الحی الذی لا یموت۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود اور دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کیا کہ" ونقدس لک" سے مراد ہے ہم آپ کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ (۲)

۱۔ تفسیر الدر منشور

۲۔ تفسیر ابن جریر طبری، در منشور

وکیع ،سفیان بن عیینہ،عبدالرزاق ،سعید بن منصور،عبد بن حمیداور ابن جریر(رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ لفظ آیت "انی اعلم مالا تعلمون" سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ابلیس کی معیت اور معصیت کے لیے اس کو پیدا کرنے کا علم تھا۔

امام عبدحمید اور ابن جریرؒ نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "انی اعلم مالا تعلمون" سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ عنقریب اس خلیفہ میں سے انبیاء، رسل اور صالحین ہوں گے اور جنت میں رہنے والے (پیدا) ہونگے۔ ①

امام احمد، عبد بن حمید، ابن ابی الدنیاؒ نے العقوبات میں ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں بیہقیؒ نے الشعب میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرف اتارا تو فرشتوں نے کہا اے ہمارے رب لفظ آیت " قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء، ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک، قال انی اعلم مالا تعلمون" فرشتوں نے عرض کیا اے ہمارے رب ہم بنی آدم سے زیادہ آپ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فرشتوں میں سے دو فرشتے لے آؤ میں ان دونوں کو زمین کی طرف اتاروں گا پھر ہم دیکھیں گے وہ کس طرح عمل کرتے ہیں؟ فرشتوں نے کہا ہاروت اور ماروت (دونوں حاضر ہیں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا زمین کی طرف اتر جاؤ اور ان دونوں (کے امتحان) کے لیے زہرہ کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بنا دیا گیا جو بشر کی سب سے اچھی صورتوں میں سے تھی۔ وہ ان کے پاس آئی تو ان دونوں نے اس سے اس کی ذات کے بارے میں سوال کیا۔ وہ کہنے لگی میں تمہارا سوال پورا نہیں کروں گا

۱۔ تفسیر الدر منثور

جب تک کہ تم دونوں ان شرک کے کلمات کو نہیں کہو گے۔ دونوں نے کہا اللہ کی قسم ہم اللہ کے ساتھ کبھی بھی شرک نہیں کریں گے۔ وہ عورت ان کے پاس سے چلی گئی پھر ایک بچے کو اٹھائے ہوئے آئی ان دونوں نے پھر اس سے قضائے شہوت کا سوال کیا۔ کہنے لگی میں تمہارے سوال کو پورا نہیں کروں گی اللہ کی قسم جب تک کہ تم اس بچے کو قتل نہیں کرو گے۔ کہنے لگے اللہ کی قسم ہم اس کو کبھی بھی قتل نہیں کریں گے پھر وہ چلی گئی اور شراب کا ایک پیالہ لے کر واپس آئی۔ ان دونوں نے پھر اپنی خواہش کا سوال کیا کہنے لگی اللہ کی قسم میں تمہارے سوال کو پورا نہ کروں گی جب تک تم اس شراب کو نہ پیو گے۔ چنانچہ دونوں نے شراب کو پیا جب نشہ ہوا تو اس عورت پر واقع ہو گئے اور بچے کو بھی قتل کیا۔ جب ان کا نشہ ختم ہوا تو عورت نے کہا اللہ کی قسم تم نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ پہلے تم نے دونوں کاموں کا مجھ پر انکار کیا تھا۔ پھر تم نے ان دونوں کاموں کو کر لیا جب تم نشہ میں مدہوش ہوئے۔ (اس جرم کے بعد) ان کو دنیا اور آخرت کے عذاب کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے دنیا کے عذاب کو اختیار کیا۔ [۱]

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۱ ﴾

اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان سب چیزوں کے نام بتاؤ۔

۱۔ تفسیر ابن جریر، درمنثور

لفظ آدم کے معنی

محی الدین درویش ؒ لکھتے ہیں: آدم اسم علم ہے اور عجمی ہے جیسے آذر، عاجر اور عاذر ہے، اور یہ علمت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے، اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ یہ "ادمۃ" (گندم گوں رنگ) سے مشتق ہے یا "ادیم الارض" (زمین کی سطح) سے مشتق ہے، ان کا قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اشتقاق عربی زبان کا خاصہ ہے، عجمی لفظ کا مادہ اشتقاق عربی الفاظ کیسے ہو سکتے ہیں۔ (۱)

حافظ جلال الدین سیوطی ؒ لکھتے ہیں: امام فریابی ؒ، امام ابن سعد، امام ابن جریر ؒ، امام ابن ابی حاتم ؒ، امام حاکم ؒ، اور امام بیہقی ؒ، نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو آدم اس لیے کہا گیا ہے، کہ ان کو ادیم ارض (زمین کی سطح) سے بنایا گیا ہے، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے، اسی طرح لوگوں کے رنگ مختلف ہیں، سرخ، سفید، اور سیاہ، پاک اور نجس۔ (۲)

امام الفریابی ؒ، ابن سعدؒ، ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ، حاکم اور بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کیا کہ آدم اس لیے نام رکھا گیا کیونکہ وہ سطح زمین سے پیدا کئے گئے جس میں سرخ سفید اور سیاہ اجزاء تھے۔ اسی وجہ سے لوگوں کے رنگ بھی مختلف ہیں ان میں سرخ، سفید، سیاہ، اچھے اور برے (سب) ہیں۔

عبد بن حمیدؒ نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو سطح زمین سے

۱۔ (اعراب القرآن وبیانہ، ج۱ ص۸۰، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

۲۔ (الدر المنثور، ج۱ ص۲۹، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

پیدا فرمایا۔ سرخ، سفید اور کالی مٹی سے۔ [۱]

آدم (علیہ السلام) کی وجہ فضیلت

یہاں سے اس بات کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم میں حضرت آدم (علیہ السلام) کو فرشتوں پر بھی فضیلت دی۔ یہ واقعہ فرشتوں کے سجدہ کرنے کے بعد کا ہے لیکن اللہ کی جو حکمت آپ کے پیدا کرنے میں تھی اور جس کا علم فرشتوں کو نہ تھا اور اس کا اجمالی بیان اوپر کی آیت میں گزرا ہے اس کی مناسبت کی وجہ سے اس واقعہ کو پہلے بیان کیا اور فرشتوں کا سجدہ کرنا جو اس سے پہلے واقعہ ہوا تھا بعد میں بیان کر دیا تاکہ خلیفہ کے پیدا کرنے کی مصلحت اور حکمت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شرافت اور فضیلت حضرت آدم کو اس لیے ملی کہ انہیں وہ علم حاصل ہے جس سے فرشتے خالی ہیں، فرمایا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو تمام نام بتائے یعنی ان کی تمام اولاد کے علاوہ سب جانوروں، زمین، آسمان، پہاڑ، تری، خشکی، گھوڑے، گدھے، برتن، چرند، فرشتے، تارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے نام بتائے گئے۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ فرشتوں اور انسانوں کے نام معلوم کرائے گئے تھے صحیح قول یہی ہے کہ تمام چیزوں کے نام سکھائے تھے ذاتی نام بھی صفاتی نام بھی اور کاموں کے نام بھی، جیسے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ گوز کا نام تک بھی بتایا گیا تھا۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام بخاریؒ یہ حدیث لائے ہیں۔ [۲]

مسئلہ شفاعت

۱۔ تفسیر الدر منثور

۲۔ تفسیر ابن کثیر

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ ایمان دار قیامت کے دن جمع ہوں گے اور کہیں گے کیا اچھا ہوگا اگر کسی کو ہم اپنا سفارشی بنا کر اللہ کے پاس بھیجیں چنانچہ یہ سب کے سب حضرت آدم (علیہ السلام) کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ آپ ہم سب کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری سفارش لے جائیں۔ جو ہم اس سے راحت پائیں۔ حضرت آدم (علیہ السلام) یہ سن کر جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں۔ انہیں اپنا گناہ یاد آجائے گا۔ پھر نوح (علیہ السلام) کے پاس آئیں گے آپ بھی یہی جواب دیں گے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اپنے بیٹے کے لیے اپنا دعا مانگنا یاد کر کے شرما جائیں گے اور فرمائیں گے تم خلیل الرحمن حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس جاؤ۔ یہ سب آپ کے پاس آئیں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب پائیں گے۔ آپ فرمائیں گے تم موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاؤ جن سے اللہ نے کلام کیا اور جنہیں تورات عنایت فرمائی۔ یہ سن کر سب کے سب حضرت موسیٰ کے پاس آئیں گے اور آپ سے بھی یہی درخواست کریں گے لیکن یہاں سے بھی جواب پائیں گے آپ کو بھی ایک شخص کو بغیر قصاص کے مار ڈالنا یاد آجائے گا اور شرمندہ ہو جائیں گے اور فرمائیں گے تم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاؤ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ یہ سب ان کے پاس بھی جائیں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب ملے گا کہ میں اس لائق نہیں تم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ جن کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے ہیں۔ اب وہ سارے کے سارے میرے پاس آئیں گے میں آمادہ ہو جاؤں گا اور اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا۔ مجھے اجازت دے دی جائے گی میں اپنے رب کو دیکھتے

ہی سجدے میں گر پڑوں گا جب تک اللہ کو منظور ہوگا سجدے میں ہی پڑا رہوں گا پھر آواز آئے گی کہ سر اٹھایئے سوال کیجئے پورا کیا جائے گا، کہئے سنا جائے گا، شفاعت کیجئے قبول کی جائے گی۔ اب میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اللہ تعالیٰ کی وہ تعریفیں بیان کروں گا جو اسی وقت اللہ تعالیٰ مجھے سکھائے گا پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے حد مقرر کر دی جائے گی میں انہیں جنت میں پہنچا کر پھر آؤں گا۔ پھر اپنے رب کو دیکھ کر اسی طرح سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر شفاعت کروں گا پھر حد مقرر ہوگی انہیں بھی جنت میں پہنچا کر تیسری مرتبہ آؤں گا پھر چوتھی بار ضرور ہوں گا یہاں تک کہ جہنم میں صرف وہی رہ جائیں گے جنہیں قرآن نے روک رکھا ہو اور جن کے لیے جہنم کی مداومت واجب ہوگئی ہو (یعنی شرک و کفر کرنے والے) صحیح مسلم شریف میں نسائی میں ابن ماجہ وغیرہ میں یہ حدیث شفاعت موجود ہے۔ یہاں اس کے وارد کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ جملہ بھی ہے کہ لوگ حضرت آدم (علیہ السلام) سے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے فرمایا کہ لو اگر تم اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ساری مخلوق سے زیادہ علم والے ہو یا اپنی اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ نہ بنائے گا تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ یہ بھی مروی ہے کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ "بنی آدم فساد کریں گے اور خون بہائیں گے" سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ لیکن قول پہلا ہی ہے۔ گویا اس میں انہیں ڈانٹا گیا کہ بتاؤ تمہارا قول کہ تم ہی زمین کی خلافت کے لائق ہو اور انسان نہیں۔ تم ہی میرے تسبیح خواں اور اطاعت گزار ہو اور انسان نہیں۔ اگر تم صحیح ہو تو لو یہ چیزیں جو تمہارے سامنے موجود ہیں۔ انہی کے نام بتاؤ۔ (۱)

۱۔ تفسیر ابن کثیر

﴿ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾

انھوں نے عرض کیا کہ تو پاک ہے، ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا، بیشک تو ہی علم والا (اور) حکمت والا ہے۔

بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام صرف حضرت آدم (علیہ السلام) کو سکھائے گئے تھے اور فرشتے اس تعلیم میں شریک نہیں تھے، اس صورت میں اس سے ناموں کے بارے میں پوچھنا یہ بتانے کے لیے تھا کہ تم میں وہ صلاحیت نہیں رکھی گئی جو آدم (علیہ السلام) کی تخلیق سے مقصود ہے، دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ آدم (علیہ السلام) کو سکھاتے وقت فرشتے موجود تھے؛ لیکن چونکہ ان میں ان باتوں کو سمجھنے یا یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی اس لیے وہ امتحان کے وقت جواب نے دے سکے، اس صورت میں ان کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمیں وہی علم حاصل ہوسکتا ہے جو آپ ہمیں دینا چاہیں اور اس کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا کردیں۔ (۱)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں سبحان اللہ کے معنی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور اپنے پاس کے دوسرے اصحاب سے ایک مرتبہ سوال کیا کہ آیت (لا الہ الا اللہ) تو ہم جانتے ہیں لیکن دعا (سبحان اللہ) کیا کلمہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو باری تعالیٰ نے اپنے نفس کے لیے پسند فرمایا ہے اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور اس کا کہنا اسے

۱۔ آسان ترجمہ قرآن

محبوب ہے۔حضرت میمون بن مہران ؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور تمام برائیوں سے پاکیزگی کا بیان ہے۔

﴿ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٣٣﴾ ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتادو، جب آدم نے ان کو ان چیزوں کے نام بتادیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ، کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کا علم وفضل ظاہر ہونا

جب فرشتوں نے ان چیزوں کے نام بتانے سے اپنے عاجز ہونے کا اظہار کر دیا، جو ان پر پیش کی گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو حکم فرمایا کہ تم ان کے نام بتادو، چنانچہ انہوں نے ان چیزوں کے نام بتا دیئے۔فرشتوں کی عاجزی کا اور حضرت آدم (علیہ السلام) کے علم کا خوب اچھی طرح مظاہرہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین

کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو تمہیں توقف کرنا چاہیے تھا اور اس انتظار میں رہنا مناسب تھا کہ اس نئی مخلوق کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہو جائیں جو اس کے فضل و کمال پر اور اس کے مستحق خلافت ہونے پر دلالت کریں۔ خلیفہ پیدا فرمانے کا اعلان سنتے ہی اشکال کرنا درست نہ تھا۔ [۱]

طبری نے جامع میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور دیگر چند صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اس آیت کی تفسیر یوں فرماتے ہیں کہ جو بات وہ ظاہر کر رہے تھے وہ یہ تھی۔ اتجعل فیھا من یفسد فیھا۔ اور جو بات چھپائی جا رہی تھی وہ شیطان کا تکبر تھا جو اس نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ [۲]

حضرت آدم نے نام بتا دیئے کہ تمہارا نام جبرائیل ہے تمہارا نام میکائیل ہے، تم اسرافیل ہو یہاں تک کہ چیل کوے وغیرہ سب کے نام بھی جب ان سے پوچھے گئے تو انہوں نے بتا دئے۔ جب حضرت آدم (علیہ السلام) کی یہ فضیلت فرشتوں کو معلوم ہوئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا دیکھو میں نے تم سے پہلے نہ کہا تھا کہ میں ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہوں۔ جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے تھے اسے بھی میں جانتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے دل میں جو تکبر اور غرور تھا اسے میں جانتا تھا۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ زمین میں ایسی شخصیت کو کیوں پیدا کرتا ہے جو فساد کرے اور خون بہائے یہ تو وہ قول تھا جسے انہوں نے ظاہر کیا تھا اور جو چھپایا تھا وہ ابلیس کے دل میں غرور اور تکبر تھا۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بعض صحابہؓ اور سعید بن جبیرؒ اور مجاہدؒ اور سدیؒ اور ضحاکؒ اور ثوریؒ کا یہی قول ہے۔ ابن جریرؒ بھی اسی کو

۱۔ تفسیر انوار البیان

۲۔ تفسیر ابن مسعود

پسند فرماتے ہیں اور ابوالعالیہؒ، ربیع بن انسؒ۔ حسنؒ اور قتادہؒ کا قول ہے کہ ان کی باطن بات ان کا یہ کہنا تھا کہ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا ہم اس سے زیادہ عالم اور زیادہ بزرگ ہوں گے لیکن بعد میں ثابت ہوگیا اور خود انہوں نے بھی جان لیا کہ آدم (علیہ السلام) کو علم اور فضیلت دونوں میں ان پر فوقیت حاصل ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا جس طرح تم ان چیزوں کے ناموں سے بے خبر ہو اسی طرح تم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ان میں بھلے برے ہر طرح کے ہونگے۔ فرماں بردار بھی ہوں گے اور نافرمان بھی۔ اور میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مجھے جنت دوزخ دونوں کو بھرنا ہے لیکن تمہیں میں نے اس کی خبر نہیں دی۔ اب جب کہ فرشتوں نے حضرت آدم کو دیا ہوا علم دیکھا تو ان کی بندگی کا اقرار کرلیا۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں سب سے اولیٰ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ آسمان وزمین کے غیب کا علم تمہارے ظاہر و باطن کا علم مجھے ہے ان کے ظاہری قول کو اور ابلیس کے باطنی عجب وغرور کو بھی جانتا تھا۔ اس میں چھپانے والا صرف ایک ابلیس ہی تھا لیکن صیغہ جمع کا لایا گیا ہے اس لیے کہ عرب میں یہ دستور ہے اور ان کے کلام میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایک کے یا بعض کے ایک کام کو سب کی طرف نسبت کردیا کرتے وہ کہتے ہیں کہ لشکر مار ڈالا گیا یا انہیں شکست ہوئی حالانکہ شکست اور قتل ایک کا یا بعض کا ہوتا ہے اور صیغہ جمع کا لاتے ہیں۔ [1]

﴿ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۳۴ ﴾

۱۔ تفسیر ابن کثیر

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ "اسجدوا لادم" سے مراد ہے کہ سجدہ آدم (علیہ السلام) کے لیے تھا اور اطاعت اللہ کے لیے تھی۔

فرشتوں کا سجدہ تعظیمی

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ فرشتوں کو (اللہ تعالیٰ نے) حکم فرمایا کہ سجدہ کرو تو سب نے اس (آدم کے لئے) سجدہ کیا اس عزت کی وجہ سے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم کو عزت بخشی۔

ابن عاکرؒ نے ابراہیم مزنیؒ سے روایت کیا کہ آدم (علیہ السلام) سے فرشتوں کے سجدہ کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو کعبہ کی طرح بنا دیا تھا۔

ابو الشیخ نے العظمہ میں محمد بن جعفر مخزومیؒ سے روایت کیا کہ فرشتوں کا آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنا اشارہ کے ساتھ تھا۔

ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے ضمرہؒ سے روایت کیا کہ میں نے ایسے شخص سے سنا جو اس بات کا تذکرہ کر رہا تھا کہ جب فرشتوں کو آدم (علیہ السلام) کے لیے سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو فرشتوں میں سب سے پہلے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنے والے حضرت اسرافیل (علیہ السلام) تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے

میں قرآن شریف کو ان کی پیشانی پر لکھ دیا۔ (۱)

ابن ابی الدنیاؒ نے مکاید الشیطان میں، ابن ابی حاتم اور ابن الانباریؒ نے کتاب الاضداد میں بیہقیؒ نے الشعب میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ابلیس کا نام عزازیل تھا۔ اور چار پروں والے فرشتوں میں سے زیادہ عزت والا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ ابلیس ہو گیا۔

ابن جریرؒ، ابن المنذرؒ، ابن ابی حاتم اور ابن الانباریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ابلیس اس لیے نام رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر خیر سے مایوس کر دیا (اور) وہ اس سے (بالکل ہی) مایوس ہو گیا۔

ابن اسحاق نے المبتداء میں ابن جریر اور ابن الانباریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ابلیس گناہ کا ارتکاب کرنے سے پہلے فرشتوں میں سے تھا اس کا نام عزازیل تھا وہ زمین کے رہنے والوں میں سے تھا۔ اور فرشتوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھا اور ان سے زیادہ علم رکھنے والا تھا۔ پس اسی بات نے اس کو کبر کی طرف بلایا اور یہ فرشتوں کے ایسے قبیلہ میں سے تھا جس کو جن کہا جاتا تھا۔

ابن جریرؒ نے سدیؒ سے روایت کیا کہ ابلیس کا نام حرث تھا۔

امام وکیع، ابن المنذر، اور بیہقیؒ نے الشعب میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ابلیس جنت کے داروغوں میں سے تھا اور آسمان دنیا کے کام کی تدبیر کرتا تھا۔

امام ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے سعید بن مسیبؒ سے روایت کیا کہ ابلیس آسمان دنیا کے فرشتوں کا سردار تھا۔ (۲)

۱۔ تفسیر الدر منثور

۲۔ تفسیر طبری، الدر منثور

حضرت آدم (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کے احسانات

حضرت آدم (علیہ السلام) کی اس بہت بڑی بزرگی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنا بہت بڑا احسان فرمایا اور خبر دی کہ اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کریں۔ اس کی تصدیق میں بہت سی حدیثیں ہیں ایک حدیث میں ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ میری ملاقات حضرت آدم (علیہ السلام) سے کرا دیجئے جو خود بھی جنت سے نکلے اور ہم سب کو بھی نکالا۔ جب دونوں پیغمبر جمع ہوئے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ تم وہ آدم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی روح تم میں بھی پھونکی اور اپنے فرشتوں سے تمہیں سجدہ کرایا (آخر تک) پوری حدیث عنقریب بیان ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔ ابن عباس فرماتے ہیں ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلہ میں سے تھا جنہیں جن کہتے تھے جو آگ کے شعلوں سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کا نام حارث تھا اور جنت کا خازن تھا۔ اس قبیلے کے سوا اور فرشتے سب کے سب نوری تھے۔ قرآن نے بھی ان جنوں کی پیدائش کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے آیت (وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ) 55۔ الرحمن:15) آگ کے شعلے کی جو تیزی سے بلند ہوتے ہیں اسے مارج کہتے ہیں جس سے جن پیدا کئے گئے تھے اور انسان مٹی سے پیدا کیا گیا۔ زمین میں پہلے جن بستے تھے۔ انہوں نے فساد اور خون ریزی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فرشتوں کا لشکر دے کر بھیجا انہی کو ”جن“ کہا جاتا تھا۔ ابلیس نے لڑ بھڑ کر مارتے اور قتل کرتے ہوئے انہیں سمندر کے جزیروں اور پہاڑوں کے دامنوں میں پہنچا دیا اور ابلیس کے دل میں یہ تکبر سما گیا کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہ ہو سکا۔ چونکہ دل کی اس بدی اور اس پوشیدہ خودی کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تھا۔ جب پروردگار نے فرمایا کہ زمین میں خلیفہ پیدا کرنا چاہتا

ہوں تو ان فرشتوں نے عرض کیا کہ ایسے کو کیوں پیدا کرتا ہے جو اگلی قوم کی طرح فساد و خونریزی کریں تو انہیں جواب دیا گیا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی ابلیس کے دل میں جو کبر و غرور ہے اس کا مجھی کو علم ہے تمہیں خبر نہیں پھر آدم (علیہ السلام) کی مٹی اٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا تو وہ بجتی مٹی ہوتی جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں اور اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑ دوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑ دوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی گئی خون گوشت بنتا گیا۔ جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور فوراً اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچتی تھی اس لیے اٹھ نہ سکے اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے آیت (وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا) 17۔الاسرآء:11) یعنی انسان بے صبرا اور جلد باز ہے نہ تو خوشی نہ رنج میں۔ جب روح جسم میں پہنچی اور چھینک آئی تو کہا آیت (الحمدللہ رب العلمین) اللہ تعالیٰ نے جواب دیا دعا (یرحمک اللہ) پھر صرف ابلیس کے ساتھی فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس کا وہ غرور و تکبر ظاہر ہو گیا اس نے نہ مانا اور سجدے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں اس سے بڑی عمر والا ہوں۔ اور اس سے قوی اور مضبوط ہوں۔ یہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں اور آگ مٹی سے قوی ہے۔ اس کے انکار پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت

سے ناامید کردیا اور اسی لیے اسے ابلیس کہا جاتا ہے۔ اس کی نافرمانی کی سزا میں اسے راندہ درگاہ شیطان بنادیا پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کو انسان جانور زمین سمندر پہاڑ وغیرہ کے نام بتا کر ان کو ان فرشتوں کے سامنے پیش کیا جو ابلیس کے ساتھی تھے اور آگ سے پیدا شدہ تھے اور ان سے فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ میں زمین میں اسے خلیفہ نہ بناؤں تو ذرا مجھے ان چیزوں کے نام تو بتادو۔ جب ان فرشتوں نے دیکھا کہ ہماری اگلی بات سے الہ العالمین ناراض ہے تو وہ کہنے لگے کہ اللہ عزوجل تو اس بات سے پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی اور غیب کو جانے ہماری توبہ ہے اور اقرار ہے کہ ہم غیب داں نہیں۔ ہم تو صرف وہی جان سکتے ہیں جس کا علم تو ہمیں دے دے۔ جیسے تو نے ان کے نام صرف حضرت آدم (علیہ السلام) کو ہی سکھائے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے فرمایا کہ تم انہیں ان تمام چیزوں کے نام بتادو چنانچہ انہوں نے بتادیئے تو فرمایا اے فرشتو! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے غیب کا جاننے والا صرف میں اکیلا ہی ہوں اور کوئی نہیں۔ میں ہر پوشیدہ چیز کو بھی ویسا ہی جانتا ہوں جیسے ظاہر کو اور تم سب اس سے بے خبر ہو ایک اور حدیث میں بھی اسی طرح مروی ہے جس کے متن میں کچھ کمی زیادتی بھی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ زمین کی مٹی لینے کے لیے جب حضرت جبرائیل گئے تو زمین نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ میں سے کچھ گھٹائے وہ واپس چلے گئے پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے ان سے بھی یہی کہا لیکن انہوں نے جواب دیا کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اللہ کا حکم پورا کئے بغیر واپس چلا جاؤں چنانچہ انہوں نے تمام روئے زمین سے ایک ایک مٹھی مٹی لی۔ چونکہ مٹی کا رنگ کہیں سرخ تھا کہیں سفید کہیں سیاہ اسی

وجہ سے انسانوں کی رنگتیں بھی طرح طرح کی ہوئیں۔ واللہ اعلم۔ [۱]

تعارف ابلیس

ابن عباسؓ کہتے ہیں نافرمانی سے پہلے وہ فرشتوں میں تھا۔ عزازیل اس کا نام تھا زمین پر اس کی رہائش تھی اجتہاد اور علم میں بہت بڑا تھا اور اسی وجہ سے دماغ میں رعونت تھی اور اس کی جماعت کا اور اس کا تعلق جنوں سے تھا۔ اس کے چار پر تھے۔ جنت کا خازن تھا زمین اور آسمان دونوں کا سلطان تھا۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں۔ ابلیس کبھی فرشتہ نہ تھا اس کی اصل جنات سے ہے جیسے کہ آدم کی اصل انس سے ہے اس کی اسناد صحیح ہے۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلمؒ اور شہر بن حوشبؒ کا بھی یہی قول ہے۔ سعد بن مسعودؒ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے جنات کو جب مارا تب اسے قید کیا تھا اور آسمان پر لے گئے تھے وہاں کی عبادت کی وجہ سے رہ پڑا۔ ابلیس کی ابتداء آفرینش ہی کفر و ضلالت پر تھی کچھ دن ٹھیک ٹھاک رہا لیکن پھر اپنی اصلیت پر آ گیا۔ سجدہ کرنے کا حکم بجالانا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور آدم (علیہ السلام) کا اکرام تھا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ سجدہ سلام اور عزت و اکرام کا تھا جیسے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں فرمان ہے۔ کہ انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھا لیا اور سب کے سب سجدہ میں گر پڑے اور حضرت یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا ابا یہی میرے اس خواب کی تعبیر ہے جسے میرے رب نے سچا کر دکھایا۔ اگلی امتوں میں سجدہ تعظیم جائز تھا لیکن ہمارے دین میں یہ منسوخ ہو گیا۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں نے شامیوں کو اپنے سرداروں اور علماء کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گزارش کی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ اس کے زیادہ

۱۔ تفسیر ابن کثیر

حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں کسی انسان کو کسی انسان کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دینے والا ہوتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں کیونکہ ان کا ان پر بہت بڑا حق ہے۔ امام رازی نے اسی کو ترجیح دی ہے بعض کہتے ہیں کہ سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تھا۔ یہ سجدہ حضرت آدم کے اکرام بڑائی احترام اور سلام کے طور پر تھا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ماتحت تھا کیونکہ اس کا حکم تھا جس کی بجا آوری ضروری تھی۔ امام رازی نے بھی اسی قول کو قوی قرار دیا ہے حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں سب سے پہلا گناہ یہی تکبر ہے جو ابلیس سے سرزد ہوا۔ صحیح حدیث میں ہے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اسی تکبر کفر و عناد کی وجہ سے ابلیس کے گلے میں طوق لعنت پڑا اور رحمت سے مایوس ہو کر جناب باری سے دھتکارا گیا۔ واللہ اعلم۔ [۱]

﴿ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ ﴾

اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی مت جانا ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر

امام ابن ابی شیبہ اور طبرانیؒ نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! انبیاء میں سے پہلے کون تھا؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آدم (علیہ السلام)۔ میں نے عرض کیا کیا وہ نبی تھے؟ آپ آپ نے فرمایا ہاں جو (اللہ تعالیٰ سے براہ راست) کلام کئے گئے تھے۔ میں نے عرض کیا پھر کون (نبی تھے)؟ آپ نے فرمایا نوح (علیہ السلام) اور ان دونوں کے درمیان دس آباء تھے۔

امام احمدؒ، بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں، البزار اور بیہقیؒ نے الشعب میں حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! سب سے پہلے نبی کون تھے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حضرت آدم (علیہ السلام) تھے میں نے پوچھا کیا وہ نبی تھے؟ فرمایا ہاں! وہ نبی تھے۔ جو (براہ راست) کلام کئے گئے تھے۔ میں نے (پھر) عرض کیا یارسول اللہ کتنے رسول تھے آپ نے فرمایا تین سو پندرہ بہت بڑی جماعت تھی۔

امام عبد بن حمید اور الآجریؒ نے الاربعین میں حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! رسولوں میں پہلے کون تھے؟ آپ نے فرمایا آدم (علیہ السلام) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا وہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) بھیجے ہوئے نبی تھے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور اپنی روح میں سے اس میں پھونکا اور ان کو (اپنے) سامنے ٹھیک بنا دیا۔ [1]

امام ابن ابی حاتم، ابن حبانؒ، طبرانی، حاکم اور بیہقیؒ نے الاسماء والصفات میں ابوامامہ باہلیؓ سے روایت کیا کہ ایک آدمی نے کہا یارسول اللہ! کیا آدم (علیہ السلام) نبی تھے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ وہ (اللہ

۱۔ تفسیر الدر منثور

تعالیٰ سے براہ راست) کلام کئے گئے تھے۔ پوچھا ان کے اور نوح (علیہ السلام) کے درمیان کتنی مدت تھی؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دس صدیاں (پھر) اس نے کہا نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کے درمیان کتنی مدت تھی ؟ آپ نے فرمایا دس صدیاں پھر اس نے پوچھا یا رسول اللہ ! کتنے انبیاء تھے؟ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار (پھر) اس نے پوچھا یا رسول اللہ! ان میں رسول کتنے تھے؟ آپ نے فرمایا تین سو پندرہ بہت بڑی جماعت تھی۔

امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم اور بیہقیؒ نے الاسماء میں والصفات میں اور ابن عساکرؒ نے سدی سے، ابی مالک اور ابی صالحؒ سے انہوں نے ابن عباسؓ ، ابن مسعودؓ اور دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کیا کہ جب آدم (علیہ السلام) نے جنت میں سکونت اختیار کی، تو وحشت محسوس کی۔ ان کی کوئی بیوی نہیں تھی کہ اس کی طرف سکونت حاصل کرتے۔ جب ایک رات سو کر اٹھے تو اچانک ان کے سر کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے پیدا فرمایا تھا۔ اس سے پوچھا تو کون ہے؟ کہنے لگی عورت ہوں کہنے لگے تجھے کیوں پیدا کیا گیا؟ کہنے لگی تاکہ میری طرف سکونت حاصل کرے۔ فرشتوں نے کہا اے آدم اس عورت کا نام کیا ہے؟ فرمایا حوا کہنے لگے اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا فرمایا اس لیے کہ یہ زندہ (آدمی) سے پیدا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لفظ آیت " یادم اسکن انت وزوجک الجنۃ" (تو اور تیری بیوی جنت میں ٹھہرو)۔

امام بخاری اور مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا عورتوں کے متعلق مجھ سے خیر کی وصیت قبول کرو بلاشبہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی اور پسلی کا ٹیڑھا حصہ اس کا سر ہے اور تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔ اور اگر اس کو

چھوڑ دو گے تو اس کو اس حال میں چھوڑ و کہ اس میں ٹیڑھا پن ہوگا۔ پس تم مجھ سے عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو۔

حضرت ابوالشیخ اور ابن عساکرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ان کا نام مرأۃ (یعنی عورت) اس لیے رکھا گیا کیونکہ وہ المرء (یعنی مرد) سے پیدا کی گئی۔ اور ان کا نام حوا اس لیے رکھا گیا کیونکہ وہ ہر زندہ انسان کی ماں ہے۔

محمد بن اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب وغیرہ کے علماء سے بروایت ابن عباسؓ مروی ہے کہ ابلیس کے مردود قرار دینے کے بعد حضرت آدم (علیہ السلام) کے علم کو ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ کی فوقیت طاری کردی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدمؑ نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے ان میں انس و محبت ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم (علیہ السلام) کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرت آدم (علیہ السلام) کو جنت میں جگہ دی گئی۔ لیکن تن تنہا تھے اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگے، انہیں دیکھا تو پوچھا تم کون ہو اور کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرت حوا نے فرمایا میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کا سبب بننے کے لیے پیدا کی گئی ہو تو فوراً فرشتوں نے پوچھا فرمایئے ان کا نام کیا ہے؟ حضرت آدم نے کہا ”حوا“ انہوں نے کہا اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ فرمایا اس لیے کہ یہ ایک زندہ سے پیدا کی گئی ہیں۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ کی آواز آئی، اے آدم اب تم اور تمہاری بیوی جنت میں با آرام و

اطمینان رہو اور جو چاہو کھاؤ۔ لیکن ایک خاص درخت سے روکنا دراصل امتحان تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ انگور کی بیل تھی۔ کوئی کہتا ہے۔ گیہوں کا درخت تھا۔ کسی نے سنبلہ کہا ہے۔ کسی نے کھجور، کسی نے انجیر کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے اس درخت کے کھانے سے انسانی حاجت ہوتی تھی جو جنت کے لائق نہیں۔ کسی نے کہا ہے، اس درخت کا پھل کھا کر فرشتے ہمیشہ کی زندگی پا گئے ہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کوئی ایک درخت تھا جس سے اللہ نے روک دیا۔ نہ قرآن سے اس کا تعین ثابت ہوتا ہے نہ کسی صحیح حدیث سے۔ مفسرین میں اختلاف ہے اور اس کے معلوم ہونے سے کوئی اہم فائدہ اور نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان نہیں۔ لہٰذا اس کی جستجو کی کیا ضرورت؟ اللہ ہی کو اس کا بہتر علم ہے۔ امام رازیؒ وغیرہ نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے اور ٹھیک بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ [1]

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾﴾

پھر شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلا دیا، پس انھیں اس سے نکال دیا جس میں وہ دونوں تھے اور ہم نے کہا تم اتر جاؤ تمہارے بعض بعض کے دشمن ہیں اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر

بعض علماء نے فرمایا: یہ قول عبدالرزاقؒ نے حضرت وہب بن منبہؒ سے روایت کیا ہے۔ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا تھا۔ یہ سانپ چار ٹانگوں والا تھا جیسے بختی اونٹ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو پیدا کیا تھا ان میں سانپ خوبصورت ترین جانور تھا، شیطان نے پہلے اپنے آپ کو تمام حیوانوں پر پیش کیا تھا کہ وہ اسے منہ میں لے کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ سوائے سانپ کے کسی نے اسے داخل نہ کیا جب سانپ اسے جنت میں لے گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکلا اس نے اس درخت کو لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع کیا تھا۔ ابلیس وہ لے کر حضرت حواء کے پاس آیا اور کہا: اس درخت کو دیکھو اس کی خوشبو کتنی عمدہ ہے، اس کا ذائقہ کتنا عمدہ ہے، اس کا رنگ کتنا پیارا ہے، وہ انہیں اغوا کرتا رہا حتیٰ کہ حضرت حوا نے وہ درخت لے لیا اور کھالیا۔ پھر ابلیس نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو اغوا کیا۔ حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا: کھالو، میں نے کھایا ہے تو مجھے اس نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ پس حضرت آدم (علیہ السلام) نے بھی اسے کھالیا۔ ان دونوں کے لباس اتر گئے، اور گناہ کے حکم میں ہو گئے۔ حضرت آدم اس درخت کے پیٹ میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آواز دی: تو کہاں ہے؟ حضرت آدم (علیہ السلام) نے عرض کی: میں یہاں ہوں اے رب! اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا تو باہر نہیں نکلے گا؟ حضرت آدم نے کہا: یا رب! مجھے تجھ سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس زمین کی طرف اتر جا جس سے تیری تخلیق کی گئی ہے۔ سانپ پر لعنت کی گئی اور اس کی ٹانگیں اس کے پیٹ میں لوٹا دی گئیں اور اس کی اولاد آدم کے درمیان عداوت و دشمنی بن گئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت حوا سے کہا گیا جس طرح تو نے اس درخت کا خون بہایا اسی طرح تجھے بھی ہر مہینے خون کی تکلیف لاحق ہوگی تو حمل اٹھائے گی اور بچہ جنم دے گی تکلیف

کے ساتھ تو اس کی وجہ سے کئی مرتبہ موت کے قریب ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔ (۱)

حضرت ابن عمرؓ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے، فرمایا: پانچ چیزوں کو محرم قتل کرسکتا ہے۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ بھی ہے۔ روایت ہے کہ ابلیس نے سانپ سے کہا: مجھے تو جنت میں لے جا تو میرے ذمہ ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے: ابلیس کے ذمہ کو توڑو۔ ساکنہ بنت جعد نے سراء بنت نبہان غنویہؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے سنا ہے: چھوٹے، بڑے، کالے اور سفید سانپوں کو قتل کرو۔ جو ان کو قتل کرے گا اس کے لیے یہ آگ سے فدیہ ہوں گے اور جس کو سانپ قتل کر دے گا وہ شہید ہوگا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: آگ سے فدیہ اس لیے ہوگا کیونکہ یہ ابلیس کے ساتھ شریک تھا اور حضرت آدم (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچانے میں اس کا معاون تھا۔ اسی وجہ سے جس کسی نے سانپ کو قتل کیا گویا اس نے کافر کو قتل کیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کافر اور اس کا قاتل کبھی دوزخ میں جمع نہ ہوں گے۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

علامہ ابوجعفر طبریؒ لکھتے ہیں: حضرت آدم (علیہ السلام) کے آسمانوں اور جنت میں ٹھہرنے کی مدت دنیاوی سالوں کے اعتبار سے تینتالیس سال ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ مدت پانچ سو سال ہے' حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو ہند میں اور حضرت حواء کو جدہ میں اتارا گیا' حضرت آدم (علیہ السلام) ان کی طلب میں گئے اور میدان عرفات میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور حواء جنت کی نعمتوں

۱۔ تفسیر قرطبی

کے چلے جانے پر دو سو سال تک روتے رہے، چالیس دن تک کھانا کھایا نہ پانی پیا اور حضرت آدم (علیہ السلام) ایک سو سال تک حضرت حواء سے مقارب نہیں ہوئے۔ زمین پر آنے کے بعد اولاد آدم اور ابلیس اور اولاد آدم اور سانپ میں اس وقت سے دشمنی چلی آرہی ہے۔ [۱]

سفر ارضی کا آغاز

ابن ابی حاتمؒ کی ایک حدیث میں ہے کہ درخت کا پھل چکھتے ہی جنتی لباس اتر گیا۔ اپنے تئیں ننگا دیکھ کر ادھر ادھر دوڑنے لگے لیکن چونکہ قد طویل تھا اور سر کے بال لمبے تھے، وہ ایک درخت میں اٹک گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم کیا مجھ سے بھاگتے ہو؟ عرض کیا نہیں الٰہی میں تو شرمندگی سے منہ چھپائے پھرتا ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت آدم نماز عصر کے بعد سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کی ایک ساعت ہی جنت میں رہے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں یہ ایک ساعت ایک سو تیس سال کی تھی۔ ربیع بن انسؒ فرماتے ہیں نویں یا دسویں ساعت میں حضرت آدمؑ کا اخراج ہوا۔ ان کے ساتھ جنت کی ایک شاخ تھی اور جنت کے درخت کا ایک تاج سر پر تھا۔ سدیؒ کا قول ہے کہ حضرت آدمؑ ہند میں اترے، آپ کے ساتھ حجر اسود تھا اور جنتی درخت کے پتے جو ہند میں پھیلا دیئے اور اس سے خوشبودار درخت پیدا ہوئے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہند کے شہر ''دھنا'' میں اترے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان اترے تھے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں حضرت آدمؑ ہند میں اور مائی حواہ جدہ میں اتریں اور ابلیس بصرہ سے چند میل کے فاصلہ پر دست میساں میں پھینکا گیا اور سانپ اصفہان میں۔ ابن عمرؓ کا قول ہے کہ حضرت آدمؑ صفا پر اور حضرت حوا مروہ پر اترے۔ اترتے

۱۔ (جامع البیان ج۱ ص ۸۰۔۸۱، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱٤۰۹ھ)

وقت دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے اور سر جھکا ہوا تھا اور ابلیس انگلیوں میں انگلیاں ڈالے آسمان کی طرف نظریں جمائے اترا۔ حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام صفتیں سکھا دیں اور پھلوں کا توشہ دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ تمام دنوں میں بہتر دن جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم پیدا کئے گئے، اسی میں جنت میں داخل کئے گئے۔ اور اسی دن نکالے گئے ملاحظہ ہو صحیح مسلم اور نسائی۔ امام رازی فرماتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی وجوہات مضمر ہیں۔ اول تو یہ سوچنا چاہیے کہ ذرا سی لغزش پر حضرت آدم (علیہ السلام) کو کس قدر سزا ہوئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ تم گناہوں پر گناہ کئے جاتے ہو اور جنت کے طالب ہو کیا تم بھول گئے کہ تمہارے باپ آدم (علیہ السلام) کو محض ایک ہلکے سے گناہ پر جنت سے نکال دیا گیا۔ ہم تو یہاں دشمن کی قید میں ہیں، دیکھئے! کب صحت وسلامتی کے ساتھ اپنے وطن پہنچیں۔ فتح موصلی کہتے ہیں ہم جنتی تھے، ابلیس کے بہکانے میں آکر دنیا کی قید میں آ پھنسے، اب سوائے غم ورنج کے یہاں کیا رکھا ہے؟ یہ قید و بند اسی وقت ٹوٹے گی جب ہم وہیں پہنچ جائیں جہاں سے نکالے گئے ہیں۔ اگر کوئی معترض اعتراض کرے کہ جب آدم (علیہ السلام) آسمانی جنت میں تھے اور ابلیس راندہء درگاہ ہو چکا تھا تو پھر وہ وہاں کیسے پہنچا؟ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ جنت زمین میں تھی لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے جواب ہیں کہ بطور اکرام کے اس کا داخل ہونا منع تھا نہ کہ بطور اہانت اور چوری کے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا اور یہ بھی جواب ہے کہ وہ جنت میں نہیں گیا تھا بلکہ باہر ہی سے اس نے وسوسہ ان کے دل میں ڈالا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ زمین سے ہی وسوسہ ان کے دل میں ڈالا۔ [۱]

۱۔ تفسیر ابن کثیر

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "ولکم فی الارض مستقرا" سے مراد ہے زمین کے اوپر تم نے ٹھہرنا ہے اور زمین کے نیچے تم کو ٹھہرنا ہے اور لفظ آیت "ومتاع الی حین" سے مراد ہے (اور ایک وقت تک نفع اٹھانا ہے) یہاں تک کہ تم پہنچ جاؤ گے جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔ ۱

﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، تو اس نے اس کی توبہ قبول کر لی، بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معافی نامہ کا متن

جو کلمات حضرت آدمؑ نے سیکھے تھے ان کا بیان خود قرآن میں موجود ہے۔ آیت (قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ) 7۔الاعراف:23) یعنی ان دونوں نے کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو یقیناً ہم نقصان والے ہو جائیں گے۔ اکثر بزرگوں کا یہی قول ہے۔ ابن عباسؓ سے احکام حج سیکھنا بھی مروی ہے۔ عبید بن عمیرؓ کہتے ہیں وہ کلمات یہ تھے کہ انہوں نے کہا الٰہی جو خطا میں نے کی کیا اسے میرے پیدا کرنے سے پہلے میری تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا؟ یا میں نے خود اس کی ایجاد کی؟ جواب ملا کہ

۱۔ تفسیر الدر منثور

ایجاد نہیں بلکہ پہلے ہی لکھ دیا گیا اسے سن کر آپ نے کہا پھر اے اللہ مجھے بخشش اور معافی مل جائے۔ ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضرت آدم نے کہا الٰہی کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ اور مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی؟ میرے چھینکنے پر یرحمک اللہ نہیں کہا؟ کیا تیری رحمت غضب پر سبقت نہیں کر گئی؟ کیا میری پیدائش سے پہلے یہ خطا میری تقدیر میں نہیں لکھی تھی؟ جواب ملا کہ ہاں۔ یہ سب میں نے کیا ہے تو کہا پھر یا اللہ میری توبہ قبول کر کے مجھے پھر جنت مل سکتی ہے یا نہیں؟ جواب ملا کہ ہاں۔ یہ کلمات یعنی چند باتیں تھیں جو آپ نے اللہ سے سیکھ لیں۔ ابن ابی حاتمؒ ایک ایک مرفوع روایت میں ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا الٰہی اگر میں توبہ کروں اور رجوع کروں تو کیا جنت میں پھر بھی جا سکتا ہوں؟ جواب ملا کہ ہاں۔ اللہ سے کلمات کی تلقین حاصل کرنے کے یہی معنی ہیں۔ [1]

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ ﴾

ہم نے کہا! تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس آئے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہونگے۔

پھر ہم نے حضرت آدم (علیہ السلام) حوا علیہا السلام، ابلیس اور سانپ سے کہا کہ آسمان سے اترو، اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ جب وقت اور جب

۱۔ تفسیر ابن کثیر

بھی تمہارے پاس میری طرف سے کتاب اور رسول آئے تو جو شخص کتاب رسول کی اتباع کرے گا تو اسے پیش آنے والے عذاب کا خوف اور جو انھوں نے کام کیے ہیں ان پر غم نہیں ہوگا اور یہ بھی تفسیر ہے کہ انھیں ہمیشہ خوف اور غم نہیں ہوگا، یہ بھی کہا گیا جس وقت موت کو ذبح کیا جائے گا اس وقت انہیں خوف اور جب دوزخ کو بھرا جائے گا تب انھیں غم نہ ہوگا اور جن لوگوں نے کتاب اور رسول کو جھٹلا یا وہ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کو وہاں موت آئے گی اور نہ ہی وہ دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ (۱)

حضرت آدم وحواء (علیہما السلام) زمین کے کسی خطہ میں اتارے گئے؟ اس بارے میں روایتیں مختلف ہیں زیادہ تر روایتیں ارض ہند کے بارے میں ہیں ابن ابی حاتمؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ آدم (علیہ السلام) کوہ صفا اور حواء کو مروہ پر اتارا گیا، اور ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتم اور حاکمؒ سے مروی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے ابن عباسؓ نے کہا ہے حضرت آدم کا ہبوط اولی ارض ہند میں ہوا۔ (۲)

اور ایک روایت میں جو کہ ابن ابی حاتم سے منقول ہے کہا گیا ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان آپ کا نزول ہوا اور ابن جریرؒ اور حاکمؒ کی ایک روایت جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضرت آدم کا ہبوط ارض ہند میں ہوا۔ اور ابن ابی سعدؒ اور ابن عساکرؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ارض ہند میں اور حواء جدہ میں اترے، حضرت آدم حواء کی تلاش میں جدہ آئے اور خازن میں ہے کہ آدم سرزمین ہند سرندیپ میں اور حضرت حواء جدہ میں اترے اور

۱۔ تفسیر ابن عباس

۲۔ (فتح القدیر شوکانی)

ابلیس بصرہ میں ایلہ کے مقام پر اترا۔ [۱]

مذکورہ روایات کے علاوہ اور بھی روایات ہیں، جو آپس میں مختلف ہیں مگر ان میں تطبیق ممکن ہے ظاہر ہے کہ ہبوط حقیقی تو ایک ہی جگہ ہوا ہو مگر انتقال مکانی کو مجازاً ہبوط سے تعبیر کر دیا گیا ہو۔

جنت کے حصول کی شرائط

جنت سے نکالتے ہوئے جو ہدایت حضرت آدمؑ حضرت حواؑ اور ابلیس کو دی گئی اس کا بیان یہاں ہو رہا ہے کہ ہماری طرف سے کتابیں انبیاء اور رسول بھیجے جائیں گے، معجزات ظاہر کئے جائیں گے، دلائل بیان فرمائے جائیں گے، راہ حقوق واضح کر دی جائے گی، آنحضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی آئیں گے، آپ پر قرآن کریم بھی نازل فرمایا جائے گا، جو بھی اپنے زمانے کی کتاب اور نبی کی تابعداری کرے گا اسے آخرت کے میدان میں کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی دنیا کے کھو جانے پر کوئی غم ہوگا۔ [۲]

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹ ﴾ ع

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور میری آیتوں کو جھٹلایا، وہی لوگ جہنم والے ہونگے، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

سورہ طٰہٰ میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ میری ہدایت کی پیروی کرنے والے نہ گمراہ ہونگے، نہ بدبخت و

۱۔ تفسیر خازن، تفسیر جلالین
۲۔ تفسیر ابن کثیر

بے نصیب۔ مگر میری یاد سے منہ موڑنے والے دنیا کی تنگی اور آخرت کے اندھا پن کے عذاب میں گرفتار ہونگے۔ یہاں بھی فرمایا کہ انکار اور تکذب کرنے والے ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ابن جریرؒ کی حدیث میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جو اصلی جہنمی ہیں انہیں تو جہنم میں نہ موت آئے گی، نہ ہی خوشگوار زندگی ملے گی، ہاں جن موحد، متبع، سنت لوگوں کو ان کی بعض خطاؤں پر جہنم میں ڈالا جائے گا یہ جل کر کوئلے ہو ہو کر مرجائیں گے اور پھر شفاعت کی وجہ سے نکال لیے جائیں گے۔ صحیح مسلم شریف میں بھی یہ ہے کہ بعض تو کہتے ہیں دوسری دفعہ جنت سے نکل جانے کے حکم کو ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہاں دوسرے احکام بیان کرنا تھے اور بعض کہتے ہیں پہلی مرتبہ جنت سے آسمان اول اتار دیا گیا تھا دوبارہ آسمان اول سے زمین کی طرف اتارا گیا لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے واللہ اعلم۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوجائیں گے تو موت کو (اس حالت میں) لایا جائے گا (گویا کہ وہ ایک چتکبرا مینڈھا ہے) اسے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کر دیا جائے گا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر ایک منادی ندا دے گا، اے اہل جنت! اب موت نہیں آئے گی اور اے اہل دوزخ! اب موت نہیں آئے گی (ہر شخص ہمیشہ ہمیش اس حالت میں رہے گا جس میں وہ اب ہے، یہ سن کر) جنتیوں کی خوشی میں اور دوزخیوں کے غم میں اضافہ ہوجائے گا۔“ [2]

آخری آیت وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی

۱۔ تفسیر ابن کثیر

۲۔ [بخاری، کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنۃ والنار: ٦٥٤٨۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمها، باب النار یدخلها الجبارون والجنۃ یدخلها الضعفاء: ۲۸۵۰
]

نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہوگا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کردیں یعنی کفار اور مومنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عملاً کیسے بھی گناہ گار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لیے جائیں گے، واللہ اعلم۔ (۱)

﴿ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ ﴾

اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور پورا کرو میرے عہد کو میں پورا کروں گا اپنے عہد کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

ربط آیات:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توحید، رسالت اور حشر ونشر پر دلائل قائم فرمائے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی عام نعمتوں کو ذکر فرمایا جن سے ہر انسان مستفید ہوا اور ان نعمتوں کا وجود اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا کوئی موجد ہے جو حکیم اور حمید ہے اور وحدہ لاشریک ہے، ان نعمتوں کا سابقہ آسمانی کتابوں میں ذکر تھا، پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کے ذکر کو نازل فرمایا اور سب کو معلوم تھا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کتابوں کو نہیں پڑھا، اور نہ کسی عالم کی صحبت اختیار کی اور پھر آپ نے وہ مضامین اور گزشتہ امتوں کی خبریں اور واقعات بیان کیے جو آسمان کتابوں

۱۔ تفسیر معارف القرآن مولانا شفیع صاحبؒ

میں موجود ہیں اور غیب کی خبریں دیں اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ آپ کا خود ساختہ کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے جو اس نے آپ کے قلب پر نازل فرمایا ہے، نیز اس بیان میں حشر ونشر پر بھی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اور آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور جب وہ ان سب کو ابتداء پیدا کرنے پر قادر ہے تو فنا کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے اہل علم اور اہل کتاب کو خطاب کیا اور ان سے فرمایا کہ وہ ان نعمتوں کو یاد کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کریں اور دلائل کے مطابق حق کی پیروی کریں اور ان کو چاہیے کہ وہ سیدنا حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید پر سب سے پہلے ایمان لائیں اور ان کے احکام پر عمل کریں اور آخرت کو نہ بھولیں۔

اسرائیل حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (علیہ السلام) کا نام ہے۔ بنی اسرائیل اور یہود حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد کو کہتے ہیں۔ اسرائیل کے معنی عبداللہ۔ یعنی اللہ کا بندہ ہے یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے بنی اسرائیل اے اسرائیل کے بیٹو، یا اے اسرائیل کی اولاد۔ اسرائیل حضرت یعقوب (علیہ السلام) کا لقب ہے۔ ان آیتوں میں ان یہود کا ذکر ہے جو مدینہ کے اطراف میں رہتے تھے جن سے مدینہ کے منافق لوگ سازش رکھتے تھے۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بھی تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کی قید سے چھڑایا اور ملک شام میں ان کو آباد کیا۔ یہی ملک حضرت یعقوبؑ کا وطن ہے جب حضرت یوسفؑ مصر کو گئے تھے تو ان کے سبب سے اور اولاد یعقوب کا بھی مصر کو جانا ہوا تھا پھر حضرت یوسفؑ کی وفات کے بعد یہ لوگ فرعون کی قید میں پھنس گئے۔ فرعون ان سے قیدیوں کی طرح ذلیل کام لیتا تھا۔ اور نہایت ذلت سے ان کو رکھتا۔ آخر حضرت موسیٰؑ کے عہد نبوت میں فرعون اور

اس کا لشکر سب غرق ہو کر مر گئے اور بنی اسرائیل کو اس بلا سے نجات ہوئی۔ پھر حضرت موسیٰ پر تورات نازل ہوئی جس میں نبی آخر الزمان کی نشانیاں تھیں اور نبی آخر الزمان کی اطاعت کا عہد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کو مخاطب ٹھہرا کر اپنی نعمتوں کے یاد دلانے کے بعد اسی عہد کا ذکر ان آیتوں میں کیا ہے۔ [۱]

عام نعمتوں کے علاوہ جو نعمتوں بالخصوص اولاد اسرائیل کو عطا فرمائیں وہ یہ ہیں کہ ان کو آل فرعون سے نجات دی' ان میں سے انبیاء بنائے' ان پر من وسلویٰ نازل کیا' ایک پتھر سے ان کے لیے بارہ چشمے رواں کر دیئے اور ان کو تورات کا امین بنایا جس میں سیدنا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات کا بیان ہے اور آپ کی نبوت اور رسالت کا ذکر ہے' ہر چند کہ یہ نعمتیں اس زمانہ کے یہود کے آباء واجداد کو عطا کی گئی تھیں لیکن آباء واجداد کو دی گئی نعمتیں انکی اولاد کے حق میں بھی نعمتیں ہوتی ہیں کیونکہ ان نعمتوں سے ان کو عظمت اور فضیلت حاصل ہوتی ہے اور خصوصاً یہ نعمتیں ان کی بقاء کا سبب ہیں، اگر فرعون بنواسرائیل کی نسل کشی جاری رکھتا یا فرعون کے ساتھ بنواسرائیل کو بھی سمندر میں غرق کر دیا جاتا تو آج دنیا میں یہودیوں کا وجود نہ ہوتا اور وہ کب کے صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں اس لیے یاد دلائی ہیں کہ وہ غور وفکر کریں اور جب کوئی شخص کسی کی بہ کثرت نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو اس کو اس کی مخالفت سے حیا آتی ہے' سو یہودیوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت سے باز آنا چاہیے' اور تورات میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جن صفات کا ذکر ہے ان کو چھپانا نہیں چاہیے اور تورات کی وساطت سے یہودیوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا تھا اس کو پورا کرنا چاہیے اور وہ عہد یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے' اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں ایک حکم

۱۔ تفسیر احسن التفاسیر

یہ بھی تھا کہ وہ حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ان سے کیا ہوا عہد پورا کرے گا' اور ان کو جنت میں داخل کر دے گا۔ (۱)

بنو اسرائیل اور اللہ تعالیٰ کے مابین عہد کا بیان:

اور یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم اور اس کا فضل ہے کہ اس نے برابر کا معاملہ کرنے کا فرمایا کہ تم مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو میں تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں گا' ورنہ کہاں بندہ کہاں خدا' بندہ اس کا حکم بجالائے تو اس کا کام ہی بندگی کرنا ہے اور اس اطاعت پر جو اس نے جنت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا وہ محض اس کا کرم اور فضل ہے کسی کا اس پر کوئی استحقاق نہیں ہے۔

یہودیوں کا اللہ سے عہد اور اللہ کا ان سے عہد یہ ہے کہ وہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرنے کا عہد پورا کریں تو اللہ تعالیٰ ان سے سخت اور مشکل احکام کا بوجھ اتارنے کا عہد پورا کرے گا اور ان کو جنت میں داخل کرے گا اور عام لوگوں سے عہد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائیں تو دنیا میں ان کی جان اور مال محفوظ رہے گا اور آخرت میں وہ دائمی عذاب سے محفوظ رہیں گے' اور جو فرائض اور واجبات کو ادا کریں گے اور کبیرہ گناہوں سے اجتناب کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت سے نوازے گا اور جو صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں گے اور جنت میں چلے جائیں گے اور اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ اس عہد کے معاملہ میں خاص مجھ ہی سے ڈرنا کیونکہ عہد شکنی کی صورت میں اللہ کے قہر اور غضب کا سامنا ہو گا۔ (۲)

۱۔ تفسیر تبیان القرآن
۲۔ تفسیر تبیان القرآن

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ ﴾

اوراس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر نہ فروخت کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

امام ابن جریرؒ نے ابوالعالیہؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "وامنوا بما انزلت" سے قرآن مراد ہے (یعنی جو میں نے قرآن نازل کیا اس پر ایمان لاؤ) اور "مصدقا لما معکم" سے مراد تورات اور انجیل ہیں (کہ اس کی تصدیق تمہاری کتابیں بھی کررہی ہیں)۔

امام ابن جریرؒ نے ابن جریج ؒ سے روایت کیا کہ لفظ آیت "ولا تکونوا اول کافر بہ" میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے (کہ اس کا انکار نہ کرو)۔

امام ابن جریرؒ نے ابوالعالیہؒ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا کہ اس سے مراد ہے اہل کتاب کا گروہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتاری گئی (اور یہ کتاب) اس (کتاب) کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے اس لیے کہ تم اس کو تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو جو تمہارے پاس ہے لفظ آیت "ولا تکونوا اول کافر بہ" یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سب سے

پہلے انکار کرنے والے مت ہو۔ لفظ آیت " ولا تشتروا بایتی ثمنا قلیلا " یعنی (آیات پر) اجرت مت لو فرمایا اور یہ بات ان کے پاس پہلی کتاب میں لکھی ہوئی ہے کہ آدم کے بیٹے تم (دین کا) علم مفت سکھاؤ جیسے تم کو مفت لکھایا گیا ہے۔ [۱]

شان نزول:

یہود کے عالموں اور رئیسوں کو جاہلوں اور عام آدمیوں سے بہت آمدنی ہوتی تھی، انہوں نے ان بیچاروں سے سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا اور وہ ان کے ہر قسم کے مال میں سے جس میں کھیت، مویشی اور نقد سب چیزیں شامل تھیں، حصہ لیتے، جب اسلام کی روشنی پھیلنے لگی تو ان کو یہ خیال ہوا کہ اگر ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعریف وتوصیف اور ان کی اتباع کی تو ہماری یہ ساری آمدنی ہاتھ سے چلی جائے گی، اس لیے انہوں نے دنیا کو دین پر ترجیح دی اور دین کو چھوڑ دیا اور تورات میں تحریف کر کے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم مبارک کو محو کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [۲]

بنی اسرائیل کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ قرآن کریم وہی دعوت لے کر آیا ہے جو تورات اور انجیل کی دعوت تھی اور جن آسمانی کتابوں پر وہ ایمان رکھتے ہیں قرآن کریم انہیں جھٹلانے کے بجائے دو طرح سے ان کی تصدیق کرتا ہے ایک اس لحاظ سے کہ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ کتابیں اللہ ہی کی نازل کی ہوئی تھیں (یہ اور بات ہے کہ بعد کے لوگوں نے ان میں کافی رد و بدل کر ڈالا جس کی حقیقت قرآن نے واضح فرمائی) اور دوسرے قرآن اس حیثیت سے ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کتابوں میں آخری نبی کی تشریف

۱۔ تفسیر الدر منثور

۲۔ (تفسیر مظہری ۶۲۔۱)

آوری کی جو پیشینگوئیاں کی گئی تھیں قرآن کریم نے انہیں سچا کر دکھایا اس کا تقاضا یہ تھا کہ بنی اسرائیل عرب کے بت پرستوں سے پہلے اس پر ایمان لاتے؛ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ جس تیز رفتاری سے بت پرست اسلام لا رہے ہیں اس رفتار سے یہودی ایمان نہیں لا رہے ہیں اور اس طرح گویا بنی اسرائیل قرآن کی تکذیب کرنے میں پیش پیش ہیں اس لیے کہا گیا کہ تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ، بعض یہودیوں کا طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ رشوت لے کر تورات کی تشریح عام لوگوں کی خواہشات کے مطابق کر دیا کرتے تھے اور بعض اوقات اس کے احکام کو چھپا لیتے تھے ان کے اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو اور حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ نہ کرو اور نہ حق بات کو چھپاؤ۔ [۱]

تعلیم قرآن مجید پر اجرت لینے کی تحقیق:

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تم کو جو اپنی کتاب اور آیات کا علم دیا ہے تم اس علم کو دنیا کے قلیل مال کے عوض فروخت نہ کرو کیونکہ وہ لوگوں سے تورات میں حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے ذکر کو چھپاتے تھے حالانکہ تورات میں لکھا ہوا تھا کہ وہ نبی امی ہیں جن کا ذکر تورات اور انجیل میں ہے اور وہ اپنے پیروکاروں پر اپنی ریاست اور ان سے نذرانے لینے کے لالچ میں اس کو چھپاتے تھے حالانکہ اس کے عوض میں ان کو ساری دنیا بھی مل جاتی تو وہ قلیل تھی۔ [۲]

اس آیت سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں ہے لیکن واضح رہے

۱۔ آسان ترجمہ قرآن

۲۔ (جامع البیان ج۱ ص۲۰۱۔۲۰۰، مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت ۱۴۰۹ھ)

کہ اس آیت میں اجرت لینے سے منع نہیں کیا بلکہ دنیاوی متاع کے بدلہ میں اللہ کی آیات کو چھپانے سے منع کیا ہے۔

علامہ قرطبی مالکی ؒ لکھتے ہیں: "صحیح بخاری" میں ہے کہ جس چیز پر تمہیں سب سے زیادہ اجرت لینے کا حق ہے وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس حدیث میں قرآن مجید پر اجرت لینے کی صاف تصریح ہے اور اسی پر اعتماد کرنا چاہیے' اور اس آیت کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے مخاطب بنو اسرائیل ہیں اور یہ ہم سے پہلے کی شریعت ہے اور یہ ہم پر حجت نہیں ہے۔ (۱)

جب خصوصیت مورد اور عام الفاظ میں تعارض ہو تو اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے لیکن بعض اوقات قرائن کی وجہ سے خصوصیت مورد کا اعتبار کیا جاتا ہے اور یہاں دلیل کی وجہ سے خصوصیت مورد متعین ہے' علامہ قرطبی ؒ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم سے پہلے کی شریعت ہے۔

ہمارے نزدیک تعلیم قرآن' حج' امامت' اذان اور دیگر عبادات پر اجرت لینا جائز ہے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے: حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جن چیزوں پر تم اجر لیتے ہو ان میں اجر کی سب سے زیادہ حقدار اللہ کی کتاب ہے۔ (۲)

یہ حدیث تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے باب میں نص صریح ہے' بعض علماء نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ اس حدیث میں دم کرنے پر اجرت لینے کا جواز ہے' اس سے تعلیم قرآن پر اجرت لینے جواز لازم نہیں آتا' لیکن یہ تاویل اس لیے صحیح ہے کہ اس حدیث میں الفاظ عام ہیں اور خصوصیت مورد کے مقابلہ میں عموم الفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے' اور جن احادیث میں ممانعت ہے وہ سب سندا ضعیف ہیں جو

۱۔ (الجامع الاحکام القرآن ج۱ ص ۳۳۶۔۳۳۵' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

۲۔ (صحیح بخاری ج۱ ص ۳۰۴' ج۲ ص ۸۵۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۰ھ)

اس حدیث صحیح سے معارضہ کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ (۱)

اس مسئلہ پر دوسری دلیل یہ ہے کہ خلفاء راشدین پانچ وقت کی نمازیں اور جمعہ پڑھاتے تھے' وعظ و نصیحت کرتے تھے' مقدمات کے فیصلے کرتے تھے' مسلمانوں کے اندرونی اور بیرونی مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے تھے اور جہاد کا انتظام کرتے اور ان تمام خدمات کے عوض ان کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا تھا' اور اخیار امت کا یہ تعامل اس مسئلہ پر واضح دلیل ہے کہ تعلیم قرآن' امامت' خطابت اور دیگر عبادات پر اجرت لینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ خلفاء راشدین کی سنت ہے' امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بن گئے تو انہوں نے فرمایا: میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا کسب (تجارت) میرے اہل وعیال کی کفالت کے لیے ناکافی نہیں تھا اور اب میں مسلمانوں کے معاملات میں مشغول ہو گیا ہوں' اب ابوبکر کے اہل وعیال بیت المال کے مال سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے لیے کسب کرے گا۔ (۲)

علامہ بدرالدین عینی حنفیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

امام ابن سعد نے ثقہ راویوں کی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنا دیا گیا تو وہ اپنے معمول کے مطابق سر پر کپڑوں کی گٹھڑی رکھ کر بازار میں تجارت کے لیے چلے گئے' راستہ میں حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ سے ملاقات ہوئی' انہوں نے کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں حالانکہ آپ مسلمانوں کے ولی مقرر ہو چکے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اگر میں تجارت نہ

۱۔ (فتح الباری: ج ٤ ص ٤٥٤۔ ٤٥٣' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' ١٤٠١ھ)

۲۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۷۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۰ھ)

کروں تو پھر اپنے عیال کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ انہوں نے کہا: ہم آپ کے لیے وظیفہ مقرر کرتے ہیں' پھر انہوں نے ہر روز کے لیے نصف بکری مقرر کر دی۔

میمون سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو مسلمانوں نے آپ کا دو ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا' حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: میرے اہل و عیال کا خرچ زیادہ ہے' مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے' پھر مسلمانوں نے پانچ سو درہم کا اضافہ کر دیا۔ [۱]

نیز علامہ بدرالدین عینیؒ لکھتے ہیں:

"صحیح بخاری" کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی عامل کے اوپر کوئی اور عامل نہ ہو تو وہ اپنی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفہ لے سکتا ہے اور ہر وہ شخص جس کو مسلمانوں کے اعمال کی کوئی ذمہ داری سونپی جائے اس کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے کیونکہ اس کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے لیے رقم کی احتیاج ہوتی ہے کیونکہ اگر اس کو کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا تو وہ باعوض مسلمانوں کے کسی کام پر تیار نہیں ہوگا اور اس سے مسلمانوں کے اجتماعی مفادات اور مصالح ضائع ہو جائیں اسی بنا پر ہمارے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ قاضی کو وظیفہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور قاضی شریحؒ قضاء کا وظیفہ لیا کرتے تھے' امام بخاری نے رزق الحکام کے باب میں اس کا ذکر کیا ہے' پھر اگر قاضی ضرورت مند ہو تو بیت المال سے اس کی کفالت واجب ہے اور اس کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ وظیفہ سے مستغنی ہو تو پھر اس کا بیت المال سے وظیفہ نہ لینا افضل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ پھر بھی اس کا وظیفہ لینا زیادہ صحیح ہے تاکہ وہ قضاء کے معاملہ اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں سستی نہ کرے'

۱۔(عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۸۵' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر ۱۳۴۸ھ)

کیونکہ جب وہ اپنے کام کا کوئی وظیفہ نہیں لے گا تو قضاء کی ذمہ داریوں کو توجہ اور باقاعدگی سے پورا نہیں کرے گا۔ [۱]

علامہ عینی نے قاضی کو وظیفہ دینے کی جو وجوہات بیان کی ہیں وہ تمام وجوہات تعلیم قرآن، امامت اور اذان وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

علامہ آلوسی حنفیؒ "تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بعض اہل علم نے آیت سے قرآن مجید اور دیگر علوم کی تعلیم کی اجرت کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے اور اس مسئلہ میں بعض احادیث بھی مروی ہیں جو صحیح نہیں ہیں حالانکہ حدیث میں یہ ہے کہ صحابہ کرام۔ نے عرض کیا: کیا ہم تعلیم قرآن پر اجرت لیں؟ آپ نے فرمایا: جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے بہتر کتاب اللہ ہے، اور اس کے جواز کے سلسلہ میں علماء کے بکثرت اقوال منقول ہیں اگرچہ بعض علماء نے اس کو مکروہ بھی کہا ہے، اور اس آیت میں اس کی کراہت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ [۲]

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے اور ایک قول میں امام احمدؒ نے عبادات پر معاوضہ لینے کو جائز کہا ہے۔

ہر چند کہ متقدمین فقہاء احناف نے اسلامی فرائض کی بجا آوری پر اجرت لینے سے منع کیا تھا، لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت علماء کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر کیے جاتے تھے لیکن اب امراء اور سلاطین نے علماء کی کفالت ترک کر دی ہے تو اب علماء کا اپنے فرائض منصبی پر اجرت لینا جائز ہے اور متاخرین فقہاء احناف نے بھی اس کے جواز کا فتوی دیا ہے، علامہ بدرالدین عینی حنفیؒ لکھتے ہیں:

امام خیراخزیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں امام، موذن اور معلم کا اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح"

۱۔(عمدۃ القاری ج ۲ ص ۱۷۹، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر ۱۳۴۸ھ)

۲۔(روح المعانی ج ۳ ص ۶۵۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

روضہ" اور" ذخیرہ" میں ہے۔ (۱)

فقہاء نے کہا ہے کہ متقدمین نے تعلیم قرآن مجید کی اجرت لینے سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ پہلے معلمین کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر تھے' اس لیے معلمین اپنی ضروریات اور معاش میں مستغنی تھے' نیز اس زمانہ میں محض ثواب کے لیے قرآن مجید کی تعلیم دینے کا بھی رجحان تھا اور اب یہ بات باقی نہیں رہی' امام ابوعبداللہ الخیراخزی ؒ نے کہا کہ اس زمانہ میں امام موذن اور معلم کے لیے بھی اجرت لینا جائز ہے۔ (۲)

علامہ زین الدین ابن نجیم ؒ لکھتے ہیں:

علامہ ابن الشحنہ ؒ نے کہا ہے کہ فقہاء مدارس سے جو وظیفہ لیتے ہیں وہ اجرت نہیں ہے کیونکہ اس میں اجارہ کی شرائط نہیں پائی جاتیں' اور نہ یہ صدقہ ہے کیونکہ غنی بھی یہ وظیفہ لیتے ہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء درس کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں' اس لیے یہ ان کی اعانت ہے' حتی کہ اگر وہ کسی کام یا مشغولیت کی وجہ سے درس میں نہ آسکیں' پھر بھی ان کا وظیفہ لینا جائز ہے۔ (۳)

﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ ﴾

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

۱۔(بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ٦٥٥' مطبوعہ ملک سنز فیصل آباد)

۲۔(عنایہ علی ہامش فتح القدیر ج ۸ ص ٤٠' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

۳۔(البحر الرائق ج ٥' ص ٢٢٩' مطبوعہ مطبعہ' مصر' ١٣١١ھ)

بدخو یہودی

یہودیوں کی اس بدخصلت پر ان کو تنبیہ کی جارہی ہے کیونکہ وہ جاننے کے باوجود کبھی تو حق و باطل کو خلط ملط کردیا کرتے تھے کبھی حق کو چھپالیا کرتے تھے۔ کبھی باطل کو ظاہر کرتے تھے۔ لہٰذا انہیں ان ناپاک عادتوں کے چھوڑنے کو کہا گیا ہے اور حق کو ظاہر کرنے اور اسے کھول کھول کر بیان کرنے کی ہدایت کی حق و باطل سچ جھوٹ کو آپس میں نہ ملاؤ اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کرو۔ یہودیت و نصرانیت کی بدعات کو اسلام کی تعلیم کے ساتھ نہ ملاؤ۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بابت پیشنگوئیاں جو تمہاری کتابوں میں پاتے ہو انہیں عوام الناس سے نہ چھپاؤ تکتمو امجز وم بھی ہوسکتا ہے اور منصوب بھی یعنی اسے اور اسے جمع نہ کرو۔ ابن مسعود کی قرأت میں تکتمون بھی ہے۔ یہ حال ہوگا اور اس کے بعد کا جملہ بھی حال ہے معین یہ ہوئے کہ حق کو حق جانتے ہوئے ایسی بے حیائی نہ کرو۔ اور یہ بھی معنی ہیں کہ علم کے باوجود اسے چھپانے اور ملاوٹ کرنے کا کیسا عذاب ہوگا۔ اس کا علم ہوکر بھی افسوس کہ تم بدکرداری پر آمادہ نظر آتے ہو۔ (۱)

سیدنا براء بن عازب ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے سے گزرا۔ حالت اس شخص کی (زنا کی پاداش میں) کچھ اس طرح تھی کہ اسے راکھ اور کوئلے سے سیاہ کیا گیا تھا اور وہ جسم پر کوڑے کھائے ہوئے تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودیوں کو اپنے پاس بلالیا اور فرمایا: ”کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی یہی سزا پاتے ہو؟“ یہودیوں نے کہا، جی ہاں! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے علمائے یہود میں سے ایک شخص کو بلا کر فرمایا: ”

۱۔ تفسیر ابن کثیر

میں تجھے قسم دیتا ہوں اس اللہ کی، جس نے موسیٰ (علیہ السلام) پر تورات نازل فرمائی! تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہاری کتاب میں زنا کی یہی حد ہے؟" یہودی عالم نے کہا، نہیں! اگر آپ مجھے اللہ کی قسم نہ دیتے تو میں حق بات نہ کہتا (مگر اب سچ کہنا ہی پڑے گا اور وہ یہ ہے کہ) ہماری کتاب میں زنا کی حد تو" رجم" ہی ہے، لیکن جب ہمارے شرفا میں زنا بہت زیادہ پھیل گیا، تو پہلے یہ ہوا کہ جب ہمارے شرفا اور معززین جرم زنا میں پکڑے جاتے تو ہم انھیں چھوڑ دیتے اور جب کوئی غریب اور کمزور پکڑا جاتا تو ہم اس پر حد جاری کردیتے۔ پھر ہم نے جمع ہو کر باہمی مشورہ سے طے کیا کہ امیر اور غریب کے لیے ایک درمیانی سزا مقرر کرلی جائے (اور سب کو وہی سزا دی جائے) چنانچہ پھر ہم نے "رجم" کے بدلے زنا کی سزا منہ کالا کرنا اور کوڑے لگانا مقرر کرلیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودی عالم کی بات سنی، پھر کہا: "اے اللہ! سب سے پہلے میں ہی تیرے حکم" رجم" کو زندہ کرتا ہوں، جبکہ ان لوگوں (یہودیوں) نے اسے مردہ کرڈالا تھا۔" پھر آپ کے حکم سے یہودی مجرم کو رجم کیا گیا۔ [۱]

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

نماز اور زکوۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان رہے ہیں۔ لیکن یہود میں نماز باجماعت کا اہتمام نہیں تھا اور ان کی نماز میں رکوع بھی نہیں تھا۔ یہود نے نماز ادا کرنا بالکل چھوڑ ہی دیا تھا اور زکوۃ ادا کرنے کے بجائے سود کھانا شروع کردیا تھا۔ اس آیت میں انہیں تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ کہ اب تمام امور میں نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرو۔ اس آیت اور اس سے اگلی تین آیات

۱۔[مسلم، کتاب الحدود، باب رجم الیہود، أہل الذمۃ فی الزنٰی: ۱۷۰۰]

میں خطاب یہود اور مسلمانوں میں مشترک ہے۔ ہماری شریعت میں بھی نماز با جماعت ادا کرنا بہت فضیلت رکھتا ہے اور بلا عذر ترک جماعت کبیرہ گناہ ہے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے۔

نماز با جماعت کی فضیلت اور فوائد:۔

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جماعت کی نماز اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ [۱]

سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں، پھر نماز کا حکم دوں، اس کے لیے اذان کہی جائے پھر کسی شخص کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو امامت کرائے پھر میں (جماعت سے) پیچھے رہنے والوں کے ہاں جا کر ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ انہیں (جماعت میں شامل ہونے پر) ایک موٹی ہڈی یا دو اچھے کھر ملیں گے تو عشاء کی نماز میں ضرور آتے۔ [۲]

سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بھلا دیکھو اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر بہتی ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل کچیل رہ جائے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا نہیں کچھ میل کچیل باقی نہیں رہے گا۔ آپ نے فرمایا: بس یہی

۱۔ (بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ)

۲۔ (بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب صلوٰۃ الجماعۃ)

پانچ نمازوں کی مثال ہے۔اللہ تعالیٰ ان نمازوں کی وجہ سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ [1]

سیدنا ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ: ہر نماز اپنے سے پہلی نماز تک کے، جمعہ اپنے سے پہلے جمعہ تک کے اور رمضان اپنے سے پہلے رمضان تک کے گناہوں کا کفارہ ہیں۔ بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔ [2]

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: جس نے نماز کی حفاظت کی اس کے لیے نماز قیامت کے دن نور، برہان اور نجات کا باعث ہوگی اور جس نے نماز کی حفاظت نہ کی اس کے لیے اس دن نہ نور ہوگا، نہ برھان اور نہ نجات اور قیامت کے دن وہ قارون، فرعون، ہامان، اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ [3]

سیدنا انس بن مالک ؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں نے حد کا ایک گناہ کیا ہے۔ مجھے حد لگائیے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا اور اس نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھی۔ وہ شخص پھر کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں نے ایک حدی گناہ کیا ہے۔ آپ کتاب اللہ کے مطابق مجھے سزا دیجئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ وہ کہنے لگا: ہاں پڑھی ہے۔ آپ نے فرمایا: تو بس اللہ نے تیرا گناہ اور تیری سزا کو

۱۔ (متفق علیہ)

۲۔ (مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء والصلوٰۃ عقبہ)

۳۔ (احمد، دارمی، بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ مطبوعہ نور محمد ص ۵۸)

معاف کر دیا۔ (۱)

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، پھر جب وہ ایسا کریں تو انھوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے اموال کو بچا لیا سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔" (۲)

ڈاکٹر اسلامی ریسرچ اسکالر محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

۱۔(بخاری، کتاب المحاربین باب إذا أقر بالحد)

۲۔[بخاری، کتاب ال إیمان، باب (ف إن تابوا وأقاموا الصلوۃ۔۔الخ): ۲۵۔مسلم، کتاب ال إیمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إلہ إلا اللہ۔۔الخ: ۲۲]